"چہارسُو"

..... فنون .....

(احمد ندیم قاسمی صدی نمبر)

احمد ندیم قاسمی صاحب کے فنّی سفر کی ان گنت اور اَن شمار جہات ہیں۔ایک نہایت روشن جہت فنون کی شکل میں قاسمی صاحب نے بھی روشن و تاباں رکھی اور قاسمی صاحب کی غیر موجودگی میں اُن کی قابلِ احترام صاحبزادی ڈاکٹر ناہید قاسمی اور ڈاکٹر صاحبہ کے باہنر صاحبزادے نیئر حیات قاسمی صاحب نے فنون کی اشاعت کو اُسی طرح جاری وساری رکھا ہوا ہے جس طرح قاسمی صاحب کے زمانے کی روایت رہی ہے۔فنون کی صدی نمبر اشاعت قاسمی صاحب کے فن اور شخصیت کے ظاہر، نمایاں اور مخفی گوشوں کا احاطہ بڑے ہی دقیق انداز میں کیا گیا ہے۔ پہلا باب قاسمی صاحب کی حمد ونعت سے مزین ہے، دوسرا یادگار ملّی نغمے، تیسرا ملّی ترانے، چوتھا مضامین ومقالات اور پانچویں باب میں قاسمی صاحب کے کلام، افسانے، ناولٹ، کالم اور دیگر تخلیقات کا تجزیہ بلند قامت اہلِ قلم نے کیا ہے، چھٹے باب میں قاسمی صاحب کی کتابوں سے متعلق اولین تجزیاتی تبصرے، ساتواں تشکیلی دور کی اہم یادگار، آٹھواں عکسِ ندیم رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ تصاویر کا البم، نواں باب ہمہ جہت ندیم (کندِ مقرر) کے حوالے سے دو درجن سے زائد اہلِ قلم نے قاسمی صاحب کی شگفتہ نگاری کو موضوعِ سخن بنایا ہے، دسویں باب میں قاسمی صاحب کے خاکے، گیارویں باب میں منظوم خراجِ عقیدت گلپاشی کے نام سے گیارویں باب میں جوش ملیح آبادی، احسان دانش، قتیل شفائی سے لے کر ناہید قاسمی تک بے شمار اہلِ قلم نے نظمیہ کلام پر اظہار خیال کیا ہے۔جلد دوئم میں ندیم کے دو نہایت اہم اور کلیدی خطبے روزن در سے ندیم خزینے کے عنوان سے قاسمی صاحب کے تحریر کردہ پیش لفظ اور دیباچہ ''نایاب ندیم'' کے عنوان سے قاسمی صاحب کی تحاریر کے عکس، تاثرات کے عنوان سے فراق گورکھپوری، ابوالخیر کشفی، حنیف رامے، عبدالمجید السالک اور سید امتیاز علی تاج کے رحشاتِ قلم لطف وانبساط کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔نوادرات ندیم میں قاسمی صاحب کی اُن تحاریر کا عکس پیش کیا گیا ہے جس میں قدیم پرنٹ نمایاں ہے۔ندیم گفتگو کے عنوان سے قاسمی صاحب سے مکالمہ، گفتگو اور انٹرویو پیش کیے گئے ہیں۔خطوط کے حوالے سے کرشن چندر، روشن آراء بیگم، ساحر لدھیانوی، شاذ تمکنت سے لے کر ساقی فاروقی اور پروین شاکر تک بے شمار اسمائے گرامی روشن اور نمایاں ہیں۔بچوں کا ندیم کے حوالے سے ندیم صاحب کی تحاریر میرا بچپن، جلیبیاں، مامتا، شرارت، اسٹیشن جیسی دلچسپ کہانیاں شامل ہیں۔پنجابی دریچہ کے تحت قاسمی صاحب کے رشحات قلم ''وارث شاہ دا کمالِ فن، اعظم چشتی دے دوہڑے، یونس احقر دیاں غزلاں، شریف کنجاہی دیاں نظماں'' اور دیگر اہلِ قلم کی تخلیقات کو نمایاں جگہ دی گئی ہے۔بہتر ہوتا کہ اس طرح کی نایاب ونادر دستاویز اردو ادب کا کوئی اور جریدہ پیش کرتا مگر آج کے ہمہ ہمی کے عالم میں جب کسی مدیر کی توجہ اس جانب نہ گئی تو خود قاسمی صاحب کے خانوادے نے اس اہم کام کا بیڑہ اٹھایا اور نہایت عمدہ، ضخیم اور باوقار اشاعت پیش کر کے قاسمی صاحب کی خدمات کو پھر سے زندہ و جاوید کر دیا۔قریب آٹھ سو صفحات کی ہارڈ بائیڈنگ کے ساتھ نہایت صاف ستھری اور روشن چھپائی کے ساتھ یہ نادر ادبی دستاویز دو ہزار پاکستانی روپے کے عوض مکان 251، بلاک F-2، واپڈا ٹاؤن، لاہور سے بآسانی طلب کی جاسکتی ہے۔ ..... انوار شریف

..... سیماب .....

''سیماب'' گورنمنٹ ڈگری کالج (بوائز) میرپور خاص کا سالانہ مجلّہ ہے جو چھ سو سے زائد صفحات اردو میں رنگین تصاویر اور تیس صفحات انگریزی مجلد کے ساتھ روشن طباعت اور نفیس کاغذ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔وہی خدا ہے کے عنوان سے حمدیہ کلام گلستان نعت کے عنوان سے نعتیہ کلام رُوبرو کے عنوان سے کالج کے پرنسپل پروفیسر غازی علم الدین سے مکالمہ، میرا اسلام نکو نام ہے کے عنوان سے سیرت نبوی، بہارِ مصطفوی اور اتحاد عالم اسلام جیسے مقالے شامل ہیں۔''یہ شہر طرب رومانوں کا'' کے عنوان قطعہ تاریخ وصال میاں محمد بخش کھڑی شریف پر ایک طائرہ نظر اور دیگر عمدہ مضامین شامل ہیں۔ اردو دوہے جس کا نام، حسین پیکروں کے شفاف خاکے، عقل کو تنقید سے فرصت نہیں، ریگ دیروز، تاریخ کے چوراہوں پر، تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ، لایا ہوا اک موجِ تغزل نکال کر کی طرز کے اور بھی بہت سے دلچسپ عنوانات، مضامین، نظم ونثر لائق مطالعہ ہیں۔گورنمنٹ کالج (بوائز) افضل پور میرپور خاص کے طلباء کی رہنمائی میں ''سیماب'' کی اشاعت لائق تحسین بھی ہے اور لائق توجہ بھی۔جس کے سرپرست پروفیسر غازی علم الدین سے رابطہ کر کے زیر بحث اشاعت سے استفادہ بآسانی ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ .....آمنہ انعام

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۷،شمارہ:نومبر،دسمبر۲۰۱۸ء

بانی مدیرِاعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت

❍☆❍

قارئین چہارسُو

❍☆❍

زرِ سالانہ

❍☆❍

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

❍☆❍

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

رابطہ:537/D-1،گلی نمبر 18،ویسٹریج-III،راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:(92+)-51-8730633-8730433

موبائل:(92+)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

۔ متاعِ چہارسو ۔

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی

تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

دھوپ رنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۶

اکیسویں صدی اور ادیب۔۔۔۔۔۔۔سحر انصاری ۷

براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۰

ورقِ گل پہ داستاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۱۴

سحر انصاری کے سوالات۔۔۔۔۔۔۔فتح محمد ملک ۱۸

دوسرا درویش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سلیم یزدانی ۲۱

سحر بھائی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مظہر جمیل ۲۵

جدت پسند شاعری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رضی مجتبیٰ ۳۵

کارِ ذات مشکل ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مبین مرزا ۳۸

سوچتی ہوئی شاعری۔۔۔۔۔۔۔۔۔مجتبیٰ حسین ۴۳

برجِ بابل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۴۵

ابد کی شام

غالب عرفان، شگفتہ نازلی ۴۹

افسانے

عزت دار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مسرور جہاں ۵۰

گائے کہانیاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سلام بن رزاق ۵۲

کُتے والی عورت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک بُدکی ۵۳

اِنَّھُمۡ فَعَلُوۡھَا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جمیل عثمان ۵۷

بے خبر قاتل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید نصرت بخاری ۵۹

گھر کی بہار

بشیر بدر، محمود الحسن، اختر شاجہاں پوری، غالب عرفان، آصف ثاقب، مہندر پرتاپ چاند، نسیم سحر، واصف حسین واصف، شوق انصاری، شاہین مفتی، اشرف جاوید۔ ۶۲

افسانے

فکرت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد بشیر مالیرکوٹلوی ۶۷

یادوں کی لڑی۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر عبدالباری ۶۹

ڈوبتی نسلیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رینو بہل ۷۱

شہر کا آخری اجنبی شخص۔۔۔۔۔۔۔۔جمیل اختر ۷۵

منکہ مسمی فیروز دین۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۷۶

محبوب کی سنّت

عارف شفیق، فرح طوبا، رئیس صدیقی، سیفی سرونجی، شریف شیوہ، نوید سروش، ابراہیم عدیل، ایم کے بھان تمنا، سائرہ بھارتی، ارشد جمال، عطاء الرحمٰن قاضی، سبیلہ انعام صدیقی۔ ۸۲

زہریلا انسان

ناول کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ ۸۶

زندگی نایاب ہے

گھٹیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر فیروز عالم ۹۳

تمدن کی فضائیں

یونس شرر، یوگیندر بہل تشنہ، پروین شیر، فیصل عظیم، ڈاکٹر ریاض احمد، مناظر عاشق ہرگانوی، احمد کلیم فیض پوری، نسیم سحر، طاہر شیرازی، وسیم صدیقی۔ ۹۵

آئینۂ فن

سنگی کتابیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سیمیں کرن ۱۰۰

نشانِ راہ

رفیق حسین کے افسانوی کردار۔۔ڈاکٹر علی عباس ۱۰۱

ڈرامہ

خواب ہی تو ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد اسداللہ ۱۰۷

ایک صدی کا قصہ

جنتی مالا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۲

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔وقار جاوید ۱۱۶

قرطاسِ اعزاز
پروفیسر سحر انصاری
کے نام

سحؔر انصاری سے ایک زمانے سے راہ ورسم ہے۔ان کے کلام سے لُطف اندوز ہونے کا بھی کئی بار اتفاق ہوا ہے لیکن بایں ہمہ یہ مجموعہ میرے لیے ایک بالکل نئی دریافت تھی، اسے پڑھ کر سب سے پہلے تو استاد کا شعر ذہن میں آیا:

غالب نبود شیوۂ من قافیہ بندی
ظلمیست کہ برکلک وورق میکنم امشب

یہ نہیں کہ سحؔر کو قافیہ بندی پر پوری قدرت حاصل نہیں ہے، اس پہلو سے دیکھئے تو بھی اس مجموعے میں مشّاقی اور ندرت وایجاد کے کئی نمونے ملیں گے، لیکن یہ تو ثانوی بات ہے، اصل بات تو وہی کلک وورق پر سوزِ نہاں کی ستم گری ہے اور سحؔر انصاری کے کلام پر یہ شعر دوسری طرح بھی صادق آتا ہے، وہ یوں کہ ان کا موضوعِ سخن ہی بیشتر وہ ہزار گونہ عذاب ہے، جو ان دنوں جانِ مجنوں کو ہر لحظہ درپیش رہتا ہے اور وہ ہزار گونہ مظالم جو ان دنوں ہر حسّاس اور باضمیر افراد پر توڑے جاتے ہیں، ان سب کا مرکزی نقطہ میری سمجھ میں بیگانگی اور چپقلش کا وہ مرکب ہے جسے انگریزی زبان میں Alienation کہتے ہیں یا وہ کرب اور ناآسودگی جو اس کیفیت سے پیدا ہوتے ہیں، یہ خون خرابہ خود اپنی ذات سے بھی کیا جاتا ہے، عقائد وروایات سے بھی، اپنے معاشرے اور اس کے چلن سے بھی، اس موضوع کا کچھ نہ کچھ سطحی بیان تو قریب قریب آج کل کے سبھی شعراء میں ملتا ہے لیکن جس سنجیدگی اور غور وفکر سے اس کا بیان سحؔر کے کلام میں ہوا ہے، کچھ ڈھونڈے ہی سے ملے گا، اس اعتبار سے ''نمود'' کے مطالعے سے ن۔م۔راشد اور مصطفےٰ زیدی کی یاد آتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اوّل تو سحؔر کے کلام میں ایہام یا ابہام کی کوئی آمیزش نہیں اور دوسرے زندگی کے روزمرہ مظاہر سے پُل ہو یا سڑک، شفاخانہ ہو یا تجربہ گاہ، کسی ذہنی یا جذباتی تجربہ کی تجرید اور کشید کے بعد جس طرح سحؔر انہیں نظم کرتے ہیں وہ انہیں سے مخصوص ہے۔

ایسا تو خیر نہیں کہ سحؔر انصاری صرف زندگی کے منفی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں تاہم مجھے یہ شکایت ضرور ہے کہ بت شکنی کے کرب کو شاید بت گری کی لذت پر اتنا غالب نہیں ہونا چاہیے تھا، لیکن یہ تو اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔''نمود'' ایک بہت تعلیم یافتہ، خیال افروز اور سنجیدہ ذہن کی تخلیق ہے، جسے جدید ادب میں ایک معتبر اضافہ سمجھنا چاہیے۔

فیض احمد فیض

''دھوپ رنگ''

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

قلمی نام : سحر انصاری

اصلی نام : انور مقبول انصاری

ولدیت : مقبول احمد چشتی

تاریخ پیدائش : ۲۷ر دسمبر ۱۹۴۱ء

جائے پیدائش : اورنگ آباد، دکن

شریکِ حیات : خیر النساء انصاری

اولاد : عدیل انور انصاری (بیٹا)

ڈاکٹر عنبریں حسین عنبر، عندلیب، وجیہا (بیٹیاں)

آبائی تعلق : مراد آباد، میرٹھ (مولانا اسماعیل میرٹھی، ننھیالی بزرگ تھے)

پاکستان آمد : ۱۹۵۰ء

تعلیم : ایم اے انگریزی، ایم اے اردو (گولڈ میڈل)، ایم اے لسانیات (کراچی یونیورسٹی)

تدریس : بلوچستان یونیورسٹی (دو سال)

کراچی یونیورسٹی (۱۹۷۴ء۔۔۔تا حال)

چیئرمین : شعبہ اردو (۱۹۹۵ء۔۔۔۱۹۹۸ء)

مدیرِ اعلیٰ : اردو ڈکشنری بورڈ (۱۹۹۸ء۔۔۔۲۰۰۰ء)

نائب معتمد : انجمن ترقیِ اردو، پاکستان (۲۰۱۱ء)

لائف فیلو : اکیڈمی آف لیٹرز، پاکستان

نائب صدر : پاکستان آرٹس کونسل، کراچی (تا حال)

تحقیقی تجربہ : کراچی یونیورسٹی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالہ نگاروں کی تحقیقی رہنمائی۔

تصانیف:

''نمود'' (شعری مجموعہ) کراچی یونیورسٹی ایوارڈ یافتہ ۱۹۷۶ء

خدا سے بات کرتے ہیں (شعری مجموعہ) جنگ یو بی ایل ادبی انعام یافتہ ۲۰۱۰ء

نثر:

مقالاتِ جوش (تدوین ترتیب)

غالب اور مولوی عبدالحق

فیض کے آس پاس (اگست ۲۰۱۱ء)

تنقیدی اُفق (فروری ۲۰۱۴ء)

زیرِ طبع:

پردہ سخن کا (تنقیدی مضامین)

پاکستانی معاشرہ اور اردو ناول

عزیز حامد مدنی۔۔۔فن و شخصیت

ہماری دُنیا، تمہاری دنیا (شعری مجموعہ)

ادارتی تجربہ:

مدیر ہفتہ روزہ ''نئی جمہوریت''

شریک مدیر ماہنامہ ''افکار''

مدیر سہ ماہی ''تمثال''

مدیرِ اعلیٰ ''ارژنگ''

سرپرست سہ ماہی ''اسالیب''

مدیرِ اعلیٰ ''پاکستان شناسی'' (ریسرچ جرنل)

مختلف ممالک میں تدریس، مشاعرے اور سیمیناروں میں شرکت:

امریکہ، کینیڈا، جرمنی، انگلستان، سعودی عرب، افغانستان، ہندوستان، جاپان، چین، ابوظہبی، دبئی، دوحہ قطر، مسقط۔

ریڈیو اور ٹی وی نشریات:

ٹی وی اور ریڈیو کے مختلف پروگراموں کی تحریر اور پیش کش۔

فن اور شخصیت:

فن اور شخصیت پر مختلف جامعات سے مکمل ہونے والے ایم اے اور ایم فل کے مقالات۔

اعزازات:

تمغہ امتیاز حکومتِ پاکستان (۲۰۰۵ء)

مختلف ملکی و غیر ملکی ادبی تنظیموں کی طرف سے متعدد ادبی اعزازات۔

رہائش: سی۔۴۸، پاپوش نگر، ناظم آباد، کراچی

ای میل: asaleebkarachi@hotmail.com

اکیس ویں صدی اور ادیب

پروفیسر سحر انصاری

انسان نے اپنے شعوری وجود کے لیے جو نظریے اور طریقے وضع کیے ہیں، ان میں مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے زبان اور اپنی زندگی کے مراحل کی جانچ پڑتال کے لیے وقت کا تصور، بہ طورِ خاص اہم ہیں۔ وقت اضافی بھی ہے اور مطلق بھی۔ اضافی وقت کا تعلق ہماری ارضی زندگی کے اسباب و علل سے ہے جب کہ کائناتی وقت کو مطلق گردانا گیا ہے۔ ہماری اپنی ارضی زندگی میں لمحات دنوں میں اور دن صدیوں میں بدل جاتے ہیں۔ وقت کے اسی تصور سے ہم ماضی، حال اور مستقبل کا تعین کرتے ہیں۔ وقت کے ایک مقررہ دورانیے کو کسی عنوان سے موسوم بھی کر دیتے ہیں۔ تاہم وقت کا ایک دورانیہ دوسرے دورانیے تک پہنچنے میں جن مراحل سے گزرتا ہے، وہ اسے ہوا بستہ یا ایئر ٹائٹ (air tight) صورتِ حال میں تبدیل نہیں کرتا۔

زمانۂ ماقبل کے اثرات کچھ دیر تک آئندہ زمانے پر بھی اپنا سایہ ڈالے رہتے ہیں۔

ہماری نسل اس لحاظ سے بھی ایک خاص تشخص رکھتی ہے کہ اس نے ایک صدی سے دوسری صدی کے آنگن میں قدم رکھا ہے۔ اس منفرد تجربے پر خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ خوشی تو یوں کہ ہر چیز میں پیش رفت اکثر اوقات خوش آئند ہی ہوتی ہے اور افسوس یوں کہ ایک ہی عصر اور ایک ہی کرۂ ارض پر بسنے والی اقوام کے مقابلے میں ہم کس حد تک اس پیش رفت کو اپنے سر کا تاج بنا سکتے ہیں۔ چناں چہ اکیس ویں صدی کے آغاز کا جیسے ہی غلغلہ مچا تو میں نے کئی دانش وروں سے یہ سوال کیا کہ ہم نے اکیس ویں صدی کا خیر مقدم کرنے کے لیے کوئی فکری، عملی یا تہذیبی تیاری کی ہے یا یہ ہماری لیے محض کیلنڈر کا ایک صفحہ الٹ دینے کے مترادف ہوگا؟ اس پر ہر ایک نے اس کی تائید کی اور کہا کہ کیلنڈر کا ایک ورق ہی الٹ جائے گا، جس پر ۲۰۰۱ء کے لکھے ہوئے ہندسے ہم پر ہنس رہے ہوں گے۔

اس پس منظر میں جب ہم دیکھتے ہیں تو اب اکیس ویں صدی کے چودہ سال گزر چکے ہیں اور ہمارا معاشرہ مسلسل بے یقینی، دہشت گردی، مایوسی اور خطرات کے اندیشوں کا شکار ہے۔ ہمارے خطۂ ارض پر انسانی سطح کے حوالے سے جو اذیت ناک سانحے ہو رہے ہیں، وہ کسی خاص علاقے تک محدود نہیں، بلوچستان ہو یا سندھ، شمالی علاقہ جات ہوں یا پنجاب اور پختونخوا کے دیہات، ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی زاویے سے بحران میں مبتلا ہے۔ نوعیت اور شدت میں فرق ہو سکتا ہے، لیکن کسی علاقے میں بھی مکمل امن و سلامتی کا مکمل چراغاں نظر نہیں آتا۔ اندھیرے زیادہ ہیں، روشنیاں کم۔ حالاں کہ یہ کوئی تقدیرِ مبرم نہیں ہے۔ اچھے دن بھی ان علاقوں کی تاریخ کا حصہ رہے ہیں، لیکن ہم بات کر رہے ہیں اکیس ویں صدی کے منظر نامے کی:

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں

ماضی کے حوالے سے دیکھیے تو سقوطِ مشرقی پاکستان کے اثرات اور مضمرات انتہائی روح فرسا ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ عالمی سطح پر بھی ہمارے ملک کو ایک ناکام ریاست ثابت کرنے کی مسلسل کوشش کی جا رہی ہے۔ بظاہر یہ ایک انتہائی مایوس کن تاریک تناظر ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس تناظر کو بدلنے کی سعی کرنی چاہیے یا صبر شکر سے آخری صور پھونکے جانے کا انتظار کرنا چاہیے۔

تاریخ اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ ایسے ہی مایوس کن حالات میں اہلِ دانش، ادیب و شاعر اپنے خوابوں کی دھنک عام انسانوں کے ذہنوں میں فروزاں کرتے ہیں۔

معاشرے میں مختلف اداروں اور طبقات کے مابین جو تضادات اُبھرتے ہیں، انھی سے آئندہ کی تبدیلی یا تغیر کے راستے ہموار ہوتے ہیں۔ حالات میں نئے امکانات جب اُجاگر ہوتے ہیں تو نئے تصورات بھی اپنی تعبیرات کے ساتھ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اس ضمن میں کارل مارکس کے نظریات ہی پر تنقید کرتے ہوئے جو فکری لائحۂ عمل سامنے آئے ان کے بنیاد گزاروں میں ہربرٹ مارکوزے، کارل پوپر، التھوسے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے لائحۂ عمل اور سمت نمائی نے کبھی کبھی محدود پیمانے پر معاشرے میں ہلچل پیدا کی۔ جیسے فرانس میں ۱۹۶۸ء کے طلبہ کا ''انقلاب'' یا چین میں ''ریڈ گارڈز'' کے ثقافتی انقلاب کی معرکہ آرائی۔ بیس ویں صدی میں کئی انقلابات ایسے آئے جو مقامی طور پر عوام کے مقدرات کو بدلنے کا سبب بنے، جیسے ویت نام کی فتح، ایران میں امام خمینی کا انقلاب، نیلسن منڈیلا کی کامیاب جدوجہد، یاسر عرفات کے فلسطینی فیصلے۔ ان سب تحریکوں کے ساتھ ساتھ ادیب کا شعور اور ضمیر بھی بیدار رہا اور اس کی تحریروں میں نئی زندگی اور نئی اُمنگ نظر آنے لگی۔ اسی لیے لاطینی امریکا، ایشیا، افریقا اور عرب دنیا میں ادیب کا کردار اپنے مغربی معاصر ادیبوں سے خاصا مختلف بھی ہے۔ مغرب کے پاس اب مفادات کا کوئی ایسا مشترک محور نہیں ہے جس کی خاطر کوئی دانش ورانہ اتحاد ضروری ہو۔ تیسری دنیا یا وہ دنیا جو rest of the world کہلاتی ہے، اپنے مختلف مسائل سے اب بھی دوچار ہے اور آج کا ادیب اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ چناں چہ مقامی طور پر بھی پاکستانی ادیبوں نے مزاحمتی اور احتجاجی ادب تخلیق کر کے اپنے قلم کی حرمت کا ثبوت دیا ہے۔

بیس ویں صدی میں جو فلسفے، نظریات، تحریکیں اور شخصیات سامنے آئیں اور مقامی اور عالمی سطح پر جو فیصلے ہوئے ان کا گہرا اثر اب بھی اکیس ویں صدی پر پڑ رہا ہے۔ نوآبادیاتی نظام اکثر خطوں سے رخصت ہو چکا ہے، لیکن Post

Colonial صورتِ حال نے مسائل سے ان علاقوں کو دوچار کر رکھا ہے۔

نوآبادیاتی نظام کا انہدام ادیبوں اور دانش وروں کے لیے کوئی کم اہم تاریخی واقعہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس کے اثرات بھی مشرق و مغرب کے ادیبوں کے یہاں منفی اور مثبت انداز میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اسی طرح نسائیت نے پدرسری اور مادرسری روایات کی بنیاد پر حقوقِ نسواں اور آزادیِ نسواں کے جو نظریات مشتہر کیے، ان کے مختلف رُخ، مختلف تحریروں میں آتے ہیں۔ اس کا مسئلہ یہ بھی رہا ہے کہ ماضی اور حال میں طاقت کا استعمال اور اس کی نوعیت کیا رہی ہے۔ اس صورتِ حال کو Stephen Slemon نے اپنے ایک مقالے Resistance Theory for the Second World میں صراحت سے بیان کیا ہے۔ مغربی تجزیہ نگاروں نے تیسری دنیا کے لیے West and the Rest کے علاوہ دوسری دنیا (Second World) کی اصطلاح بھی وضع کر رکھی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ نوآبادیاتی نظام نے جو ثقافتی جبر اور معاشی حد بندیاں قائم کر رکھی تھیں، وہ اب بھی کسی نہ کسی صورت میں کہیں ماضی کی طرح اور کہیں ماضی سے بھی بدتر حالت میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے وسیع و عریض جبر سے آج کا ادیب لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اس ضمن میں نثر و نظم کے پیرایے میں کئی اہم تخلیقات معرضِ اظہار میں آئی ہیں۔

میں اس صورتِ حال کی مزید وضاحت کے لیے Stephen Slemon کی تحریر کا ایک اقتباس درج کرنا چاہوں گا:

Colonialism, obviously, is an enormously problematical category: it is by definiation transhistorical and unspecific, and it is used in relation to very different kinds of cultural oppression and economic control. But like the term 'patriarchy', which shares similar problems in definition, the concept of colonialism, to this third critical field, remains crucial to a critique of past and present power relations in world affairs, and thus to a specifically post-colonial critical practice which attempts to understand the relation of literary writing to power and its contestations.

سیاسی، معاشی اور سماجی شعبوں میں جو پیش رفت ہوئی، اس کے اثرات سے بھی ادیب اور اس کی فکر کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن گزشتہ صدی کا ایک رُخ عجیب تھا کہ بعض فلسفے عالم گیر سطح پر ادب کو متاثر کرتے رہے، مثلاً وجودیت لیکن اکیس ویں صدی اس قسم کے نظریاتی اثرات سے عاری نظر آتی ہے۔

ادب، تنقید اور فکریاتی شعبوں کو متاثر کرنے والی بعض تحریکیں، مغرب میں شروع ہوئیں۔ ہمارے یہاں انھیں تقلیدی انداز میں زیادہ تر اختیار کیا گیا جب کہ مغرب کی یہ تحریکیں اپنے مخصوص حالات اور زمینی حقائق کے تحت ظہور پذیر ہوئی تھیں، مثلاً زبان اور اس کے نفسیاتی، سماجی، ادبی اور سیاسی مضمرات، اسی طرح نسائی ادب کی مختلف تحریکیں جو ہر علاقے کی اپنی تہذیبی شناخت رکھتی ہیں۔

جہاں تک قاری اساس تنقید یا ''لکھت لکھتی ہے لکھاری نہیں'' جیسے تصورات کا تعلق ہے، ہمارے یہاں اس کے رد و قبول میں افراط و تفریط کا عمل پایا جاتا ہے۔ بعض ادبی حلقے ان میلانات و تصورات کی حمایت میں ایک انتہا تک پہنچ چکے ہیں جب کہ ان کو رد کرنے والے افراد دوسری انتہا پر نظر آتے ہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اب تک اس بنیادی نکتہ پر توجہ نہیں دی گئی جس کے نتیجے میں ادیب سے زیادہ قاری کی اہمیت اپنا رُخ منوانے لگی۔

اس نکتے کو سمجھنے کے لیے تاریخ کی طرف لوٹنا ہوگا۔ دراصل پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے درمیانی عرصے میں جو توسیع پسندی اور معرکہ آرائی کے تباہ کن واقعات سامنے آئے، ان میں ایک یہ حکمتِ عملی بھی تھی کہ ہٹلر اور مسولینی جیسے فاشسٹ حکمرانوں نے اپنے رفقائے کار کی مدد سے زبان کے استعمال کو یہ رُخ دیا کہ بعض الفاظ یعنی متن (Text) کا مروّجہ مفہوم خواہ کچھ ہو، لیکن سرکاری سطح پر اس کے معنی وہ لیے جائیں گے جو ان ڈکٹیٹروں کی حکومت طے کرے گی۔ اس رجحان کے خلاف نہ صرف جرمنی بلکہ اٹلی، فرانس اور روس میں بھی احتجاجی فضا پیدا ہوگئی۔ ہائیڈیگر، سارتر، کامیو، دریدا، لاکاں، رولاں بارت جیسے مفکروں نے اس پابندی کو ادیب کی تخلیقی آزادی کے منافی قرار دیا اور اس امر پر زور دیا کہ ''قاری'' متن خود تلاش اور متعین کرے گا۔ وہ کسی سرکاری حکم یا ڈکٹیشن سے سروکار نہیں رکھے گا۔ اسی زمانے میں ایک اصطلاح سامنے آئی زبان کا زنداں (Prison of Language)، یا لسانی قید خانہ۔ یہ رُجحان یہاں تک آگے بڑھا کہ ہر قسم کے متن یہاں تک کہ بائبل کو بھی Deconstruct کر دیا گیا۔

چوں کہ کسی زبان کے استعمال پر ہمارے یہاں ایسی کوئی سرکاری یا حکومتی پابندی نہیں، اس لیے ہم یہ محسوس کرنے سے قاصر ہیں کہ لسانی قید خانوں میں رہنے بسنے والے ادیبوں نے آزادیِ زبان کی یہ تحریکیں کیوں شروع کی تھیں۔ اکثر ادیبوں کے ذہنوں کو یہ سوال بھی پریشان کرتا ہے کہ کس زبان میں لکھا جائے؟

جہاں تک پاکستان میں ادیب کی کارکردگی کا تعلق ہے، ہر ذمے دار اور باشعور ادیب اپنا فریضہ انجام دے رہا ہے، لیکن وہی سارتر والی بات کہ ''کتاب میں لکھتا ہوں، بات ڈیگال کی مانی جاتی ہے۔'' اب ہمارے معاشرے پر ادیب کے وہ اثرات نظر نہیں آتے جو مثلاً غالب، اقبال یا فیض یا جالب جیسے شاعروں نے قائم کیے ہیں۔ ناول نگاری، افسانہ نویسی، مزاحیہ ادب ہر شعبے میں کچھ انھی کے اثرات نمایاں ہیں جو اکیس ویں صدی سے پہلے ہی اپنا مقام و مرتبہ منوا چکے ہیں۔

اکیس ویں صدی تمام دنیا میں اور ہمارے یہاں بالخصوص متعدد

اقسام کے مقامی اور عالمی دباؤ اور بحرانوں کا شکار ہے۔ اب ادیب ''فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے'' کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اب دہشت گردی، جنسی تشدد، معاشی استحصال، بچوں اور خواتین کی بے حرمتی، کاروکاری، اولاد فروشی، خودکشی، سفاکانہ قتل، ہمہ اقسام کے تعصّبات کا ایک آتش فشاں ہے جس کا لاوا تو ابھی سربہ مہر ہے، لیکن جس کی تپش سوا نیزے پر آئے ہوئے آفتاب سے کسی طرح کم نہیں۔

گزشتہ صدی میں پی ہن ٹنگٹن کی Clash of Civilizations اور فوکویاما کی End of History روس کا انہدام، پرس ٹرائیکا کے اثرات بھی ادیبوں پر مرتب ہوئے۔ اکیس ویں صدی ان تحاریک اور واقعات سے نبرد آزما ہے، اور شاید آئندہ بھی رہے کیوں کہ rest of the world یا باقی ماندہ دنیا کے لیے بے یقینی، مایوسی اور بے سمتی کے فلسفے زیادہ پیش کیے جارہے ہیں اور نئی نسل کی اکثریت بھی اب یہی سوچ رہی ہے کہ:

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

- یا -

عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

اس فضا اور ان حالات میں کیا ادیب کو اپنی کسی ذمے داری کا احساس نہیں ہونا چاہیے؟ کیا اسے بھی خواب دیکھنے کے بجائے پتھریلی آنکھوں کا نمائندہ بن جانا چاہیے؟

آئن اسٹائن سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے سائنس کے ایسے نظریے پیش کیے کہ سائنس کی پوری تاریخ کو بدل کر رکھ دیا لیکن آپ کی کوئی تجربہ گاہ نہیں ہے۔ آئن اسٹائن نے جیب سے قلم نکال کر کہا، This is my lab (یہ میری تجربہ گاہ ہے)۔ اب ان مثالوں سے میں قلم اور ادیب کی اہمیت کو اُجاگر نہیں کر رہا ہوں۔ قلم اور نگارشاتِ عالم کی وقعت و توقیر تو مسلّمات میں شامل ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ اس عہد میں ہماری نئی نسل کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور فیس بک جیسی ایجادات کے بعد تیزی سے قلم اور کتاب سے دُور ہوتی جارہی ہے۔ ہر چند کہ دیگر ممالک میں جہاں یہ ٹیکنالوجی اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے، یہ صورتِ حال نہیں ہے۔ جاپان کے شہر ٹوکیو میں آٹھ آٹھ منزلہ عمارتیں کتب فروشی کے لیے مختص ہیں۔ اسی طرح مغربی دنیا اور مشرق میں ہمارے ہمسایوں مثلاً چین اور ایران میں بھی یہ ٹیکنالوجی ذوقِ مطالعہ پر اثر انداز نہیں ہوئی ہے۔

جیسا کہ ٹامس مان نے کہا تھا:

The fate of modern man is written in political terms.

گزشتہ صدی کی دو عالمی جنگوں، ایٹمی تباہ کاریوں، ویت نام، فلسطین، ایران، عراق اور افغانستان کی جنگوں نے پورے کرۂ ارض اور عالمِ انسانیت کو ایک آتش فشاں کے دہانے پہ لاکھڑا کیا ہے۔ کیوبا کے مسئلے پر امریکا اور روس دو عالمی طاقتوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئے اور دنیا کو Zero Hour تک پہنچانے کے درپے ہوگئے، لیکن ایک بڑے مفکر اور دانش ور برٹرینڈ رسل نے خط کتابت کے ذریعے، اپنے قلم کے زور پر یہ عالمی تباہی رد کردی۔ ان کی یہ کاوش The Unarmed Victory کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوچکی ہے۔

کسی حساس اور باخبر شاعر یا ادیب کے لیے ہر قسم کی ذاتی مسرتوں اور آسائشوں کے باوجود انسان کی مجموعی صورتِ حال سے متاثر ہونا لابدی ہے۔ جیسا کہ گوئٹے نے کہا ہے:

میں اپنے لیے تو خوش ہوں مگر دوسروں کے لیے خوش نہیں ہوں۔

ہمارے یہاں میرزا یگانہ نے ایک اور سطح سے اپنے کرب کا اظہار فارسی زبان میں یوں کیا ہے:

صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ
داورا نمی زیبد بال و پر بہ من تنہا

اکیس ویں صدی کا منظرنامہ کسی ایک جہت سے وابستہ نہیں، بلکہ اس میں متعدد متضاد لہریں ایک دوسرے کے مقابلے بھی ہیں اور ایک دوسرے کو قطع بھی کر رہی ہیں۔ ایک طرف اگر انسانی اقدار کی پامالی خودکش حملوں اور ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے ہو رہی ہے تو دوسری طرف انسانی حقوق کی بحالی اور سربلندی کی تنظیمیں اپنے اپنے انداز میں سرگرمِ عمل ہیں۔ ایک عجیب سی دھوپ چھاؤں منظرنامے پر چھائی ہوئی ہے، تاہم مجموعی تاثر یہ ہے کہ لاتعلقی، عدم تحمل، سفاکی اور بے حسی بڑھتی جارہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سوختہ جانوں کی تپش میں بھی کمی آتی جارہی ہے۔ بہ قول میر تقی میر:

آسودگیِ سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

انسانی حقوق کمیشن اور اس جیسے دیگر ادارے جو عملی جدوجہد کر رہے ہیں، وہ دامن کو ہلانے ہی کی ایک سعی ہے تاکہ دلوں کی آگ بالکل ہی بجھ نہ جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ادیب کسی فرمائش، کسی وقتی ضرورت کا پابند نہیں ہے، لیکن اس کا ضمیر اور اس کا شعور تو بجائے خود ایک ایسی مہمیز ہوتا ہے جو اُسے آسودہ اور بے حس نہیں ہونے دیتا۔ ادیب خودغرضی کی زنجیروں سے آزاد ہوکر پوری انسانیت کے لیے سوچتا ہے۔

اس پس منظر میں یہ سوچنا بھی فطری امر ہے کہ اچھی نیتیں اور نیک ارادے خراب نتائج کی تلافی نہیں کرسکتے۔ کرپشن، نہ صرف زمانۂ حال کی نسلوں کے لیے عذاب گزیدگی کا سبب بنتی ہے بلکہ مستقبل میں آنے والی نسلوں پر بھی دور رس مضر اثرات مرتب کرتی ہے۔

بعض تجزیہ نگاروں نے اکیس ویں صدی کو ایشیائی صدی (Asian Century) سے بھی تعبیر کیا ہے۔ کرسٹوفر لنگل (Christopher

باقی صفحہ ۳۷ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

پروفیسر سحر انصاری صاحب ہمہ رنگ تخلیق کار اور ماہرِ تعلیم ہونے کے ناتے اردو ادب میں جدا مقام کے حامل ہیں۔ دو اختصاص محترم اسماعیل میرٹھی اور حرّیت پسند سرزمین میرٹھ سے تعلق آپ کے مزاج، برتاؤ اور لگن کو مزید آبدار کیے ہوئے ہیں۔ پروفیسر صاحب خاموش طبع مگر دُور بیں اور دُور اندیش اہلِ قلم میں نمایاں مقام پر اس لیے فائز ہیں کہ آپ نے نثر ہو، نظم ہو، تحقیق ہو، ترتیب ہو یا تاریخ ہو ہر شعبہ میں دقیقی نظر سے انتہائی مفید کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ شاید یہی سبب پروفیسر صاحب کے دوستوں کو مسحور اور دشمنوں کو مضطرب رکھتا ہے۔ ہر دو فریق اپنی اپنی طرز پر پروفیسر سحر انصاری صاحب کی شخصیت اور فن کو خراجِ تحسین یا خراجِ تنقید سے بھرپور انداز میں نواز رہے ہیں مگر انصاری صاحب نہ تو تحسین پر بے جا خوش گمانی میں گرفتار ہوتے ہیں اور نہ ہی تنقید کو خاطر میں لا کر کسی قسم کا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ یہی سحر انصاری صاحب کا کمال ہے جسے مربوط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

گلزار جاوید

☆ ہم جنگ آزادی کے مشہور شہر میرٹھ سے آپ کی نسبت تصور کیے بیٹھے تھے جبکہ آپ کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم کا حوالہ مراد آباد، اورنگ آباد سے جا ملا؟

☆☆ میرٹھ کی نسبت کو تصور کرنے میں آپ حق بہ جانب ہیں۔ میرا ننھیال میرٹھ ہی کا ہے میرے ننھیالی بزرگ مولانا اسمٰعیل میرٹھی تھے۔ میرے چھوٹے نانا سمیع الزماں سراب میرٹھی فیض عام اسکول اور پھر فیض عام کالج میں مدرس رہ چکے تھے۔ البتہ والد کا تعلق مراد آباد سے تھا۔ جس طرح اب ہوتا ہے اسی طرح میرے والدین اور ننھیال کے بزرگ تلاش روزگار کے سلسلے میں حیدر آباد اور اورنگ آباد منتقل ہو گئے۔ اور پھر ممبئی سے ہوتے ہوئے کراچی آ گئے۔ گویا انصاری ہونے کے باوجود روزِ اوّل سے مہاجر ہی رہے۔ ہمارے اجداد جن کا تعلق بنی خزرج سے تھا مدینے سے ہجرت کر کے بغداد گئے۔ جب آلِ برامکہ کا زوال شروع ہوا تو پھر ہجرت کر کے خجند (حالیہ روس) چلے آئے۔ وہاں سے شاہ جہاں کے عہد میں واردِ ہندوستان ہوئے۔ ننھیالی اجداد وقضاۃ کا عہدہ دیا میرے نانا قاضی عبدالخالق اس عہدے کے آخری فرد تھے۔ میرٹھ میں ہمارا محلّہ شائخان تھا۔ کراچی آنے کے بعد انجمن شائخان میرٹھ بھی قائم کی۔ جس کی دعوت پر اسلم سیفی صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ ۸۲ سال کے اسلم صاحب کو دیکھ کر مولانا اسمٰعیل کی نظم یاد آ گئی۔

میں اسلم کی بلّی سے کرتا ہوں پیار

مختلف شہروں میں رہنے کے باوجود ہمارا خاندان ایک ہی ہے۔ ہمارے کئی عزیز و اقارب اب بھی ہندوستان کے شہروں دہلی، ممبئی، رام پور، سنبھل، کھیری لکھیم پور اور مراد آباد میں سکونت پذیر ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ حیدر آباد اور اورنگ آباد دکن میں اب کوئی عزیز نہیں ہے۔

☆ جب خاندان کے بزرگ نظمیں، افسانے اور تفاسیر شوق سے پڑھتے تھے تب آپ کے مشاغل کیا ہوا کرتے تھے؟

☆☆ جب تک اسکول جانے کے قابل ہوئے گھر پہ ناظرہ قرآن کریم کی تکمیل کرتے رہے۔ گھر میں دینی اور مذہبی موضوعات بزرگوں کا حصہ تھے لیکن شعر و شاعری اور بیت بازی اور الفاظ سازی کے تاش کھیلنا بھی مشاغل میں شامل تھا۔ میں بھی اپنی بساط کے مطابق اس میں شریک ہو جاتا تھا۔

☆ اگر یہ بات درست ہے کہ آپ کے ادبی سفر کی ابتدا گُل پاکستان ڈیموکریٹک سٹوڈنٹ کنونشن سے ہوئی تو اس کا جواز جاننا بھی ضروری ہے؟

☆☆ حیدر آباد اور اورنگ آباد میں تلنگانہ تحریک کے زیرِ اثر انقلابی موضوعات ادب کا حصہ بنے۔ مخدوم محی الدین تو تھے ہی دکن کے۔ ان کے علاوہ کیفی اعظمی، سردار جعفری اور ساحر لدھیانوی نیز علامہ اقبال کے کلام اور پھر ۱۹۴۸ء میں سقوطِ حیدر آباد کے سانحے نے عشق و عاشقی کے موضوعات کی طرف لے جانے کے بجائے سماجی اور سیاسی امور کی طرف ذہن مبذول کر دیا۔ پھر پاکستان آ کر جن حالات سے گزرنا پڑا ان سے اس وابستگی کو اور تقویت ملی۔

☆ تعلیم کے بعد تدریس آپ کی چوائس تھی یا مجبوری؟

☆☆ تدریس میرا اپنا انتخاب تھا۔ میں بالکل بچپن میں ایک خیالی کلاس سجا کر بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ گھر کے سارے دروازے چاک (کھریا) سے بھر دیے جاتے تھے۔ میں اپنی صلاحیتوں کا اگر خود اندازہ کروں تو میں صحافت اور تدریس کے علاوہ کوئی اور کام کے لیے خود کو اہل نہیں سمجھتا۔

☆ صحافت کے کوچے کی صحرانوردی کے اسباب کیا تھے؟

☆☆ میں خود ایک ہفت روزہ ''نئی جمہوریت'' کا مدیر تھا۔ پھر کئی ادبی رسالوں سے بہ طور معاون مدیر کام کرتا رہا۔ خود بھی تمثال کے نام سے ایک سہ ماہی رسالے کا اجرا کیا۔ اب میری بیٹی ڈاکٹر عنبرین حسیب عنبر نے ''اسالیب'' کے نام سے ایک رسالے کی اشاعت شروع کی ہے اس میں میری مشاورت بھی شامل رہتی ہے۔ اخباروں کے لیے بھی لکھتا ہوں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان سے بحیثیت مشیر علمی و ادبی وابستہ ہوں یہاں تحقیقی کتابوں کے مسودات کی تنقیح و تصحیح کے علاوہ ماہنامہ ''قومی زبان'' اور سہ ماہی ''اردو'' کے لیے بھی میری مشورت شامل رہتی ہے۔

''چہارسُو''

☆ سائنس کے طالب علم کو اردو ادب نے کیونکر ہائی جیک کر لیا؟

☆☆ جیسا کہ میں نے عرض کیا گھر کا ماحول ادبی تھا۔ ادب سے دل چسپی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ پھر تدریس کی طرف تو ذہن تھا ہی سو چا انگریزی میں ایم۔اے کر لیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی پیشِ نظر رہی کہ اب جدید ادب کی تفہیم اور تخلیق کے لیے کم سے کم بی ایس سی تک کی استعداد ضروری ہے۔ اس کے بعد اب تک سائنس کا مطالعہ جاری ہے اور اس سے مجھے جدید مسائل کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

☆ آپ کے ہاں ہجرت کی بات کرنے والوں کا اشارہ کس جانب ہے؟

☆☆ پچاس کی دہائی میں ہمارا خاندان ہندوستان سے ترکِ سکونت کر کے پاکستان آیا۔ اس تجربے میں ذاتی طور پر میں بھی شامل ہوں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے دیگر علاقوں سے بھی خاندانوں نے ہجرت کی۔ اپنی بقا کے لیے ان کی قربانیاں اور جدوجہد میری آنکھوں دیکھی حقیقت ہے۔ کراچی کی حد تک حضرت ہاری مچھلی شہری نے جو بات کہی اور جسے پیر حسام الدین راشدی نے اپنے مضمون ''پنبہ کجا کجا نہم'' میں نقل کیا ہے اس سے ہجرت کی ساری صورت حال آئینہ ہو جاتی ہے۔ ہادی صاحب نے ایک سوال کے جواب میں کہا:

''میاں کیا پوچھتے ہو؟ پورا ہندوستان ویران ہوا ہے تب جا کر یہ کراچی آباد ہوا ہے۔ ایسے نامی اہلِ علم اور ایسے چیدہ لوگوں کا اجتماع یوں کہیں ہوا کرتا ہے؟''

☆ افسردگی کی زیریں لہر کی نشان دہی کرنے والے کسی خاص مسئلہ کی نشان تو نہیں کر رہے نیز آپ وجود کے جس غم کا ذکر شدت سے کرتے ہیں اُس کا پس منظر کیا ہے؟

☆☆ سقوطِ حیدرآباد۔ ترکِ وطن۔ پھر نئے ملک میں ایک نئی نفسیاتی اور سماجی صورت حال کے ساتھ اپنے ہونے کی جدوجہد کرنا یہ سب ایک خلقی رجائیت کے باوجود افسردگی اور ناسٹلجیا کا سبب تو بنتے ہی ہیں۔ اس کا اظہار ایک عرصے تک ہوتا رہا لیکن نظریاتی اعتبار سے میں کبھی پسپا نہیں ہوا اس لیے میری یہاں افسردگی تو ہے قنوطیت اور مایوسی نہیں۔

☆ یہ شاعری میں ہزار گونہ عذاب کی اصطلاح کس کی اختراع ہے؟

فارسی کے ایک شعر کا یہ دوسرا مصرعہ ہے

ہزار گونہ عذاب است جانِ مجنوں را

تو یہ اختراع مجنوں ہی کی ہے جس کا پیچھا لیلیٰ نے آج تک نہیں چھوڑا۔

☆ آپ کے ہاں سچائیوں کی سزا، ٹھوکریں اور طعنوں کا ذکر بھی خاص تجربات کی نشان دہی کر رہا ہے؟

☆☆ یہ مقامی اور عالمی سطح پر اہلِ علم، اہلِ دانش اور انسان دوست افراد اور اداروں کے خلاف جو منفی تحریکیں چلتی ہیں ان کی جانب اشارہ ہے۔

☆ آپ کی نسل کی خواہشات اور اُن کے چکنا چور ہونے کی کہانی کا پس منظر کیا ہے؟

☆☆ وہی ہے جو بزرگوں سے ورثے میں ملا ہے

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

.....

مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر

.....

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

☆ آپ نے شاعری میں جن سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے احباب کے ہاں اُن کی نسبت کس حد تک اطمینان پایا جاتا ہے؟

☆☆ محفلوں میں، ملاقاتوں میں اور اپنی تحریروں میں احباب نے اس پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔

☆ سحر انصاری کس معبود کی تلاش میں ہیں اور اُس کے ملنے کے کس حد تک امکانات پائے جاتے ہیں؟

☆☆ جہاں تک معبود کا تعلق ہے ہم بھی غالب کی پیروکار ہیں

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

☆ خدا سے گلہ بجا پہلے اعمال سے رجوع کرنا ضروری نہیں کیا؟

☆☆ یہ بات بہت گہری اور پیچیدہ بحثوں کی طرف لے جائے گی۔ ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک لٹو بناتے ہیں وہ آپ کی مخلوق ہے اور آپ اس کے خالق ہیں۔ جب آپ لٹو گھماتے ہیں تو اب لٹو آپ کی مرضی اور نیت کے تابع نہیں ہوتا وہ چار چکر لگا کر بھی رُک سکتا ہے۔ اس سے کم یا زیادہ بھی۔ گویا تخلیق خلق ہونے کے بعد اپنے خالق کی مرضی اور احکام کے تابع نہیں ہوتی۔ ویسے بھی انسان نائب خدا ہے۔ اب سوچیے کہ وہ منزل کہاں آتی ہے جب

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

☆ کچھ لوگ اس عمل کو شکوہ جواب شکوہ کی نقالی کے زمرے میں ڈالتے ہیں؟

☆☆ اقبال کے اثرات سے انکار نہیں۔

☆ فیض صاحب نے بُت شکنی کو بُت گری سے جو تعبیر دی ہے آپ ہمیں اُس کے پس منظر سے آگاہ کر سکتے ہیں؟

☆☆ وہ میراتیں سال کا کلام تھا جس کا بیشتر حصہ آمریت کی فضا میں تخلیق ہوا تھا۔ اب ہم میں فیض صاحب کی سی صلابت تو تھی نہیں جو کہہ سکتے تھے:

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے

فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

☆ جو لوگ فیض صاحب سے خصوصی قربت کا حوالہ رکھتے ہیں اُن میں

آپ کا نامِ نامی بھی سرفہرست ہے۔ قاری اور ناقد اس کی حقیقت جاننے کے خواہش مند ہیں؟

☆☆ اس کے بنیادی محرکات میں تو فیض صاحب کا کلام اوران کی شخصیت ہے پھر ادارۂ یادگارِ غالب کا قیام جس کے صدر فیض تھے، سیکرٹری مرزا ظفر حسن اور نائب معتمد میں تھا۔ اس سے فیض صاحب سے قربتیں بڑھتی گئیں۔ پھر کراچی میں ان کا قیام اوران کی ذاتی شفقت ومحبت اس سارے پس منظر کا حصہ ہیں۔ میں نے اپنی یادیں اپنی کتاب ''فیض کے آس پاس'' میں قلم بند کرائی ہیں۔ یہ کتاب پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی نے شائع کی ہے۔

☆ فیض صاحب نے غیر ملکی اہل قلم کی تحاریر کے تراجم کی ذمہ داری آپ کو کس بنا پر سونپی؟

☆☆ میرے بعض تراجم ان کی نظر سے گزر چکے ہیں اور انہوں نے پسندیدگی کا اظہار بھی کیا تھا۔

☆ مقالاتِ جوش کی ترتیب کا خیال کب اور کیونکر آیا اوراس کام کی افادیت کیا ہے؟

☆☆ جوش صاحب سے بھی نیازمندانہ قربتیں رہیں۔ یہ بڑے لوگوں کی بڑائی ہوتی ہے کہ وہ سمندر کی طرح آنے والوں کے لیے گنجائش پیدا کر دیتے ہیں۔ جوش صاحب کی شاعری کی طرح ان کی نثر بھی بے مثال ہے اس لیے سوچا کہ جتنے بھی مقالات اس وقت دستیاب ہو سکے ان کو مرتب کیا جائے۔ بعد میں اس کی افادیت کا احساس ہوا۔

☆ گوئٹے کے حوالے سے جرمن انسٹی ٹیوٹ کے تحت لکھے گئے آپ کے مقالات کی گمشدگی اتفاقی ہے یا حادثاتی؟

☆☆ حادثاتی۔ میرے ذاتی کتب خانے میں دومرتبہ آگ لگی یا لگائی گئی۔ جس میں بہت کچھ تلف ہو گیا۔ آخری حادثے کے نتیجے میں ہارٹ اٹیک ہوا اور بائی پاس سے گزرنا پڑا۔

آج تک اک استعارہ ہی سمجھتے تھے اسے
زخمِ دل کھلتے ہوئے چاقو سے پہچانا گیا

☆ برٹرینڈ رسل کا مرثیہ کن احساسات کے تحت لکھا اور احباب نے اس کا خیر مقدم کس طرح کیا؟

☆☆ برٹرینڈ رسل کی شخصیت اور تحریروں سے کالج کے زمانے ہی میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ پھر کیوبا اور ویت نام کے سلسلے میں اس فردِ واحد نے جو کارنامہ انجام دیا Unarmed Victory اس کی گواہ ہے۔ بس یہی جذبات تھے۔ احباب نے پسند کیا۔ جمیل الدین عالی نے اپنے کالم میں پوری نظم نقل کی اور اسے سراہا۔

☆ جو لوگ آپ کو رُلکے، کیٹس اور فانی سے بریکٹ کرتے ہیں اُن کا منشاو مقصود کیا ہے؟

☆☆ ان کے نزدیک میری شاعری میں ذاتی اور کائناتی سطح کے غموں کا دبا دبا تاثر پایا جاتا ہے۔

☆ وہ کون سے مغربی شاعر ہیں جن کی رائے سے آپ نے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اردو ادب پروپیگنڈہ نہیں ہے؟

☆☆ ڈبلیو۔ ایچ۔ آڈن

☆ سحر بھائی! آپ کو پُر اسرار آدمی کہنے والے کسی خاص وصف کی نشان دہی کر رہے ہیں؟

☆☆ یہ انہی سے دریافت کیجیے۔

میں کوئی دشمنِ دنیا تو نہیں
میں نے دنیا میں جو دیکھا لکھا

☆ ملوکیت اور ملائیت سے چھٹکارا تو ہر صاحبِ فہم چاہتا ہے۔ یقیناً اللہ ربِ کریم کی توفیق سے ہی سب کچھ ممکن ہوتا ہے مگر کوئی طریقہ کار بھی تو وضع ہونا چاہیے؟

☆☆ تعلیم اور تحقیق واحد طریقہ کار ہے۔ موجودہ صورت حال تو یہ ہے:

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی وملّا کے غلام اے ساقی
(اقبال)

☆ اپنے عہد کی بابت جو تشفق آپ کے ہاں پایا جاتا ہے وہ ادبی ہے، سیاسی یا سماجی بالخصوص کراچی کے حوالے سے صورتِ حال کی وضاحت ضروری ہے؟

☆☆ ان میں آپ کے بیان کردہ سارے عوامل شامل ہیں۔

☆ اردو ادب کو عمل کے بجائے کھوکھلے دعووں کا ادب کہنے والوں کو جواب کن الفاظ میں دیا جانا چاہیے؟

☆☆ جواب جاہلاں باشد خموشی

☆ شاعری میں نت نئے تجربات بالخصوص نظم کے حوالے سے بحث طولانی ہوتی جارہی ہے آپ اس کا احاطہ کس طرح کریں گے؟

☆☆ ادب میں تجربے اوران کے بارے میں ہونے والے مثبت یا منفی ردِعمل ہمیشہ مفید ہوتے ہیں۔ شائستگی کے دائرے میں رہ کر ذاتی حملوں کے بجائے اصولی بحثیں کرنا اس امر میں ضروری ہے۔

☆ آپ کے ہاں فارسی، سنسکرت اور ہندی کے جدید وقدیم ادب سے جو شغف پایا جاتا ہے ایک تو اُس کا ماخذ بتایئے۔ آپ کی اس ہنروری سے اردو ادب کو کیا حاصل ہوا؟

☆☆ ان زبانوں کے ادب کا میں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اوران کے بعض اسطور اور علامات کو عہد حاضر کی زندگی سے جوڑا ہے۔ اس کاوش کو پسند کیا گیا ہے۔

''چہارسُو''

☆ انگریزی زبان ، ادب اور تنقید آپ کے پسندیدہ مضامین رہے ہیں۔اردو زبان،ادب اور تنقید کا موازنہ آپ کس طرح کریں گے؟

☆☆ انگریزی بلکہ تمام مغربی زبانیں قدیم یونان اور روم کے ادبی اور فلسفیانہ پس منظر کو سامنے رکھتے ہیں۔ہمارے یہاں ملا جُلا رجحان پایا جاتا ہے۔

☆ خدا لگتی بات تو یہ بھی ہے کہ ہمارے ناقدین نے آپ کو اُس توجہ کا مستحق نہیں جانا جس کے آپ درست طور پر مستحق ہیں؟

☆☆ بقول عزیز حامد مدنی:

یہ میرے عہد کا اک دورِ خوش نوائی ہے
مگر سکوت ہے ایسا کہ مرحبا کہیے

☆ آپ کے ابتدائی زمانے میں ترقی پسندی ایک فیشن تھا آج یہ گالی بن چکی ہے؟

☆☆ مجھے آپ کی دونوں باتوں سے اتفاق نہیں۔

☆ آرٹس کونسل اور کراچی ادبی کمیٹی سے آپ کی طویل وابستگی کو لوگ باگ گروپ اور دھڑے بندی سے کیوں تشبیہہ دیتے ہیں؟

☆☆ آرٹس کونسل میں پانچ ہزار سے زائد اراکین ہیں۔ہر سال انتخابات ہوتے تھے اب دو سال بعد ہوں گے۔اس میں دھڑے بندی کا سوال ہی نہیں۔ ممبران کارکردگی کو دیکھ کر ووٹ دیتے ہیں۔

☆ بطور سیکرٹری اردو ڈکشنری بورڈ کے تجربات اور سرخ فیتے کی کار فرمائی پر کچھ آگاہی دیجیے؟

☆☆ بس کچھ نہ پوچھئے۔

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

☆ پروفیسر صاحب!جس قدر زبان وادب کی ترقی وترویج کے ادارے تشکیل پا رہے ہیں اُسی قدر زبان وادب پر زوال نازل ہو رہا ہے؟

☆☆ زبان کے بارے میں بے رُخی، بے اعتنائی اور غیر ذمہ داری کا عمل جاری ہے۔زبان کے مسلسل زوال کا سبب ہمارا سوشل میڈیا ہے۔پھر نظام تعلیم کھوکھلی بنیادوں پر چل رہا ہے اگر کوئی شخص زبان کے ضمن میں کوئی قابلِ قدر کام کرتا ہے تو یہ اس کی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔حکومت یا اداروں کا اس میں کوئی ''قصور'' نہیں۔

☆ یہ جو آج کل سرکاری طور پر اردو زبان کے نفاذ کا عمل جاری ہے اس کے ٹھوس نتائج کی بابت خوش امیدی قائم کرنا درست ہوگا؟

☆☆ خود چیف جسٹس صاحب فرما چکے ہیں کہ میں نے آئین کے تحت فیصلہ سنا دیا ہے لیکن قوت نافذہ میرے پاس نہیں ہے۔یہی قوت نافذہ تو:

؎ اب ''اسے'' ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

☆ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا کریڈٹ بھی آپ کو دیا جاتا ہے کیا آپ اُن میں سے کچھ ناموں کی نشان دہی کرنا پسند کریں گے جن سے آپ کو اردو ادب کا مستقبل تابناک نظر آتا ہو؟

☆☆ نام میں کیا رکھا ہے۔وہ سب ترقی کر رہے ہیں۔میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

☆ عالمی سطح پر ایک خیال بہت تیزی سے گردش کر رہا ہے کہ آنے والے بیس، تیس یا پچاس برسوں میں کم وبیش پانچ ہزار زبانیں اپنے وجود سے محروم ہو جائیں گی۔اس حوالے سے اردو زبان کی نسبت آپ کا حسنِ ظن کیا ہے؟

☆☆ زبان ایک سماجی ضرورت ہے۔سماج میں جب تک اردو بولنے والے زندہ ہیں اُسے ایسا کوئی خطرہ نہیں۔

☆ اس وقت دنیا میں مادہ پرستی نے جو اوّلیت حاصل کر لی ہے وہ بجائے خود باعث تشویش ہے مگر علوم وفنون کی زبوں حالی اس تشویش کو دوچند کر رہی ہے؟

☆☆ مادہ پرستی اور روحانیت ان میں ہمیشہ سے تصادم رہا ہے۔کبھی کم کبھی زیادہ۔ابھی بحرانی کیفیت ہے۔

یہ طوفان تھم جائے تو دیکھئے گا

☆ پروفیسر صاحب اردو زبان، ادب اور شاعری میں رومان کا تناسب دیگر زبانوں کی نسبت زیادہ ہونے کا سبب کیا ہے؟

☆☆ بھائی صاحب! آدمی کی کوئی مصروفیت نہ ہو، زمین، جائیداد یا وظیفہ پر گزارا ہوتا ہو اس پہ طرّہ یہ کہ طبیعت بھی رواں ہو۔اس کے بعد عشق کرنے کے سوا آدمی کے پاس رہ کیا جاتا ہے۔

☆ آپ کے علمی، ادبی رویے بھی رومان کی زد میں رہے ہیں؟

☆☆ یہ کوئی نئی بات نہیں۔تخلیق کار کا جمالیات سے تعلق نہ ہو تو اُس کی تخلیق میں تاثیر کہاں سے آئے گی۔غالبؔ سے لے کر جوشؔ، فراقؔ، فیضؔ، فرازؔ حتیٰ کہ اقبالؔ کو بھی نہیں بخشا گیا۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

آپ دیوانہ کی جگہ افسانہ کر لیں تو جواب مکمل ہو جائے گا۔

☆ گزشتہ دنوں ایک محترمہ نے آپ کی ذات پر براہِ راست الزامات لگا کر بہت سے سوالوں کو جنم دے دیا ہے؟

☆☆ گلزار صاحب! اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری طرح آپ بھی کان کے کچے ہیں۔چھوڑو میاں کوئی سنجیدہ سوال ہو تو جواب دیا جائے، فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال میں اس لغو اور بے بنیاد الزام سے بریّت کے لیے آپ کو عدالت سے رجوع کرنا چاہیے تھا؟

☆☆ گلزار میاں! اس طرح کے بودے الزامات سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے لگائے جاتے ہیں جو وقت کی گرد میں آپ گم ہو جاتے ہیں۔

''ورقِ گل پہ داستان''

(سحؔر انصاری کے غزلیہ کلام سے مستعار)

فاری شا (راولپنڈی)

شہر کا شہر ہے شہیدِ فغاں　　پایئے جا کے دادِ ضبط کہاں

میری حالت پہ دیدۂ گریاں　　اس قدر رو کہ ڈوب جائے مکاں

کوئی کرتا بھی اعتبار تو کیا　　میں نہ تھا اعتبارِ سود و زیاں

یہ مسرّت بھی کیا دلِ برباد　　یہ تبسم بھی کیوں غمِ پنہاں

کون سی فصل آ گئی آخر　　لمسِ بادِ صبا ہے نوکِ سناں

کیا لکھا ہے مری بہار کے نام　　خندۂ گل کہ شبنمِ مژگاں

کیا چراغوں کی آرزو کیجیے　　پھیلتا جا رہا ہے دل میں دھواں

اے خداوندِ درہم و دینار!　　جنسِ احساس اور شرطِ دکاں

کون آزاد کر سکے گا مجھے　　میں ہوں صیدِ یقیں، اسیرِ گماں

کس نے لکھی ہے اس سلیقے سے　　ورقِ گل پہ داستانِ خزاں

بھولتا جا رہا ہوں اپنی وفا　　یاد ہیں تیرے وعدہ و پیماں

اپنی بربادیاں بھی میرا ضرر　　تیری افسردگی بھی میرا زیاں

میں ہوں اپنا شہود، اپنی نمود　　مجھ میں گُم ہیں مرے زمان و مکاں

کیا قیامت ہے یہ فریبِ ابد　　لکھ رہا ہوں ازل سے فردِ زیاں

خوب ہیں یہ رفاقتیں بھی سحؔر
کوئی ساحل ہے، کوئی موجِ رواں

○

☆

نہ دوستی سے رہے اور نہ دشمنی سے رہے
ہمیں تمام گِلے اپنی آگہی سے رہے

وہ پاس آئے تو موضوعِ گفتگو نہ ملے
وہ لوٹ جائے تو ہر گفتگو اسی سے رہے

ہم اپنی راہ چلے، لوگ اپنی راہ چلے
یہی سبب ہے کہ ہم سرگراں سبھی سے رہے

وہ گردشیں ہیں کہ چھُٹ جائیں خود ہی ہات سے ہات
یہ زندگی ہو تو کیا ربطِ جاں کسی سے رہے

کبھی ملا وہ سرِ رہ گزر تو ملتے ہی
نظر چُرانے لگا، ہم بھی اجنبی سے رہے

گداز قلب کہے کوئی یا کہ ہرجائی
خلوص و درد کے رشتے یہاں سبھی سے رہے

○

☆

کہتے ہیں حسن و عشق کے موسم بدل گئے
دنیا بدل گئی ہے کہ خود ہم بدل گئے

کس طرح زندگی کو نیا کہہ رہے ہیں لوگ
خوشیاں بدل گئیں کہ یہاں غم بدل گئے

بدلے نہیں ہیں وقت کی صورت ہمارے دوست
اتنا تو ہے کہ وقت سے کچھ کم بدل گئے

رہتے تھے جسم و جاں کی طرح ساتھ ساتھ ہم
پھر کچھ تو تم بدل گئے کچھ ہم بدل گئے

اک اجنبی سے شہر میں مدت کے بعد آج
دیکھا اُسے تو کتنے ہی عالم بدل گئے

سہما ہوا ہے امن کی ہر فاختہ کا رنگ
خوں میں نہا کے صلح کے پرچم بدل گئے

○

☆

کس کا رَنج و الم زیادہ نہیں
کون یاں سر بکف نہادہ نہیں

میں مسافر ہوں ایسی منزل کا
جس کی قسمت میں کوئی جادہ نہیں

سب کو چھوڑا ترے لیے اور اب
تجھ سے ملنے کا بھی ارادہ نہیں

ہو نہ برہم کہ زندگی اپنی
چند روز اور ہے زیادہ نہیں

میں وفا کیش ہوں مرا انعام
زہرِ قاتل ہے، جامِ بادہ نہیں

تو بھی چالاک ہے محبت میں
اور اس درجہ میں بھی سادہ نہیں

وہ توجہ بھی سوچی سمجھی تھی
یہ تغافل بھی بے ارادہ نہیں

آدمی ہوں، زمیں کا بیٹا ہوں
شکر ہے میں بہشت زادہ نہیں

○

☆

وصال وہجر سے وابستہ تہمتیں بھی گئیں
وہ فاصلے بھی گئے، اب وہ قربتیں بھی گئیں

دلوں کا حال تو یہ ہے کہ ربط ہے نہ گریز
محبتیں تو گئی تھیں عداوتیں بھی گئیں

لُبھا لیا ہے بہت دل کو رسمِ دنیا نے
ستم گروں سے ستم کی شکایتیں بھی گئیں

غرورِ کج کلہی جن کے دَم سے قائم تھا
وہ جرأتیں بھی گئیں، وہ جسارتیں بھی گئیں

نہ اب وہ شدتِ آوارگی نہ وحشتِ دل
ہمارے نام کی کچھ اور شہرتیں بھی گئیں

دل تباہ تھا بے نام حسرتوں کا دیار
سواب تو دل سے وہ بے نام حسرتیں بھی گئیں

ہوئے ہیں جب سے برہنہ ضرورتوں کے بدن
خیال وخواب کی پنہاں نزاکتیں بھی گئیں

ہجوم سرد وسمن ہے نہ سیلِ نکہت و رنگ
وہ قامتیں بھی گئیں، وہ قیامتیں بھی گئیں

بھلا دیئے غمِ دنیا نے عشق کے آداب
کسی کے ناز اٹھانے کی فرصتیں بھی گئیں

کرے گا کون متاعِ خلوص یوں ارزاں
ہمارے ساتھ ہماری سخاوتیں بھی گئیں

نہ چاند میں ہے وہ چہرہ، نہ سرو میں ہے وہ جسم
گیا وہ شخص تو اس کی شباہتیں بھی گئیں

گیا وہ دورِ غم انتظارِ یار سحرؔ
اور اپنی ذات پہ دانستہ زحمتیں بھی گئیں

○

☆

پاؤں شل ہو گئے دربار تک آتے آتے
جانے کیا گزرے گی دستار تک آتے آتے

دل سی شے، جس کی بڑی دھوم تھی بازار میں
کیا ہوئی دستِ خریدار تک آتے آتے

ہم تو ہر رنگ میں اخلاص سراپا ہی رہے
یار کیا ہو گئے اغیار تک آتے آتے

ہم نے ہر بار یہ اعلان سنا دشت کے بیچ
فصلِ گُل رہ گئی گلزار تک آتے آتے

بزدلی سے ہی نہ تعبیر کرے میرا عدو
ہاتھ جو رُک گیا تلوار تک آتے آتے

نہ وہ پہلی سی تڑپ ہے نہ وہ پہلی سی اُمنگ
دل کو کیا ہو گیا دلدار تک آتے آتے

ہوسِ درہم و دینار ہی باقی نہ رہی
کششِ درہم و دینار تک آتے آتے

دوپہر دھوپ رہی جن کی رفاقت میں سحرؔ
پھر گئے سایۂ دیوار تک آتے آتے

○

☆

ہوس و وفا کی سیاستوں میں بھی کامیاب نہیں رہا
کوئی چہرہ ایسا بھی چاہیے جو پسِ نقاب نہیں رہا

کم و بیش ایک سے پیرہن کم و بیش ایک ہی سا چلن
سرِ راہ اب کسی وصف کا کوئی انتخاب نہیں رہا

یہ زمین روزِ حساب تک رہے گردشوں ہی کی زد میں کیوں
یہ سوال وہ ہے کہ جس کا اب کوئی ایک جواب نہیں رہا

میں ہر ایک شب یہی بند آنکھوں سے پوچھتا ہوں سحر تلک
کہ یہ نیند کس لیے اُڑ گئی اگر ایک خواب نہیں رہا

وہ کتابِ دل جسے ربط تھا ترے کیفِ ہجر و وصال سے
وہ کتابِ دل تو لکھی گئی مگر انتساب نہیں رہا

یہاں راستے بھی ہیں بے شجر، ہے منافقت بھی یہاں ہنر
مجھے اپنے آپ پہ فخر ہے کہ میں کامیاب نہیں رہا

یہ سنا ہے اب وہی اگلی ساری مسافتوں کا ہے ہم سفر
تری جلوتوں تری خلوتوں میں جو باریاب نہیں رہا

مجھے رنگِ گردشِ وقت کی جو خبر ہوئی بھی تو کس گھڑی
مرے آفتاب کے رُخ پہ جب گُلِ آفتاب نہیں رہا

○

سحر انصاری کے سوالات

فتح محمد ملک
(اسلام آباد)

سحر انصاری نے اپنے دوسرے مجموعۂ کلام ''خُدا سے بات کرتے ہیں'' کا آغاز اپنی جس نظم سے کیا ہے وہ ہم سے اور ہماری دُنیا سے بہت کچھ کہتی ہے۔ اِس نظم میں خالقِ اکبر سے بغاوت کا نعرہ گونجتا سُنائی نہیں دیتا۔ اِس کے برعکس انتہائی دردمندی کے ساتھ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے اپنی دنیا میں تخریب کاری، دہشت گردی اور تشدد پسندی پر چند بنیادی سوالات اُٹھائے گئے ہیں۔ یہ گویا خدا کی جانب سے ابنِ آدم کو فکر و عمل کی آزادی بخشنے کے ہول ناک نتائج پر تخلیقی غور و فکر کی ایک نادر و نایاب مثال ہے۔ یہاں لہجہ نہ جارحانہ ہے اور نہ معاندانہ، بلکہ سراسر دوستانہ ہے:

اندھیروں کے شکنجوں میں ابھی تک کیوں اُجالے ہیں
جو مظلوموں کی لاشوں پر بھیانک رقص کرتے ہیں
وہ کرگس کس نے پالے ہیں
تمدن ساز نقاشوں کی تخلیقات کے ہوتے
سگانِ خیرہ سر کیسے گلی کوچوں میں آ پہنچے

تباہی کے مناظر ہم نے خود آنکھوں سے دیکھے ہیں
کہیں شعلے بھڑکتے ہیں، کہیں لاشے تڑپتے ہیں
وغائے کاذبِ دوراں میں بچوں کی خطا کیا تھی
نہتّی عورتوں، معصوم بچوں کی خطا کیا تھی؟
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

میں نے یہ نظم بار بار پڑھی اور ہر بار مولانا حالی کی مسدس مدوجزرِ اسلام کا یہ شعر یاد آیا:

اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اِسی نسخۂ کیمیا نے جاہلیت کی ظلمتوں کو نُورٌ علیٰ نُور کر دیا تھا۔ سحر انصاری نے ''ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تُو نے'' کے مصداق ہمیں آج کی جاہلیتِ جدیدہ سے نکلنے کا راستہ بتایا ہے۔ اُن کی صدائے دردناک ہمارے دل میں گھر کرتی ہوئی کہتی ہے کہ آؤ ملوکیت اور مُلّائیت کے ترجمانوں کی بجائے براہِ راست خدا سے بات کریں۔ سحر انصاری نے کتاب میں شامل اپنے ابتدائی کلمات میں ہمیں اس سوال پر بھی غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ ہم روشنیوں کے سفر میں اچانک تہ در تہ تاریکیوں میں کیوں کر جانکلے؟:

ہم نے ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولی جہاں شعر و ادب کا چرچا کسی بھی گھرانے کے مہذب ہونے کی پہچان ہوا کرتا تھا۔ ذاتی بیاضیں، منتخب اشعار اور پسندیدہ اقوال سے مزیّن ہوتی تھیں۔ نئی کتابوں اور تازہ شماروں کا انتظار رہتا تھا۔ مشاعرے تہذیبی زندگی کے لیے آبِ حیات کی حیثیت رکھتے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہماری آنکھوں کے سامنے سے وہ دنیا رخصت ہوگئی۔ اب معاشرے کے معیارات اور زندگی کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ میں اپنے دورِ گزشتہ کو romanticize نہیں کر رہا ہوں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور میں انسانیت سوز واقعات جس تسلسل اور تواتر کے ساتھ ہو رہے ہیں، ان کا تصور بھی ماضی میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دورِ حاضر ہی ہے جس میں عورتوں کو زندہ دفن کیا جا رہا ہے۔ ان پر کتے چھوڑے جا رہے ہیں، ان کی درس گاہیں تباہ کی جا رہی ہیں۔ سزا کے طور پر گلی گلی برہنہ پھرایا جاتا ہے۔ قانون کے محافظ تین سال کی بچی تک کو درندگی کا نشانہ بنانے سے گریز نہیں کرتے۔ اسی دور میں اولاد فروشی کے سنگین واقعات بھی ہو رہے ہیں۔ فاقہ اور بیروزگاری سے تنگ آ کر خودسوزی کی جا رہی ہے اور دوسری طرف عیش و طرب کی محفلیں گرم ہیں۔ مجرموں پر لاکھوں روپے لٹائے جا رہے ہیں۔ افلاس، بیماری، عدم تحفظ اور اس پر مستزاد ان اقوامِ عالم کی چیرہ دستیاں کہ جو ہمیں سانس لینے سے بھی محروم کر دینا چاہتی ہیں۔ ہم ان طاقتوں کے ہات گروی رکھے جا چکے ہیں۔
(اِک ناگزیر دنیا)

نتیجہ یہ کہ:

ستم کاروں کے لشکر فتح پاتے ہیں تو کیوں آخر
رواں ہے بستیوں میں کس لیے سیلابِ خوں آخر
جہنم سے زیادہ تند شعلے کیوں دہکتے ہیں
یہ بے تابوت لاشے کس کی آخر راہ تکتے ہیں
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

جو گھر میں اِک دیے کی روشنی کرنے سے قاصر ہوں
وہ دہشت گرد کہلائیں!
جو لمحہ بھر میں زندہ بستیاں تاراج کر ڈالیں
وہ امن و آشتی و صلح کے ہمدرد کہلائیں!

(خدا سے بات کرتے ہیں)

ملتِ ابراہیمی کی طویل مگر خوں چکاں تاریخ کے سفر میں نارِ نمرود سے لے کر بھڑکل دروازہ اور پاکستان کے عروس البلاد کی مختلف چورنگیوں پر فراتِ اشک اور دجلۂ خوں کی داستان بدستور دُہرائی چلی جا رہی ہے۔ آج ہماری ادبی دنیا میں سحر انصاری وہ تنہا شاعر اور دانش ور ہیں جو ہمارے آج کے مصائب کو دُنیائے انسانیت کی طویل تاریخ کے تناظر میں عصری آگہی سے اخذ کیے گئے نئے شعور کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے میں مصروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے زیرِ نظر تازہ ترین شعری مجموعے کی پہلی اور آخری ہر دو نظموں کا عصرِ حاضر کی نارِ نمرود ہے۔ یہاں میں

''چہارسُو''

قارئینِ کرام کی توجہ اُن کی اِس نظم کی جانب مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں:

فصیلِ شہر سے ملحق
قوی ہیکل سا دروازہ
اندھیری رات کے مانند
سدِراہ بنتا تھا
اسی کے پاس اک کتبے پہ لکھا تھا
کہ اِس شہرِ تمدن میں کسی
اگلے زمانے کے فراست کیش راجا نے
اس دیوِقوی ہیکل کو
جنگِ دوبدو میں
خاک کا پیوند کر ڈالا
اور اس میں یہ بھی لکھا ہے
کہ اِس دیوِقوی ہیکل کی
مرگ آساز باں پر
خار تھے ایسے
کہ جیسی آہنی کیلیں گڑی ہیں
شہر کے شب رنگ دروازے
کے سینے پر

زمانہ ہو گیا
اس شہر سے آئے ہوئے مجھ کو
مگر وہ دیو اور اس کی زباں کے آہنی کانٹے
مری دنیا کا حصہ بن کے مجھ پر وار کرتے ہیں
جہاں میں ہوں
وہ دروازہ نہیں اس شہر میں لیکن
زباں اُس دیو کی اُس آہنی
خاروں سے
زخمی کر رہی ہے زندگی کے
زندہ داروں کو
مسلسل خوں چکاں ماحول
کے ماتم گساروں کو

یہاں مجھے سحر انصاری کے پہلے مجموعہ کلام ''نمود'' میں شامل اُن کی ایک نظم بعنوان ''قابیل کا سایہ'' یاد آتی ہے جو آج سے نصف صدی پیشتر لکھی گئی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ہمارے شہروں میں امن وسلامتی کی صورتِ حال قابلِ رشک تھی۔ امن وامان کی اِس فضا میں بھی سحر انصاری نے حیرت انگیز پیش بینی کے ساتھ ہمیں متنبہ کیا تھا کہ:

خدا خاموش ہے اور خوف وغم سے نیم جاں انساں
ہوا کی لہر کو بھی موت کی آہٹ سمجھتے ہیں
کسی کو کچھ نظر آتا نہیں لیکن کوئی جذبہ
یہ چپکے چپکے کہتا ہے کہ اے ہابیل اے ہابیل
ہلاکت کے نئے سامان سے آراستہ ہو کر
گلی کوچوں میں آ پہنچا ہے پھر قابیل کا سایہ

ہماری عصری شاعری میں اِس حیرت انگیز پیش بینی پر غور کرتا ہوں تو کھلتا ہے کہ اِس وقت ہمارے ہاں سحر انصاری کا سا کوئی ایسا دانش ور نظر نہیں آتا جو آج کے انسانی مصائب پر فلسفہ وتمدن کے تاریخی ارتقا پر اُن کی سی گہری نظر رکھتا ہو۔ فکر وفلسفہ سے اُن کے گہرے تخلیقی شغف کا اندازہ اُن کے اُس مرثیے سے کیا جا سکتا ہے جو اُنھوں نے ۲۸ فروری ۱۹۷۰ء میں عہدِ حاضر کے عظیم فلسفی برٹرینڈ رسل کی وفات پر لکھا تھا اور میں یہاں جس کا پہلا بند قارئینِ کرام کی نذر کر رہا ہوں:

وہ ایک عہدِ تغیر، وہ اک صدی کا ضمیر
بدن کی شکل میں قائم نہیں رہا لیکن
اداس اداس، فسردہ فضاؤں کی صورت
اب اس کی راکھ کو چہروں پہ اپنے مل لیجے
خرد کے شہر میں جس سے چلی ہے رسمِ جنوں
اب اس کی فکر سے روحوں میں روشنی کیجیے

یہاں یہ بات انتہائی قابلِ غور ہے کہ سحر انصاری فلسفے کو فقط خرد تک محدود نہیں سمجھتے بلکہ خرد کو جنوں کے آداب سکھانا فلسفے کے کمالات میں شمار کرتے ہیں۔ انھوں نے سائنسی حقائق کو کس سہلِ ممتنع انداز میں شاعری بنایا ہے اُس کا اندازہ غزل کے درج ذیل چند اشعار سے کیا جا سکتا ہے:

ایک ذرّے کی عنایت سے کُھلا ہم پہ سحرؔ
ایک جوہر میں نہاں ہوتے ہیں جوہر کتنے

بہت عجیب ہے توسیعِ ذات کا احساس
حدودِ جاں سے الگ چار سُو میں زندہ ہوں

لوگ برباد سرِ راہ گزر کیسے ہیں
شہرِ جاناں ! ترے آدابِ سفر کیسے ہیں

ہونا تھا جن کو شہرِ محبت کا پاسباں
لڑتے رہے ہیں منبر ومحراب کے لیے

درجِ بالا اشعار میں سے آخری شعر مُلّائیت، ملوکیت اور مغربی

سامراجیت کے پروردہ نام نہاد اسلام پسندوں کا اسلام کی حقیقی انقلابی روح سے مسلسل انحراف شہرِ محبت کی بربادی کا بنیادی سبب بتایا ہے۔ سحر انصاری نے ایک ترقی پسند نظریۂ حیات سے اٹوٹ وابستگی کی بدولت زیردستوں اور خاک نشینوں سے محبت کی شاعری تخلیق کی ہے۔ ''ایک محنت کش کی ڈائری''، ''آدمی کے بارے میں'' اور ''آدمی کا حوصلہ''، ''ہم آرہے ہیں'' اور ''عام آدمی'' کی نظمیں ہمارے آج کا آدمی نامہ ہیں:

ہم نے اپنی آنکھوں سے بارہا یہ دیکھا ہے
آدمی کے سایے سے بھیڑیے بھی ڈرتے ہیں
ہر سیاہ کاری پر کرگسوں کے غول آ کر
پھول پیش کرتے ہیں
مار ہوں کہ عقرب ہوں، شیر ہوں کہ اژدر ہوں
آدمی سے بڑھ کر کب آدمی کے دشمن ہیں
(آدمی کے بارے میں)

آدمی آدمی کا خداوند ہے
آج زنداں میں جب اُس سے ملنے گیا
اُس نے ہنس کر کہا
''یہ بھی سچ ہے میاں
آدمی آدمی کا خداوند ہے!''

اور:

آدمی آدمی کا بہی خواہ ہے
ورنہ کیوں آج ہڑتال کے نام پر
اس قدر لوگ سڑکوں پہ آتے گئے
کس لیے اتنے پرچم فضا میں کھلے
کس لیے گیس، گولی کے سایے میں بھی
لوگ بڑھتے رہے
لوگ بڑھتے رہے (ایک محنت کش کی ڈائری)

آدمی کو اُس کے اپنے بام و در
گونگل لیتے ہیں شیر و مار و اژدر کی طرح
اپنے گھر کی چھت ہی کر دیتی ہے اس کو بے اماں
پھر بھی نقشِ آدمی ہوتا نہیں ہے بے نشاں
آدمی رہتا ہے پھر بھی آدمی
وار کرتی ہے اگرچہ تیرگی
گم نہیں ہوتی ہے دل کی روشنی (آدمی کا حوصلہ)

آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر ''نمود'' کے پیش لفظ میں پروفیسر مجتبیٰ حسین نے کیا خوب لکھا تھا کہ ''اس مجموعے میں غزلیں بھی شامل ہیں، تہذیبِ شاعری سے باخبر ہونے کی بنا پر سحر کے یہاں نظمیں اور غزلیں ایک دوسرے کی حریف نہیں ہیں۔ ان غزلوں میں بھی وہی فکر افروزی اور دل نوازی ہے جو ان کی نظموں میں ہے۔ اپنے عہد کے المیے کو انسانی تاریخ سے ربط دے کر پڑھنا اور پھر شعر میں ڈھالنا حوصلے اور جرأت کا کام ہے۔ یہ نوحے کی کتاب ہے — آگہی سے قبل کا نوحہ اور آگہی کے بعد کا نوحہ۔ اِن نوحوں میں اتنی توانائی ہے کہ انسانیت اور انسانیت کی بقا کے بارے میں ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔'' (ص ۱۰) فیض احمد فیض نے سحر انصاری کے پہلے مجموعۂ کلام ''نمود'' کا خیر مقدم کرتے وقت اسے ''ایک بہت تعلیم یافتہ، خیال افروز اور سنجیدہ ذہن کی تخلیق'' قرار دیا تھا۔ فیض کے مطابق سحر انصاری'' کا موضوعِ سخن ہی بیشتر وہ ہزار گونا عذاب ہے جو اِن دنوں جانِ مجنوں کو ہر لحظہ درپیش رہتا ہے اور وہ ہزار گونا مظالم ارد گرد حساس اور باضمیر افراد پر توڑے جاتے ہیں۔ یہ خون خرابہ خود اپنی ذات سے بھی کیا جاتا ہے، عقائد و روایات سے بھی، اپنے معاشرے اور اُس کے چلن سے بھی۔ جس سنجیدگی اور غور و فکر سے اس کا بیان سحر کے کلام میں ہوا ہے کچھ ڈھونڈے ہی سے ملے گا۔'' گزشتہ تین چار دہائیوں سے سحر کا فن مسلسل ارتقا پذیر رہا ہے مگر افسوس صد افسوس، ہماری تہذیب و معاشرت مسلسل زوال پذیر چلی آ رہی ہے۔ سحر انصاری کی شاعری اِس زوال سے پنجہ آزما ہے:

ہوا کے دوش پہ ہے خاک گفتگو کے لیے
بہت ہے دیدۂ نم ناک گفتگو کے لیے
گل و سمن تو ہوئے ہیں کبھی کے مہر بہ لب
چمن میں ہیں خس و خاشاک گفتگو کے لیے

بغیر بانگِ جرس ، بے مقام و بے منزل
جو رہ گزر پہ رواں ہے وہ کارواں کوئی ہے!

اِس شہرِ پُرہجوم کی سمتیں ہی کھو گئیں
ہر شخص سوچتا ہے کدھر جانا چاہیے؟

سحر انصاری نے یہ سوال ہم آپ سے بھی کیا ہے اور خدا کے سامنے بھی اُٹھایا ہے۔ آیئے سلاطین و ملوک اور صوفی و مُلّا کے ارشادات کو ایک طرف رکھ کے براہِ راست اللہ میاں سے ہدایت حاصل کریں اور پھر اُس کی دکھائی ہوئی سمت میں گامزن ہو جائیں۔

''کامیابی کی کنجی''

جس معاشرے میں تعلیم یافتہ غریب ہو اور جرائم پیشہ لوگ امیر ہوں۔ اس معاشرے میں نئی نسل کو قائل نہیں کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم کامیابی کی کنجی ہے۔
(رابرٹ موگابے)

دوسرا درویش

سلیم یزدانی

(●)

ہیلو— ہیلو— ہیلو
کھٹ کھٹ کھڑک کھڑک
کچھ عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں۔
ایک دفعہ پھر موبائل کے بٹن دبائے، نمبر ملایا۔
ہیلو— ہیلو— (ریکارڈنگ) صارف دوسری لائن پر مصروف ہے، انتظار کریں۔

ایسا کئی بار ہوا۔ لگتا ہے، اُن کو انتظار کروانے کی بڑی عادت ہے۔ اُن کے اور میرے مشترک عزیز دوست ہیں مبین مرزا، میں نے اُن سے کہا، ''بھئی یہ آج کل عجیب ہو رہا ہے کہ سحر انصاری کو جب فون کرو وہ دوسری لائن پر مصروف ہوتے ہیں۔''

انھوں نے کہا، ''وہ تیسری لائن پر بھی مصروف ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ اب تین سم والے موبائل بھی ملنے لگے ہیں۔''

میں نے کہا کہ ''سحر انصاری سے دریافت کرنا چاہیے کہ انھوں نے دوسری سم کی اجازت بھی لی ہے یا نہیں— بے چارہ شاعر آدمی ہے، کہیں مفت میں شوق کی نذر نہ ہو جائے۔

سحر انصاری سے ہماری رفاقت کوئی اب کی نہیں، بلکہ یہ اُن دنوں کی ہے جب ۱۹۵۶ء میں ناظم آباد میں گورنمنٹ کالج میں تعلیم کا ڈول پڑا۔ صاحب وہ بھی کیا دور تھا۔ استاد ایک سے ایک اور شاگرد ایسے کہ اونٹ کو کالج کی چھت پر پہنچا دیا۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، غرض بڑی مشکل سے اونٹ زمین پر آیا— رسیوں میں جکڑا۔ جیسے ہی آزادی ملی ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ منظر دیدنی تھا۔ کالج کے سامنے بس اسٹاپ تھا۔ لڑکے لڑکیوں کی دوڑیں لگ گئیں، بھگدڑ مچ گئی۔ کئی ٹھیلے والے جو بس اسٹاپ پر دہی بڑے اور چھولے بیچتے تھے، اُن کے ٹھیلے روندے گئے۔

ایک ٹھیلے والا جس کی لمبی سی پتلی چگی داڑھی تھی، اس نے جو یہ منظر دیکھا تو اپنے چھولوں کا طباق خود ہی اُلٹا دیا۔ اب رو رہا ہے، میں تباہ ہو گیا، میں برباد ہو گیا۔ ایک صاحب جن کے بالکل سیدھے اور گھنے سیاہ بال تھے اور وہ اُس وقت سیاہ چشمہ لگائے ہوئے تھے، بولے، ''کتنے کے چھولے تھے؟'' وہ روتے ہوئے بولا، ''سو روپے کے ہوں گے۔'' انھوں نے کہا، ''جھوٹ بولتا ہے۔ یہ لے پچاس روپے اور دوڑ یہاں سے۔'' چھولے والے نے سامان اُٹھایا اور دوڑ لگا دی۔

''دیکھتے ہیں صاحب، کیسے شاطر لوگ ہیں یہ۔'' انھوں نے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا، جن میں، میں بھی شامل تھا۔ یہ کون صاحب تھے؟ انور مقبول انصاری جواب سحر انصاری ہیں۔ اونٹ کو چھت پر پہنچانے والوں میں ان کا بھی کچھ حصہ تھا۔

۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آیا۔ بھارت میں مسلمانوں کے خلاف اشتعال کی فضا پیدا ہو گئی۔ ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا جو بھارت میں آج تک جاری ہے۔ جو مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آئے، اُن کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ وہ سب کچھ لٹا کر آئے۔

ہم نے یہاں بڑی کس مپرسی کا وقت گزارا، لیکن اُن بُرے دنوں میں بھی ہم نے تعلیم حاصل کی۔ فضول خرچیاں کرنا تو دور کی بات ہے، بعض اوقات ضرورت کی چیزیں بھی خرید نہ پاتے تھے۔ اس لیے کہ گھر سے اتنے پیسے ہی نہ ملتے تھے۔ اس زمانے میں اپنے دوستوں کی سحر انصاری اکثر چائے سے تواضع کرتے۔ کینٹین والا چائے بسکٹ قرض بھی دے دیتا تھا، شعر وہ اپنے اسکول کے زمانے سے کہنے لگے تھے، جیسے میں اسکول کے زمانے میں افسانے لکھنے لگا تھا۔

سحر انصاری ناراض بھی جلدی ہوتے، لیکن جلد ہی مان جاتے تھے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے، کوئی اٹھاون سال ہونے کو آ رہے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں۔ اُن کی شاعری میرے سامنے پروان چڑھی۔ لگتا ہے اُن کا خمیر ہی شاعری سے اُٹھا ہے۔ جب اُن کی شاعری کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو اس کا نام انھوں نے ''نمود'' رکھا۔ اس کا گرد پوش مشہور آرٹسٹ آزر زوبی نے بنایا تھا۔ ''نمود'' میں جو شاعری تھی وہ بھی ایک بالغ نظر شاعر کے خوابوں کی مصورانہ شکل لگتی تھی۔ سحر انصاری کو بڑا شاعر اور اپنے عصر کا نمائندہ شاعر بننے کی آرزو تھی۔ لوگ جب اُس کے شعروں کی تعریف کرتے تو وہ کہتا، مجھے ابھی بہت طویل راستہ طے کرنا ہے۔ ایسی خود شناسی میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی۔ میری عظیم ماں میسیت النسا جس نے میرے لیے بڑی قربانیاں دیں، مجھے پیرزادہ محمد ظفر فریدی سے سلیم یزدانی بنایا، میرے لیے وہ لفظ تخلیق کیے جو میری تحریروں میں تاروں کی طرح چمکتے ہیں، وہ کہا کرتی تھیں کہ تمھارا یہ دوست سحر انصاری اُفقِ شہرت کو چھوئے گا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب سحر انصاری جیکب لائن میں رہا کرتا تھا اور اکثر مجھ سے ملنے میری طرف نکل آتا۔ آج میں جب اپنی ماں، جن کو میں بوا جی کہتا تھا، اُن کے لفظوں کی سچائی کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اُن کا اندازہ کتنا صحیح تھا۔

میں نے کسی شخص کو کتابوں سے اتنا عشق کرتے نہیں دیکھا جتنا سحر انصاری کو ہے۔ ایک دن اُن کی صاحب زادی عنبریں حسیب عنبر، داماد سیّد حسیب احمد، مبین مرزا اور راقم الحروف سحر انصاری کے ساتھ برنچ پر تھے کہ اُن کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے موبائل کان سے لگایا۔

''جی۔''

''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' اور وہ کھڑے ہو گئے۔

''صاحب، میری لائبریری میں آگ لگ گئی ہے۔'' انھوں نے بتایا

اور دوسرے ہی لمحے وہ ہوٹل سے باہر جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ ظاہر ہے، یہ حادثہ ہی ایسا تھا۔ اس کے بعد ہم وہاں پہنچے جہاں ایک گھر کرایے پر لے کر انھوں نے کتابوں کے ڈھیر لگا رکھے تھے اور کتابوں کی آغوش میں اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ ایک کرسی پر بہت مغموم بیٹھے تھے۔ سیکڑوں کتابیں جل کر راکھ ہوگئیں۔

بولے، ''یزدانی! شکر ہے آگ جلدی بجھالی گئی، میرے آنے سے پہلے۔ بہت کچھ جل کر خاک ہوا، بہت کچھ پھر بھی بچ رہا۔ نایاب کتابیں تھیں، اب کہاں سے ملیں گی؟'' ہونٹ کانپے اور آنسو بہہ کر ان کے گالوں پر آ گئے۔

جب ریڈیو پر سحر انصاری کا زیادہ آنا جانا شروع ہوا تو میں وہاں قدم جما چکا تھا، بہ حیثیت اسکرپٹ رائٹر۔ رفاقت اور دوستی تو گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے ہی تھی۔ اب اس کی نئی سمتوں کا تعین ہونے لگا۔ میں نے ۵۶۔۱۹۵۵ء سے ہی ریڈیو میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اب صحبتِ یاراں بڑھی تو سلیم احمد، عزیز حامد مدنی، قمر جمیل، حفیظ ہوشیار پوری، ریاض فرشوری اور انجم اعظمی کے ساتھ محفلیں جمنے لگیں۔ یہ سارے لوگ اپنی اپنی جگہ علم کے بحرِ بیکراں تھے، لیکن موضوع ادب ہی ہوتا۔

سحر انصاری بنیادی طور پر اپنی سرشت میں شاعر و ادیب ہے۔ شاید میرا یہ دعویٰ غلط نہ ہو کہ میں اُسے جتنا جانتا ہوں، کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ اُس کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، لیکن جس پہلو نے اُسے پہچان دی ہے، وہ ہے اس کی شاعری۔ انسان کی اصل نمو شکمِ مادر میں ہوتی ہے اور وہ اپنی شناخت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ سحر انصاری بھی پیدائشی شاعر ہے۔ اُس کے مزاج میں شاعرانہ رنگ رچا ہوا ہے۔ اس کی طرزِ حیات میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے۔ زندگی کے معاملات اور لوگوں سے اپنے تعلقات میں اُس کا یہی رنگ سب سے زیادہ سامنے آتا ہے۔

جب میں اور سحر انصاری گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں پڑھتے تھے تو ہماری شخصیت کے کئی پہلو اُبھر رہے تھے، لیکن سحر انصاری کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر اس کا شاعر ہونا غلبہ رکھتا تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج کی یونین کا عہدے دار بھی رہا۔ مجھے پتا ہے کہ اُس نے طلبہ کی، اپنے ساتھیوں کی بڑی خدمت کی، لیکن اس نے کبھی سیاسی نعرے نہیں لگائے۔ وہ سیاست کو اپنے آپ سے بغاوت سمجھتا تھا اور شعر گوئی کو اپنے رب کی عطا سمجھتا تھا۔ اُس نے اپنے رب کی عطا کو سر جھکا کر قبول کیا اور آج اسی عطا کی بہ دولت وہ اپنے معاشرے میں سربلند ہے۔ لوگ اس کے علم و فضل کی قدر کرتے ہیں اور اُس کے شاعرانہ مرتبے کو تسلیم کرتے ہیں اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

سحر انصاری کا ایک وہ دور بھی تھا کہ گھر تنگ، گلی بند، نہ روشنی، نہ ہوا۔ امتحان سر پر، سو مجبور کیا نہ کرتا، دوستوں سے مشورہ کیا اور قریب ہی ایک مسجد میں جا ڈیرا جمایا۔ پہلے تو خیال تھا کہ مسجد کا مولوی یا مؤذن انھیں کاہے کو قرار سے بیٹھ کر پڑھنے دے گا، لیکن وہ دو تین لڑکوں کو خاموشی سے پڑھتا دیکھ کر کچھ نہ کہتا۔

سحر انصاری کی زندگی کے کئی دور ہیں جو مراد آباد، اورنگ آباد سے ہوتے ہوئے پاکستان پہنچتے ہیں۔ سحر انصاری کراچی میں وارد ہوئے تو میٹرک انھوں نے کوتوال بلڈنگ کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے کیا۔ اعلیٰ تعلیم کراچی یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ برٹش کونسل میں بھی ملازمت کی، بعد ازاں تعلیم کے شعبے سے منسلک ہوگئے۔ آج اُن کی حیثیت استاذ الاساتذہ کی ہے۔

جب آپ اُن کے ساتھ کسی محفل میں ہوں گے تو پتا چلے گا کہ کیسی کیسی عمر رسیدہ خواتین یکے بعد دیگرے آتی ہیں، سر جھکاتی ہیں اور ''سر'' اُن کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہیں۔ کئی اُن کے پرانے شاگرد اُن کے گھٹنے چھوتے ہیں جواب خود پروفیسر ہیں۔ سحر انصاری اب بھی دستِ شفقت ان کے سروں پر پھیرتے ہیں۔ کتنا بڑا سچ ہے جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ علم باعثِ عزت و احترام ہے۔

میں نے اپنی سرگزشت ''منتظر راہیں'' اشاعت سے پہلے انھیں دی اور فرمائش کی کہ پوری کتاب لفظاً لفظاً پڑھنی ہے اور اس کے بارے میں رائے دینی ہے کہ ٹھیک ہے، کتاب چھاپ دی جائے؟ اب اُن کا یہ عالم تھا کہ پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ کہنے لگے، ''یار بھائی — تیرے قلم میں زور اور دل زدگی قدرت کا عطیہ ہے۔ یہ تیری سرگزشت کا ہے کو ہے، ایک جہاں کا قصہ ہے۔'' پھر بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ کر میری نذر کی جو پیشِ خدمت ہے۔

زخمِ پنہاں کی طرح دل میں اُتاری ہوئی ہے
یہ جو رات آئی ہے، یہ رات گزاری ہوئی ہے
چند قصے ہیں جنھیں زیست کہا ہے ہم نے
داستاں یاد کسے ساری کی ساری ہوئی ہے
ذکرِ آسائشِ جاں خاک نشینوں سے نہ کر
بادِ صرصر بھی کہیں بادِ بہاری ہوئی ہے
شکوۂ جورِ فلک کر کے بھی کیا مل جاتا
یاں تو ہر حال میں بس شکر گزاری ہوئی ہے
کبھی سوچا ہے کہ اس شام کے ڈھل جانے کے بعد
کس کی ہوگی یہی دُنیا جو تمھاری ہوئی ہے
اُس کا احوال بیاں کرنے کو الفاظ کہاں
ایک کیفیتِ بے نام جو طاری ہوئی ہے
کاش دُنیا بھی اسی طرح سنور جائے کبھی
اُس نے جس طرح سحرؔ زلف سنواری ہوئی ہے

یارِ عزیز سلیم یزدانی کے لیے
۲۷ر دسمبر ۲۰۱۳ء
سحر انصاری

سحر انصاری میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی یادداشت بڑے کمال کی ہے۔ گویا کہ موصوف نے جو پڑھ لیا اور جو دیکھ لیا، جانیے کہ وہ محفوظ ہوگیا۔ طالبِ علمی کے اُس دور سے اور آج بھی اُن کی یادداشت ویسی ہی ہے۔ یوں سمجھیے کہ سحر انصاری کی یادداشت ایک ہاتھی کی یادداشت ہے۔ ہمارے ایک ٹیچر تھے، شمشاد صاحب جو ہمیں کیمسٹری پڑھاتے تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ انور

(سحر انصاری کا خاندانی نام) کی یادداشت elephant memory ہے۔ میں نے ایسا لڑکا نہیں دیکھا۔

ہم تین دوست ہیں، میں، مبین مرزا اور سحر انصاری۔ یادداشت تو میری بھی بری نہیں ہے، لیکن زبردست یادداشت مبین مرزا اور سحر انصاری کی ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ مبین مرزا کے ذہن میں کلبلاہٹ ہوئی اور انھوں نے ایک مصرع پڑھ دیا اور اُس کی تکمیل سحر انصاری نے کر دی یا کسی واقعے کا ذکر مبین مرزا نے شروع کیا اور آگے کی پوری کی پوری کہانی سحر انصاری نے بیان کر دی۔

سحر انصاری سائنس کے طالب علم تھے، لیکن انھوں نے سائنس چھوڑ یونی ورسٹی میں آرٹس کے شعبے میں داخلہ لیا۔ سحر انصاری کا مزاج اور طبیعت کبھی بھی مکینکل نوعیت کی نہیں تھی۔ وہ شروع سے تخیلات کی دُنیا کا باسی تھا۔ شعر و شاعری سے بھی شغف تھا، یہی شغف آگے چل کر زندگی کی راہوں کو متعین کرنے کا ذریعہ بنا۔ آج سحر انصاری جس مقام پر ہے، وہ اُس کے اپنے اور اہلِ خانہ کے لیے ہی نہیں، اس دوستوں کے لیے بھی قابلِ فخر ہے۔

میں نے جب اپنی آپ بیتی ''منتظر راہیں'' لکھنا شروع کی تو اُن دونوں کو پڑھ کر سناتا تھا۔ ہم تینوں ہم سفر دوست جنھیں میں تین درویش کہتا ہوں، مہینے کے آخری اتوار کو پُرتکلف برنچ پر یک جا ہوتے ہیں اور برسوں سے یہ روایت زندہ ہے۔ ان حضرات کو سرگزشت سنانے کا بڑا مقصد یہی تھا کہ واقعات کی صحت میں سقم نہ رہ جائے۔ درحقیقت شاید میں اپنی سرگزشت لکھنے کی کبھی نہ سوچتا، لیکن میرے یہ دوست مجھے بار بار اس طرف مائل کرتے رہے۔

سحر انصاری میری کالم نگاری کے بھی مداح ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمھارے اندر ایک بائیوگرافر چھپا ہوا ہے، اس کو باہر نکالو، تم بہت سی اہم اور کام کی باتیں لکھ کر چھوڑ جاؤ گے جو تاریخ کا حصہ بن جائیں گی۔ جب میرا کالم چھپتا تو وہ مجھے فون کرتے یا ملاقات ہونے پر اُسے discuss کرتے اور مجھے یادداشتیں لکھنے کی تحریک دیتے۔ اپنے ان دوستوں کی تحریک پر میں نے یہ کام کیا۔

میں، سحر انصاری اور مبین مرزا مخلص دوست ہیں۔ اخلاص کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ ہماری محبتوں کا سلسلہ کئی عشروں پر محیط ہے۔ ۲۰ ستمبر ۲۰۱۴ء کو میں اور سحر انصاری، مبین مرزا کے دفتر میں تھے اور مبین مرزا کی میزبانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ سحر انصاری نے کہا، ''سلیم یزدانی تمھاری دوستی یہی کوئی اٹھاون سال کی ہے اور مبین مرزا سے دوستی پچیس سال سے زیادہ کی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی غیبی قوت ہے جس نے ہمیں جوڑ رکھا ہے۔ ہم ایک دوسرے کا بھلا سوچنے والے اور اخلاص سے پیش آنے والی روحیں ہیں، جنھیں روزِ اوّل ایک ہی وقت اور ایک ہی گروہ میں پیدا کیا گیا تھا۔''

سحر انصاری کی کیفیت تو یہ ہے کہ اگر چار دن ملاقات نہ ہو تو بُرا مانتے ہیں اور کہتے ہیں:

''یار تم عجیب شخص ہو کہ جب غائب ہوتے ہو تو اتا پتا ہی نہیں ملتا۔ یہ کیا طریقہ ہے تمھارا؟ بس آج ملاقات ہونی چاہیے۔ اور وہ مرزا صاحب، وہ بھی غائب ہیں۔ نہ فون پر بات ہوئی اور نہ ملاقات کی کوئی صورت نکلی۔ مرزا صاحب کو میں بھی فون کرتا ہوں آپ بھی تلاش کریں اور جیسے ہی رابطہ ہو، بس ملنے کا طے کر کے اُن کے دفتر پہنچ جایئے۔ کھانا ہم دونوں اُن کے ساتھ ہی کھائیں گے۔''

لیجیے، اب ہم دونوں مبین مرزا سے رابطے کی کوشش میں لگ گئے۔ جلد ہی یہ کوشش کامیاب ہوگئی۔ مرزا صاحب سے کہا گیا کہ ہم دونوں دفتر آ رہے ہیں اور کھانا آپ کے ساتھ ہی کھائیں گے۔ انھوں نے خوش دلی سے جلد پہنچنے کی تاکید کی اور تھوڑی دیر میں ہم دونوں اُن کے کمرے میں ہیں۔ پہلے کھانے کا مینو طے ہوگا۔ آفس کا لڑکا کھانے کے بندوبست کے لیے روانہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس دوران کیا کیا گیا ہے، کیا نیا پڑھا گیا ہے، کیا لکھا گیا ہے؟ یہ سب باتیں ہوں گی۔ ادب کے ساتھ سیاست پر، عالمی صورتِ حال پر، کراچی کے حالات پر تبادلۂ خیال ہوگا۔ یہی نہیں اور بھی دنیا جہان کے موضوعات گفتگو میں شامل ہوتے رہیں گے۔ اس طرح گھنٹوں گزر جائیں گے، لیکن وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوگا۔ یہ ہمارا تقریباً ہر ہفتے کا معمول ہے۔ بعض اوقات ایسا ہفتے میں دو بار بھی ہو جاتا ہے، لیکن نہ تو باتیں ختم ہوتی ہیں اور نہ ہی اُکتاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا پُرخلوص دوستی کی وجہ سے ہے۔ ہم تینوں کے دل آپس میں قدرت نے جوڑے ہوئے ہیں، اس لیے اتنے عرصے سے مل رہے ہیں اور ہر بار ملنے کی لگن اسی طرح محسوس ہوتی ہے۔ اس مادّی دور میں کہ جب لوگ کسی منفعت یا مقصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور اسی وجہ سے آپس میں تعلق رکھتے ہیں، ہم تینوں کی یہ دوستی کسی اور ہی دنیا کی چیز لگتی ہے۔

وہ شخص کبھی مہذب نہیں ہو سکتا جس کو لفظوں کا ادراک نہ ہو۔ لفظوں کا ادراک ہی انسان کو عظمت اور بلندی سے ہم کنار کرتا ہے۔ سحر انصاری نے ساری زندگی اپنے لوگوں میں تہذیب اور علم کے بیج بونے میں صرف کر دی۔ جب وہ کالج کی یونین کا عہدہ دار تھا، اُس نے غریب لڑکوں کی تعلیمی فیس معاف کرانے کا مشن لے رکھا تھا۔ اُس نے کالج میں لینڈنگ لائبریری قائم کرائی تاکہ علم سے شناسائی بڑھے۔ لفظوں کے ادراک کا شعور پیدا ہو۔ یہ عمل نئی تاریخ کو جنم دے سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایک بات کہتا ہے کہ ہمیں خاندانِ انسانیت کی بلاتفریقِ مذہب و ملت خدمت کرنا چاہیے۔ ہمیں علم پھیلانا چاہیے اور علم حاصل کرنا چاہیے کہ ہمارا دین یہی سبق دیتا ہے۔

میں وہ مسافرِ دشتِ غمِ محبت ہوں
جو گھر پہنچ کے بھی سوچے کہ گھر نہیں آیا

سحر انصاری آج بھی یہ کہتا ہے اور کل بھی یہی کہتا تھا کہ اگر میں دوبارہ بھی اس دنیا میں بھیجا جاؤں تو میں وہی بننا چاہوں گا جو آج ہوں۔ میں ہمیشہ اس سے ایک بات کہتا ہوں کہ تم مرو گے تو دوبارہ آنے کا سوال ہوگا۔ تمھیں

احساس نہیں ہے، سحر انصاری کہ تم موسم کی رُتوں میں، وقت کی آواز کی صورت گری میں، خیال کے جوہر میں امکان کی شکل اختیار کر گئے ہو۔

اک شرارِ گرفتہ رنگ ہوں میں
پھول سے لے کے تا بہ سنگ ہوں میں

جب گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں سحر انصاری سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو شروع دن ہی سے وہ مجھے ایک پراسرار سا آدمی لگا۔ پہلی ہی ملاقات میں ایسا لگا کہ یہ بہت مہذب، مرنجاں مرنج، سادہ طبیعت اور سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں والا شخص دل میں اترنے کے لیے سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہ شروع ہی سے دوسروں سے مختلف تھا۔ شیروانی اور علی گڑھ ٹائپ پاجامے میں وہ عمر میں بڑا بھی لگتا اور قدرے سنجیدہ بھی۔ سحر انصاری پہلے بھی ہر کس و ناکس کو شعر نہیں سنایا کرتا تھا، جس سے روز کا میل ملاپ بڑھ جاتا اور دل چاہتا تو اُسے شعر سنا دیتا۔ جب ملاقاتیں بڑھیں تو شرمیلا سا محتاط رویے والا شاعر ذرا کھل گیا۔

کبھی یہ زعم کہ خود آ گیا تو مل لیں گے
کبھی یہ فکر کہ وہ کیوں اِدھر نہیں آیا

یہ سحر کے اندر انا کا پیکر ہے۔ اس شعر میں سحر انصاری کا پورا سفرِ زیست چھپا ہوا ہے۔ وہ انھی رویوں کا شاعر ہے، انھی سوچوں کا آدمی ہے۔ جس میں ذرا سی بھی حمیت ہو، عزت ہو اور اپنے ہونے کا احساس ہو، وہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا میں نے غلط بات کہہ دی؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرا یہ کہنا غلط ہے تو آپ کو ایسا سمجھنے کا حق ہے۔ اس جمہوری دور میں آپ جو چاہیں سمجھیں اور اُس کا اظہار کریں۔ ایک بات میں آپ کو بتاتا چلوں، جھوٹی بات بھی غلط نہیں ہوتی۔ اس کے بھی سر پیر ہوتے ہیں اور یہ تو ایک بڑی سچائی ہے، جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔

سحر انصاری اور کتابوں کا ساتھ ہمیشہ سے ایسا ہے، جیسے شریکِ سفر کا ساتھ اور وہ بھی کیا، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ ہر رشتے سے زیادہ مضبوط رشتہ اس کا کتابوں سے ہے۔ آج بھی یہی حالت ہے، اس کی زندگی کتابوں سے ہے۔ اس کی ساری مستعدی اور متحرک ہونے کا راز اس علم کے خزانے میں ہے جو اس کے دماغ کے گوشوں سے اُبل رہا ہے۔ سحر انصاری اپنے حلقۂ احباب، دوستوں اور چاہنے والوں کی جان تو ہے ہی، لیکن ساتھ میں وہ علم دوست اور قدر شناسوں کی آنکھ کا تارا بھی ہے۔ اس میں بوڑھے اور جوان کی، مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے، بلکہ خواتین میں اس کی مقبولیت عروج پر ہے۔ خواہ وہ بوڑھی ہی کیوں نہ ہوں۔

سحر انصاری کو شعر کہتے، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساٹھ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں اور ان کی شاعری کی چنگاری وقت کے ساتھ زیادہ روشن ہو رہی ہے، وہ ماند نہیں پڑی۔ اگر کوٹھوں چڑھ جاتی تو شعلہ سا لپک جاتا۔ یہ نہیں کہ سحر انصاری کی شاعری گائی نہیں جا سکتی۔ ان کی غزلوں میں غنائیت بھی ہے اور وہ لوازمہ بھی ہے جو مغنیوں کی شناخت بن کر شاعر کو مقبولیت کا تاج پہنا دیتا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ اس سلسلے میں سحر انصاری کی پی آر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس نے کبھی کسی مغنی کو اپنا دم ساز نہیں بنایا، نہ کسی ریڈیو اور ٹیلی وژن کے پروڈیوسر کو کینڈل ڈنر پر مدعو کیا اور نہ اسے اپنی غزلیں سنائیں کہ شاید نمک خواری کا احساس کر کے ہی اسے خیال آ جاتا کہ سحر کی غزلوں کا جادو بھی غلام علی کے گلے میں رس گھول سکتا ہے۔

اصل میں سحر انصاری اپنی ایک خاص ڈھب کا آدمی ہے۔ اُس نے ایک خاص ڈھب کی زندگی گزاری ہے۔ یہ نہیں کہ اُس نے دوست نہیں بنائے۔ دوست بھی بنائے، لوگوں سے علیک سلیک بھی رکھی، لیکن اُس نے کبھی جوڑ توڑ والی اور مالی منفعت والی زندگی کو اپنا مطمعِ نظر نہیں بنایا۔ اگر وہ چاہتا تو اہلِ اقتدار اور اہلِ ثروت سے مراسم بڑھاتا۔ لوگ اُسے اپنی تقریبات میں بلاتے ہیں، لیکن وہ ان سے کوئی فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کی طبیعت میں ایک درویشی ہے جو اُسے اپنی مستی میں رکھتی ہے۔ وہ دنیا میں رہتا ہے اور دنیا کو برتنا بھی جانتا ہے، لیکن لوگوں سے قریب ہو کر فائدہ اُٹھانا اسے نہیں آتا۔ زندگی جو کچھ خود اس جھولی میں لا کر ڈال دیتی ہے، وہ اسی کو قبول کرتا ہے اور اسی پر خوش ہو جاتا ہے۔

پیدا کہاں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ

پارکنگ

برطانیہ کے عرب پتی مسٹر سنگھ لندن کے ایک بنک میں گئے اور اُن سے پانچ ہزار پاؤنڈ کا قرضہ طلب کیا۔ بنک آفیسر نے مسٹر سنگھ سے کہا کہ قرضے کے بدلے میں آپ کیا ضمانت دینا پسند کریں گے؟ مسٹر سنگھ نے بنک آفیسر کے سوال کے جواب میں اپنی نئی چم چماتی رولز رائز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گاڑی کے کاغذات بنک آفیسر کے سامنے رکھ دیے۔ ضابطے کی کارروائی کے بعد بنک کے عملے نے مسٹر سنگھ کی گاڑی کو بنک کے انڈر گراؤنڈ گیراج میں پارک کر کے مسٹر سنگھ کو پانچ ہزار پاؤنڈ ادا کر دیے۔ بنک کا ڈرائیور ہر روز صبح اس گاڑی کو انڈر گراؤنڈ گیراج سے نکال کر باہر پارک کرتا اور شام کو پھر گیراج میں لے جاتا۔ پندرہ روز کے بعد مسٹر سنگھ پانچ ہزار پاؤنڈ کے قرضہ چکانے آئے تو انہیں اس قرضے پر 15.41 پاؤنڈ کا سود ادا کرنا پڑا۔ جب مسٹر سنگھ بنک آفیسر سے اپنی گاڑی کے کاغذات لے کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگے تو بنک آفیسر مسٹر سنگھ سے یوں گویا ہوا:

''سر آپ جیسے امیر ترین شخص کو پانچ ہزار پاؤنڈ کی حقیر رقم کا قرض لینے کی ضرورت کیوں آن پڑی''

مسٹر سنگھ نے سگھار کا دھواں منہ سے خارج کرتے ہوئے کہا:

''میں نے پندرہ دن کے لیے شہر سے باہر جانا تھا اور لندن جیسے شہر میں اتنی سستی پارکنگ کا دستیاب ہونا ممکن نہ تھا۔''

سحر بھائی

مظہر جمیل
(کراچی)

پروفیسر سحر انصاری کو ہم تو زندگی بھر ''سحر بھائی'' ہی کہہ کر بلاتے رہے اور وہ بھی ''جی بھائی'' کے ساتھ خیر مقدم کرتے رہے ہیں اور ایک ہم ہی کیا ہیں انھیں تو شہر کا شہر ہی سحر بھائی کہہ کر خطاب کرتا ہے۔ اس سلسلے میں نہ تو خورد و کلاں کی قید ہے اور نہ تذکیر و تانیث کی پابندی ماسوا ان خواتین کے جو بوجوہ کسی اور طرح پکارنا چاہتی ہوں۔ یقین سے تو نہیں کہتے، لیکن قیاس یہی ہے کہ لگ بھگ پچاس باون برس اُدھر جب رسم و راہ کی صورت پیدا ہوئی ہوگی تو اس وقت بھی ہم نے ان سے حفظِ مراتب کا یہی قرینہ برتا ہوگا کہ عمروں میں بہت زیادہ تفاوت نہ ہونے کے باوجود ہم نے شاید ہی کبھی انھیں براہِ راست نام لے کر مخاطب کرنے کی جسارت کی ہو۔ حالاں کہ سوانحی کوائف کے مطابق ہمیں چند سالہ بزرگی کی شرم ساری مقدر ہوئی ہے کہ ہماری پیدائش مارچ ۱۹۳۶ء کی ہے جب کہ سحر بھائی کی ولادت دسمبر ۱۹۴۱ء ہے۔

سحر انصاری جن کا اصل نام انور مقبول انصاری ہے، اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے لیکن اورنگ آباد ان کا آبائی شہر نہیں ہے، ددھیال کا تعلق مراد آباد اور ننھیال کا واسطہ میرٹھ سے رہا ہے۔ ان کے والد مقبول احمد چشتی مراد آباد میں مدرس تھے، لیکن بعد میں اورنگ آباد میں جا بسے تھے۔ جہاں حکومتِ آصفیہ حیدرآباد دکن نے انھیں مہتممِ خزانہ کی آسامی پیش کی تھی۔ ان کے نانا سراب میرٹھی اور دوسرے ننھیالی بزرگ اسماعیل میرٹھی اپنے عہد کے نہایت اہم اور معروف شاعر تھے۔ ان کے برادرِ بزرگ اخلاق احمد انصاری کو بھی شعر و ادب کے معاملات سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اورنگ آباد کالج میگزین ''نورس'' کے مدیرِ اعلیٰ بھی رہے تھے۔ ایک ماموں اسلام الحق قریشی کئی کتابوں کے مصنف تھے جب کہ بہنوئی کو لغت نویسی میں خصوصی شہرت حاصل ہوئی تھی، چناں چہ ان کی ابتدائی تربیت ہی ایک نہایت علم دوست گھرانے اور ادبی ماحول میں ہوئی۔

ساتویں جماعت تک کی تعلیم انھوں نے اورنگ آباد ہی میں مکمل کر لی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں والدین کے ساتھ کراچی منتقل ہونے کے بعد بہادر آباد کے مقبولِ عام اسکول کی آٹھویں کلاس میں داخل کیے گئے تھے۔ میٹرک بھی اسی اسکول سے ۱۹۵۴ء میں پاس کیا۔

لڑکپن کی بابت وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن گمان یہی ہے کہ بچپن میں انھیں نہ تو جھاڑ بندر، کبڈی اور اُچھل پھاند جیسے کھیلوں سے کبھی دل چسپی رہی ہوگی اور نہ پتنگ بازی، لٹو اور کنچے کھیلنے کا ہنر آیا ہوگا۔ ہاں ناندیڑ میں گزرے ہوئے بچپن کو وہ اکثر بڑی شدت سے یاد کیا کرتے ہیں، جہاں ان کے والد بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ خاص طور پر گھر کے پڑوس میں بہتی صاف ستھری جھلملاتی ندی ان کی کشت یاد کو اب بھی سیراب رکھتی ہے۔ پانی کی تہہ میں بکھری ہوئی سفید سفید سیپیاں، رنگ برنگی مچھلیاں اور لال لال بیر بہوٹیوں کے منظر وہ نہیں بھول پائے ہیں۔ انھیں خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ندی کے دوسرے کنارے پر خربوزوں، تربوزوں، ککڑیوں اور پھوٹ کی کاشت ہوتی تھی، جس سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ اور ان کے بعض ہم جولی پایاب ندی میں ہی تیراکی کے جوہر دکھاتے تھے اور دوسرے کنارے پر لگے کھیتوں سے لطف اُٹھاتے۔ مار دھاڑ، چھینا جھپٹی اور لپاڈگی جیسی معصوم شرارتوں کی توفیق انھیں اس دور میں بھی نہ ہو پائی تھی کہ ان کے گھریلو ماحول میں یہ سب باتیں نسبتاً غیر شریفانہ سمجھی جاتی تھیں جن سے ایک پڑھاکو اور شریف بچے کو دُور رکھنے کا اہتمام ضرور کیا جاتا تھا۔ نوعمری کی چاک گریبانی نہ سہی لیکن بعض مخصوص قسم کی دل چسپیاں تو کم و بیش ہر نوجوان کا حق ہوا کرتا ہے جن سے فطرتاً گریز کی صورت کم کم ہی نکل پاتی ہے۔ تاہم ڈسپلن کے شیدائی گھرانوں میں تو خود فطرت کو فطری انداز میں پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں ہوا کرتی۔ چناں چہ جو طور طریقے بچپن میں سکھا دیے جاتے ہیں وہ بچوں کی فطری شخصیت کا جزو بن کر زندگی بھر ساتھ چلا کرتے ہیں اور اگر ان میں کبھی تبدیلی لانے کی خواہش یا کوشش ہوتی بھی ہے تو نہایت آہستہ خرامی کے ساتھ۔ بچپن کے تعلق سے ناندیڑ ہی کے زمانے کے ایک سکھ دوست اور ہندو ٹیچر جگن ناتھ جی کی یادیں ان کے حافظے میں اب بھی محفوظ ہیں جو انھیں اسکول میں ڈرائنگ اور آرٹ سکھایا کرتے تھے۔ چناں چہ آرٹ کے سبجیکٹ سے جو گونا گوں دل چسپی عمر بھر رہی ہے وہ اسی زمانے کی دین ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر میں ادیب نہ ہوتا تو آرٹسٹ ضرور ہوتا۔ آرٹ سے اس غیر معمولی شغف کو وہ اپنے استاد جگن ناتھ جی ہی سے منسوب کرتے ہیں۔

ہمیں یاد ہے کہ ۱۹۴۹ء کے اوائل میں جب ہم حیدرآباد دکن سے ہجرت کر کے براستہ بمبئی کراچی وارد ہوئے تھے، اپنے اس پہلے مستقر یعنی کراچی شہر سے ہماری جان پہچان سرسری سی ہی ہوئی تھی کہ چند ماہ قیام کے بعد ہمارا خاندان سکھر شفٹ ہو گیا تھا، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اس زمانے میں بھی کراچی ایک طلسماتی شہر تھا۔ صاف ستھرا، کشادہ اور پرسکون۔ ابتدائی دنوں کی خوب صورت جھلکیوں سے قطع نظر، شہرِ کراچی سے ہماری تفصیلی صاحب سلامت مارچ ۱۹۵۳ء میں ہوئی تھی جب ہم بالائی سندھ (یعنی سکھر، گھوٹکی، پنو عاقل، روہڑی، شکارپور اور خیرپور وغیرہ) کے طلبہ کے وفد کے ساتھ کل پاکستان ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس کنونشن میں شریک ہونے آئے تھے۔ یہ پاکستان میں طلبہ تنظیموں کا سب سے پہلا منظم اور انقلابی اجتماع تھا جس میں نہ صرف سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان، بہاول پور، خیرپور کے چھوٹے بڑے شہروں کے وفود شریک ہوئے تھے، بلکہ مشرقی پاکستان کے طالب علموں کے نمائندوں نے بھی شرکت کی تھی۔ ہندوستان سے عالیہ امام جو ابھی ڈاکٹر نہ ہوئی تھیں بطورِ آبزرور شریک ہوئی تھیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لوح و قلم کے گرد نو عمر لکھنے والوں کا جو ایک دائرہ بن گیا تھا اس میں سحر بھائی نہایت فعال اور نمایاں رہے۔ اس ملک

گیر اسٹوڈنٹ کنونیشن اور تحریک کا مقصد اور مطالبہ تو صرف یہی تھا کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں تعلیم کے فروغ کو ملک کے دوسرے تمام مسائل پر فوقیت دی جائے اور حکومت ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ اور ٹیکنیکل تعلیم تک مفت فراہمی کی ذمہ داری قبول کرے، ملک کے طول وعرض میں ہر سطح پر زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں، تعلیم بالغان کے شعبے کو جدید خطوط پر منظم کیا جائے اور پورے ملک میں یکساں نصابِ تعلیم رائج کیا جائے وغیرہ۔ ظاہر ہے اس قسم کے مطالبوں کو پوری قوم ہی کی حمایت حاصل تھی، لیکن نوکر شاہی پر تکیہ کرنے والی حکومتِ وقت نے بدقسمتی سے طلبہ کی ان سرگرمیوں کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اُسے روکنے کے لیے تادیبی اقدامات کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حکومت نے کنونیشن کے انعقاد پر تو کوئی پابندی عائد نہ کی، لیکن شہر بھر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی تھی۔ سرکاری تعلیمی اداروں کے طلبہ اور اساتذہ پر کنونیشن میں شرکت کے خلاف غیر ضروری پابندیاں لگا دی گئیں اور ایک دو کالجوں میں تو طلبہ کو ہراساں کرنے کے لیے لاٹھی چارج تک کرنے سے گریز نہ کیا گیا۔ ان حکومتی اقدامات نے نہ صرف کراچی بلکہ پورے ملک میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ چناں چہ کنونیشن کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر لاٹھی چارج، ہوائی فائرنگ اور قید و بند کی کارروائیاں عمل میں آئیں لیکن ان تمام تادیبی اقدامات کے باوجود طلبہ کی نمائندہ تنظیموں کے اجلاس ایک تعلیمی ادارے کی چار دیواری کے اندر مسلسل تین دن تک جاری رہے اور اس کے اختتام پر ایک نئی طلبہ تنظیم کا قیام عمل میں آیا جس کا نام کل پاکستان اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (APSO) تھا، جس نے ملک گیر تعلیمی اصلاحات کو اپنے منشور کا بنیادی مقصد اور نکتہ قرار دیا تھا۔ اُس زمانے میں ہم ہائی اسکول اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے رکن تھے اور اسی پلیٹ فارم سے طلبہ کی سرگرمیوں میں شریک رہے۔ مذکورہ کنونیشن میں شرکت نے جہاں ہمیں ہمارے شعور و ادراک کو روشنی بخشی، وہیں ملک کے دوسرے حصوں سے آنے والے وفود سے رسم و راہ کے مواقع بھی فراہم کیے۔ کراچی کے بے شمار پرجوش طالب علم رہنماؤں اور ساتھیوں سے ذاتی دوستیاں بھی قائم ہوگئی تھیں جن میں سے اکثر آج بھی جاری ہیں۔ بعد میں یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ انور مقبول انصاری بھی اپنے اسکول یونٹ کے ساتھ مذکورہ کنونیشن میں شریک ہوئے تھے، بلکہ لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے تماشے بھی دیکھے تھے کہ اس زمانے میں ان کی رہائش جلسہ گاہ یعنی کرک ہال کے عین عقب میں واقع تھی۔ گویا ان سے ہماری ذہنی مطابقت کی یہ پہلی نوید تھی۔ وہ بھی مذکورہ کنونیشن کو اپنی زندگی میں لینڈ مارک کی سی اہمیت دیتے ہیں۔

وہ طلبہ کی غیر نصابی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے، مگر ایسے توازن کے ساتھ جو ان کی نصابی ذمہ داریوں پر کوئی مضر اثر مرتب نہ کرے۔ کالج کی سطح پر ایک مدت تک انٹر کالجیٹ باڈی (ICB) میں اپنے کالج کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ جمہوریت پسند طلبہ کے ادبی جریدے ''لوح و قلم'' سے بھی جو انور احسن صدیقی کی زیرِ ادارت جاری ہوا تھا، شروع ہی سے وابستہ رہے۔ اور اس کے کم و بیش ہر شمارے میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔

گورنمنٹ کالج ناظم آباد کی بزمِ ادب کے علاوہ مجلسِ مباحثہ کے بھی سرگرم رکن تھے۔ کالج کی ڈبیٹنگ ٹیم میں ان کے شریک ساتھی بالعموم عقیل احمد انصاری تھے جن کے ساتھ انھیں کراچی اور دوسرے کئی شہروں کے اردو مباحثوں میں قرار واقعی کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔ گورنمنٹ کالج کے دوستوں میں سلیم یزدانی سے قدیم مراسم کا سلسلہ اب بھی جاری و ساری ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مباحثوں کی چپکا چوند اور طلبہ سرگرمیوں میں ان کی دل چسپیاں کم ہوتی گئی تھیں کہ اس وقت بی ایس سی میں اعلیٰ کارکردگی ہی ان کا منصبِ اوّلین ٹھہرا تھا۔ ان کے لیے تحصیلِ علم کا معاملہ ایک مستقل راہ نوردی سے عبارت تھا جس میں کسی شارٹ کٹ کی گنجائش نہیں ہوتی کہ ان کے گھرانے کی ریت اور روایت بھی یہی رہی ہے۔

بی ایس سی میں سحر انصاری کے اختیاری مضامین میں فزکس، کیمسٹری، میتھمیٹکس اور نفسیات جیسے مضامین شامل تھے، جن سے (غلط یا صحیح) شاعروں اور ادیبوں کا واسطہ ذرا کم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ذوقِ مطالعہ کی میراث زندگی کے ہر مرحلے میں ان کی شخصیت کے بنیادی جوہر میں شامل رہی ہے۔ ایک طرف سائنسی مضامین سے بے پناہ شغف تھا، تو دوسری طرف ان گنت موضوعات ان کے ذوقِ مطالعہ کو سیراب کرتے تھے۔ اور وہ ہمیشہ ادبیاتِ عالم، تاریخِ اقوامِ جہاں، منطق و فلسفہ، نظریۂ ارتقا، معاشیات، سماجیات، بشریات، لسانیات اور مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور مذاہب کے درمیان شکست و ریخت کے موضوعات پر دستیاب تازہ ترین کتابوں اور اطلاعات کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ یوں بھی ذوقِ مطالعہ کو اگر ذہانت کی کمک حاصل ہو جائے تو تخلیقی جوہر بھی نمود و نمائش کے کرشمے دکھانے لگتا ہے۔ چناں چہ کالج میں آتے آتے سحر انصاری کی ادبی و شعری کاوشیں رنگ لانے لگی تھیں اور انھیں کراچی کے اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کے نمائندہ سرخیلوں میں شمار کیا جانے لگا تھا۔

چناں چہ ۱۹۵۸ء میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل کرنے تک سحر انصاری کراچی کے تعلیمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں مکمل طور پر جذب ہو چکے تھے اور جہاں وہ ایک سیریس پڑھا کو طالب علم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے وہیں طلبہ سرگرمیوں میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔

گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے بی ایس سی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انھوں نے پوسٹ گریجویشن کے لیے سب سے پہلے انگریزی ادبیات کا انتخاب کیا تھا۔ حالاں کہ مروجہ طریقوں اور سہولت کے مطابق یا تو انھیں ایم ایس سی میں داخلہ لینا چاہیے تھا یا آرٹس کے نسبتاً کسی آسان مضمون کو منتخب کرتے۔ اس زمانے میں سول سروس کے مقابلے میں شریک ہونے کے رُجحان کو بھی خاصی مقبولیت حاصل تھی کہ اس میں صاحب بہادری کا رعب و دبدبہ، اختیار اور اسٹیٹس کی اپنی چمک دمک ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب باتیں نہ تو اس وقت سحر انصاری کے پیشِ نظر تھیں اور نہ اس کے بعد کبھی قابلِ توجہ ٹھہریں۔ کیوں کہ وہ تحصیلِ علم کے معاملے کو محض حصولِ رزق کا معاملہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ علم و آگہی اور اکتسابِ شعور و دانش کا ذریعہ

سمجھتے تھے۔ چناں چہ انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کا فیصلہ بھی اسی اندازِ فکر کا اظہار تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انگریزی ادبیات میں ایم اے کرنے کے بعد انھیں اپنے مطالعے کی سرحدوں کو نہ صرف غیر معمولی وسعت دینی ہوگی بلکہ یورپی اقوام کے ارتقا کی تاریخ سے بھی آگاہی حاصل کرنی ہوگی جس کے بغیر مغربی فکر و دانش کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انگریزی ادبیات میں بہتر کارکردگی کے لیے پورے یورپ کے ان ذہنی رویوں اور تحریکوں کو بھی سمجھنا ہوگا جنھوں نے گزشتہ صدیوں میں مغربی فکر کو کسی نہ کسی انداز میں متاثر کیا ہے اور جن کا اظہار وہاں کی زبانوں و ادب میں بھی ہوا ہے۔ چناں چہ انگریزی زبان و ادب پر دسترس حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں یورپ کی دوسری اہم زبانوں بالخصوص فرنچ اور جرمن زبانوں کے ارتقائی عمل کو بھی سمجھنا ہوگا اور مختلف تہذیبوں اور فکری رویوں کے درمیان ہونے والی ناگزیر آمیزش اور آویزش کا مطالعہ بھی کرنا ہوگا۔ ان تمام خدشوں اور اندازوں کے باوجود انھوں نے انگریزی ادبیات میں ایم اے کی سند اعزاز کے ساتھ حاصل کی۔ انگریزی ادبیات کی ایم اے کی کلاس میں ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر پروفیسر مایا جمیل، ڈاکٹر احسن فاروقی (وغیرہ) شامل تھے جو ایک محنتی، باذوق، ذہین اور وسیع المطالعہ طالب علم کی حیثیت سے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے تھے۔ اس بزرگانہ ستائش کو وہ آج بھی اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔

انگریزی ادبیات میں ایم اے کی سند نے ان کے تحصیلِ علم کے ذوق کو مزید مہمیز کیا تھا اور مغربی فکری رویوں، ادبی رُجحانات اور تخلیقی نیرنگیوں سے مکمل آگاہی اور دسترس حاصل کر لینے کے بعد انھوں نے اُردو ادبیات میں ایم اے کی سند حاصل کرنے کا فیصلہ کیا کہ اس طرح وہ اُردو زبان اور ادب کے اپنے شوقیہ مطالعے کو منظم تدریسی سلسلے اور ضابطے میں گوندھ لینا چاہتے تھے اور اُردو ادبیات کے بنیادی ماخذات یعنی فارسی، عربی اور ہندی ادب کے تشکیلی واسطوں کو بھی سمجھنا چاہتے تھے۔ یہ بات نسبتاً غیر معمولی ہی کہی جائے گی، لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا کہ انگریزی اور اُردو ادبیات میں ایم اے کی اعلیٰ سندیں حاصل کر لینے کے بعد انھوں نے 'لسانیات' جیسے تکنیکی مضمون میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ لسانیات کے مضمون پر مکمل دسترس حاصل کیے بنا تخلیقی عمل میں سماجی رویوں اور جمالیاتی کارفرمایوں کی نزاکتوں کو سمجھنا ممکن نہیں۔ تحصیلِ علم کا یہ ماجرا دراصل اعلیٰ ترین ڈگریوں کی قطاریں سجانے کے بجائے حصولِ علم و آگہی کی داستاں سے عبارت رہا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا، بلکہ متداولہ علوم کے روز بہ روز پھیلتے ہوئے دائرے میں ہمہ وقت پھیلاؤ اور گہرائی کا سبب بنتا ہے۔ علم و آگہی کو مسلسل کھوج، تلاش اور اسکالرشپ کے منصب سے روشناس کرا دیتا ہے اور آدمی کو ساری زندگی سیکھتے رہنے کے عمل میں لگائے رکھتا ہے۔

سحر انصاری تعلیمی مراحل سے گزرنے کے بعد تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوگئے جو ان کا سب سے زیادہ پسندیدہ شعبہ رہا ہے۔ پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے متعدد تعلیمی اداروں میں انھوں نے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سطح تک تدریسی ذمہ داریاں سرانجام دی ہیں۔ اس سلسلے میں بلوچستان یونی ورسٹی، جامعہ کراچی کے شعبہ ہائے انگریزی ادبیات اور اُردو ادبیات، کورنیل یونی ورسٹی امریکا، دائتو بنکا یونی ورسٹی جاپان، یونی ورسٹی چین، جناح یونی ورسٹی برائے خواتین کراچی، وفاقی اُردو یونی ورسٹی کراچی، پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی جیسے بلند پایہ تعلیمی اداروں میں تدریسی فرائض انجام دیے ہیں۔ وہ برسوں جامعہ کراچی کے شعبہ اُردو کے صدر نشین بھی رہے ہیں۔ درس و تدریس کا یہ سلسلہ کسی نہ کسی عنوان سے کم و بیش نصف صدی سے جاری ہے اور ملک و بیرونِ ملک ان سے استفادہ کرنے والوں کی طویل فہرست میں مسلسل اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اب وہ محض ایک شاعر، ادیب اور معلم ہی نہیں ہیں بلکہ انھیں ایک ادبی و ثقافتی مفکر، نقاد اور اسکالر کا درجہ بھی حاصل ہوگیا ہے۔

تدریسی شعبے کے بعد ان کا دوسرا ترجیحی شعبہ 'صحافت' بھی رہا۔ چناں چہ جہاں طالب علمی کے دور میں انھوں نے ''لوح و قلم'' کی ترتیب و تزئین میں اہم خدمات انجام دیں، وہیں طالب علمی ہی کے زمانے میں کم و بیش ایک سال تک کراچی سے شائع ہونے والے ایک نیم سیاسی و نیم ثقافتی ہفت روزہ رسالے ''نئی جمہوریت'' کی ادارت بھی کی۔ کراچی ہی سے خود ایک ادبی جریدہ ''تمثال'' بھی نکالا تھا جو ناگزیر مالی مشکلات کے تحت چند اشاعتوں کے بعد جاری نہ رہ سکا۔ برٹش ہائی کمیشن کراچی کے شعبۂ اطلاعات میں انھوں نے کم و بیش دس برس تک (۱۹۶۰ تا ۱۹۷۰ء) بہ حیثیت افسرِ اطلاعات خدمات انجام دی ہیں جہاں وہ برٹش کونسل کے اطلاعاتی جریدے کے شعبہ ادارت میں شامل تھے۔

اس ضمن میں سحر انصاری کو صہبا لکھنوی کے ادبی ماہنامہ ''افکار'' کراچی سے جو دلی وابستگی اور قربت رہی ہے، اس کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ماہنامہ ''افکار'' واحد ادبی جریدہ ہے جو نصف صدی سے زائد مدت تک نہایت باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ سحر انصاری کالج ہی کے زمانے سے ''افکار'' کے باقاعدہ خریدار تھے اور پھر آہستہ آہستہ ان کے تعلقات ادارہ ''افکار'' سے گہرے سے گہرے ہوتے چلے گئے۔ اس مدت میں ''افکار'' نے کم و بیش چالیس بیالیس خاص نمبر اور خصوصی اشاعتیں پیش کی ہیں۔ جو اپنے مشمولات اور تزئین و ترتیب کے اعتبار سے اُردو رسائل کی تاریخ میں یادگار سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اہم خاص نمبروں کی ترتیب میں سحر انصاری نے بھی عملی طور پر صہبا لکھنوی کا ہاتھ بٹایا ہے۔ اکثر اہم شخصیات اور موضوعات پر سوانحی کوائف، بنیادی معلومات اور اسی نوع کی خصوصی تفصیلات پر مشتمل گوشوارے، انڈیکس اور اشاراتی نوٹس بیشتر سحر انصاری ہی نے مرتب کیے ہیں جن سے مذکورہ خاص نمبروں کی قدر و منزلت میں گونا گوں اضافہ ہوا۔ پچھلے چند برسوں سے وہ عنبریں حسیب عنبر کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے ادبی کتابی سلسلے ''اسالیب'' کی نگرانی اور سرپرستی کر رہے ہیں، جس کا عالمی سطح پر اُردو حلقوں میں نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔

لسانیات کے موضوع سے خصوصی ربط اور ماہرانہ تعلق ہی کی بنیاد پر وہ کئی برس تک اُردو لغت بورڈ کے مدیرِ اعلیٰ بھی رہے ہیں۔ وہ اکادمی ادبیات

پاکستان کے لائف فیلو ہیں اور گزشتہ دس بارہ برس سے آرٹس کونسل کراچی کی ادبی کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے منتخب ہوتے چلے آتے ہیں۔

ادارۂ یادگارِ غالب کی ہمہ جہت سرگرمیوں میں بھی وہ شروع ہی سے نہ صرف شریک رہے ہیں بلکہ نائب صدر کی حیثیت سے اب بھی اس کی کارکردگی کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔اس کے علاوہ بھی بے شمار ادبی، علمی اور ثقافتی ادارے اور تنظیمیں ہیں جن کے قیام اور نظم ونسق میں سحر انصاری دامے، درمے اور سخنے شریک رہتے ہیں کہ تحریک پذیری بھی ان کے تشخص کا نمایاں پہلو بن چکا ہے۔وہ کسی جگہ ٹک کر بیٹھ رہنے والے آدمی کبھی نہیں رہے۔ چناں چہ ۱۹۸۶ء میں جب کراچی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈ جوبلی کانفرنس جاری تھی تو اس کی مرکزی انتظامیہ میں سحر بھائی بھی شامل تھے۔ایک دو مرتبہ مشاورت کے لیے ان کے گھر جانا پڑا، کئی چکر لگائے لیکن گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔آخری پھیرا گیارہ بجے رات میں لگایا تو بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ ابھی گھر نہیں آئے ہیں۔چناں چہ ہم نے اور مسلم شمیم نے طے کیا کہ انھیں دفتر جاتے ہوئے پکڑ لیا جائے، لیکن قسمت نے یہاں بھی یاوری نہ کی یہ وہ صبح ساڑھے سات بجے ہی گھر سے نکل چکے تھے کہ آٹھ بجے ان کی کلاسیں شروع ہوجاتی تھیں۔وہ ہمہ وقت گردش میں رہنے کے قائل تھے۔

سحر انصاری کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''نمود'' (۱۹۷۶ء) میں شائع ہوا تھا جس میں فیض احمد فیض اور پروفیسر مجتبیٰ حسین کی نہایت اہم تحریریں شامل تھیں۔دوسرا شعری مجموعہ ''خدا سے بات کرتے ہیں'' کم وبیش چونتیس برس کے طویل وقفے کے بعد جون ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا ہے۔انھوں نے ایک درجن سے زائد مرثیے بھی لکھے ہیں جن کی اشاعت ہنوز نہیں ہوسکی ہے، ان کے علاوہ متعدد طویل موضوعاتی نظمیں، منظوم تراجم اور بعض دوسری شعری تخلیقات بھی اب تک کسی مجموعے میں شامل نہیں کی جاسکی ہیں۔ایک اندازے کے مطابق اگر مذکورہ شعری مواد کو کتابی صورت میں ترتیب دیا جائے تو کم از کم تین شعری مجموعے شائع ہوسکتے ہیں۔

نثر کے میدان میں صورتِ حال مزید باعثِ تشویش ہے۔ایک اندازے کے مطابق سحر انصاری نے گزشتہ نصف صدی کے دوران کم وبیش سیکڑوں مضامین مختلف ادبی، سماجی، ثقافتی، لسانی، فکری اور فلسفیانہ موضوع پر لکھے ہوں گے جن میں سے اکثر ہندوستان اور پاکستان کے ادبی جرائد اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں جب کہ بعض تقریباتی بروشرز، یادگاری کتابچوں اور تعارفی و معلوماتی جریدوں اور سووینئرز میں شامل ہیں۔بعض دوسرے اصحاب کے مطابق ان مضامین کی تعداد مذکورہ بالا تعداد سے بھی زیادہ ہے۔مختلف موضوعات پر کی جانے والی تقاریر، لیکچرز اور خطبات کی تعداد بھی کم نہیں ہوگی۔تاہم افسوس ناک امر یہ ہے کہ مذکورہ مضامین اور خطبات کو اب تک نہ تو مرتب کیا گیا اور نہ کسی دوسری طرح محفوظ کرنے کا جتن ہوا ہے، بلکہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ ان مضامین میں سے اکثر کی کاپیاں تک سحر انصاری کے ریکارڈ میں محفوظ نہیں ہیں۔ان مضامین اور خطبات سے نہایت محتاط انتخاب کرکے اگر انھیں کتابی شکل دی جاتی تو کئی ایک مجموعے اُردو کی تنقیدی کتابوں کے ذخیرے میں شامل ہوجاتے۔اسی طرح بعض مخصوص موضوعات پر سلسلہ وار خطبات اور تقاریر اور لیکچرز بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔جن میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام جرمن زبان وادب کے موضوع پر لیکچرز کی پوری سیریز بھی عدم دستیابی کا شکار بتائی جاتی ہے، جسے یقیناً ناقابلِ تلافی نقصان ہی کہا جائے گا۔ادبی کتابوں پر لکھی گئی تقریظیں، تعارفی دیباچے اور تبصرے بھی کسی ایک جگہ محفوظ نہیں معلوم ہوتے۔

چناں چہ نثر کے باب میں نہایت افسوس ناک سناٹا پایا جاتا ہے اور پروفیسر سحر انصاری جیسے عالم اور نقاد کے تنقیدی نظریات وخیالات یک جا نہ کیے جانے کی وجہ سے ایک عام قاری اُن کے تنقیدی خیالات اور فکری زاویوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جاتا ہے۔یہ المناک صورتِ حال اُردو تنقید کے جدید دور کے لیے نسبتاً زیادہ خسارے کا موجب ہے کہ عہدِ جدید کے مختلف تخلیقی رویوں اور فکری رُجحانات پر انھوں نے نہایت دقیع مطالعے پیش کیے ہیں، جو ہمارے تنقیدی سرمایے کا حصہ ہیں۔

فیض کی شخصیت اور فن پر لکھوائی گئی کتاب (spoken book) ''فیض کے آس پاس'' کے عنوان سے پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی نے اگست ۲۰۱۱ء میں شائع کی ہے۔مذکورہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود فیض فہمی کے باب میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے کہ اس میں فیض کے تمام شعری مجموعوں پر الگ الگ تجزیاتی مطالعے پیش کیے گئے ہیں۔مزید برآں یہ کہ سحر بھائی کو فیض سے جو قریبی تعلق اور قربت تھی، اس کے طفیل ہم فیض کی شخصیت اور فکر کے بعض نئے گوشوں سے بھی آگاہ ہوتے ہیں اور فیض کی شخصیت اور مزاج کی بابت بعض گم راہ کن افواہوں کی تردید بھی ہوتی ہے۔اس ضمن میں یہ بات نہایت خوش آئند ہے کہ ابھی چند ماہ قبل (جون ۲۰۱۴ء) پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ نے سحر بھائی کے تنقیدی مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ ''تنقیدی اُفق'' کے نام سے شائع کیا ہے، جسے سحر بھائی اپنا پہلا تنقیدی مجموعہ قرار دیتے ہیں۔''تنقیدی اُفق'' کو اپنے مشمولات کی بنا پر اُردو دُنیا میں دیکھتے ہی دیکھتے قرار واقعی مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں اکیس ویں صدی میں پیدا ہونے والی عالمی صورتِ حال اور تناظر کے پس منظر میں یک قطبی دُنیا کے بعض اہم فکری اندیشوں، وسوسوں اور اُلجھنوں کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔فکری مباحث کی تازہ کاری اور یونی پولر ورلڈ کے جدید ترین مسائل کی تفہیم ''تنقیدی اُفق'' کی نمایاں خصوصیات کہی جا سکتی ہیں اور لگتا ہے جیسے سحر بھائی نے مذکورہ کتاب کے ذریعے مختلف سائنسی علوم اور جدید فکری رویوں کے اشتراک سے ایک نیا تنقیدی شعور اور اسلوب تراشا ہے۔

''تنقیدی اُفق'' کے دیباچے میں سحر بھائی نے اپنی بابت اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مجھے باقاعدہ ہونے کا دعویٰ نہیں۔اپنے مطالعے اور بعض ادبی ضرورتوں کے تحت میں نے جو کچھ محسوس کیا اسے اپنے انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔اس تنقید کو زیادہ سے زیادہ Loud thinking کہا جاسکتا ہے۔انتظار حسین نے اپنے ادبی کالم مطبوعہ ڈیلی ڈان میں ''تنقیدی اُفق کا خیر مقدم کرتے

ہوئے سحر بھائی کے مذکورہ بالا فقرے کا بطورِ خاص نوٹس لیا ہے اور کہا ہے کہ زیرِ نظر کتاب اپنے گوناگوں اور متنوع مشمولات کی بنا پر اُردو تنقید میں اہم اور بلند پایہ اضافہ ہے، بلکہ اس میں پیش کردہ سیاحت کی وسعت اور ان کو سمجھنے سمجھانے کے لیے جو فکری اور نظریاتی بصیرت اور اسلوب اختیار کیے گئے ہیں، ان کی وجہ سے اسے جدید سرمایۂ نقد میں ترجیحی طور پر اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ کتاب کا خیر مقدم کرنے کے ساتھ ساتھ انتظار حسین نے نہایت سنجیدگی سے یہ سوال اٹھایا ہے کہ سحر بھائی نے گزشتہ تیس پینتیس برس سے اپنے آپ کو کراچی کی ادبی تقریبات کے لیے وقف کر دیا ہے جہاں وہ بے شک سب سے زیادہ مطلوبہ شخص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب وہاں کا کوئی بھی ادبی ہنگامہ ان کے بغیر ادھورا معلوم ہونے لگتا ہے، لیکن اس ادبی مصروفیت کی انھیں بھاری قیمت چکانا پڑ رہی ہے اور وہ اپنی تحریروں کو یک جا کر کے شائع کرانے کے سلسلے میں انتہائی تساہل اور اغماض سے کام لیتے ہیں جو ایک تشویش ناک صورتِ حال ہے کہ ادبی جلسوں میں کی جانے والی تقاریر اور خطبات تو بالآخر ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں جب کہ کتابیں باقی رہتی ہیں۔

سحر انصاری اندورنِ پاکستان کے طول و عرض کے علاوہ بیرونِ پاکستان متعدد ممالک کے دورے کر چکے ہیں جن میں افغانستان، ایران، سعودی عرب، مسقط، خلیجی ریاستیں، چین، جاپان، امریکا، برطانیہ، کینیڈا کے متعدد شہر شامل ہیں جہاں ان کی شعری تخلیقات اور تقاریر کو بطورِ خاص مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ انھیں حکومتِ پاکستان کی طرف سے ۲۰۰۵ء میں تمغۂ امتیاز سے بھی نوازا گیا ہے۔

یادش بخیر، سحر بھائی سے ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ ۵۹۔۱۹۵۸ء کے آس پاس شروع ہوا تھا۔ مقام اور تقریب یاد نہیں، لیکن غالباً ملاقات گارڈن ایسٹ میں خوجہ جماعت خانے کے قرب و جوار میں واقع رئیس بھائی اور جون ایلیا کی بہت عریض و وسیع عالی شان کوٹھی ''نرجس'' میں ہوئی تھی جہاں ہم چند ایسے دوستوں کے ساتھ گئے تھے جنھوں نے کم و بیش ہر شام وہاں حاضری دینے کو اپنے معمولات میں شامل کر رکھا تھا۔ یہاں رئیس امروہی، سیّد محمد تقی، جون ایلیا اور اُس خانوادے کے دیگر متعلقین رہائش پذیر تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس زمانے میں اس کوٹھی کو ایک تہذیبی، علمی، ادبی، فکری اور ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل تھی وہاں سہ پہر ہی سے متعدد معروف و غیر معروف ادیبوں، شاعروں، دانش وروں، استادوں، صحافیوں، طلبہ نمائندں، مزدور رہنماؤں کے شعلہ بیاں مقرروں اور ہمہ اقسام انقلابیوں کی آوک جاوک لگی رہتی تھی بالخصوص جمعہ، سنیچر اور اتوار کو تو گویا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ کوٹھی کا ہرا بھرا لان خوش نما سفیدے کے درختوں کے حصار میں رات کی رانی، چمپا اور چنبیلی کی خوش بو سے مہک رہا ہوتا تھا۔ متعدد میز کرسیاں قرینے سے لگی ہوتیں۔ یہاں اکثر سیّد محمد تقی کی محفل جمتی تھی جس میں نسبتاً سینئر لوگ شریک رہتے جس کو جہاں جگہ ملتی خاموشی سے ٹک جاتا تھا۔ فلسفہ، منطق، تاریخ، تمدن، ادبیاتِ عالم، اسلامیات، سوشلزم، عالمی سیاست اور جدید فکری نظریات جیسے بے شمار گنجلک موضوعات پر کبھی نہ ختم ہونے والے مباحث گرم رہا کرتے۔ کبھی کہیں ایک موضوع پر بات کی تان ٹوٹتی تو وہیں سے کسی دوسرے موضوع کی لے اُٹھالی جاتی تھی۔ بات بات پر سقراط، بقراط، ارسطو، افلاطون اور نہ جانے کن کن یونانی فلسفیوں، عرب مؤرّخوں اور مغربی دانش وروں اور نظریہ سازوں کے حوالے پیش کیے جاتے تھے۔ ہر شخص کی گفتگو میں علمی انداز اور منطق و استدلال کا رکھ رکھاؤ ضرور ہوتا تھا۔ لب و لہجے کی شائستگی، لطفِ کلام، شعر و سخن کی لطیف چاشنی اور برجستگی وغیرہ کا اہتمام ان محفلوں کی جان تھے۔ یوں تو ہر شریکِ محفل کو اظہارِ خیال کی مکمل آزادی تھی لیکن غیر معمولی سنجیدہ علمی فضا، منطقی دلیل اور استدلال کی چکا چوند اور قدیم و جدید حوالوں کی بھرمار میں کسی ہما شما کو بھلا ہمت ہی کب ہو سکتی تھی کہ بغیر پیشگی تیاری اس تیز و تند ریلے میں چھلانگ لگا دے لیکن پھر بھی سب حسبِ توفیق شریک ہوتے، بغیر کسی دانش ورانہ چشمک، مرعوبیت اور بے مغز کج بحثی کے۔

رئیس امروہی صاحب کی چوکی بالعموم ان کے رہائشی حصے کی نشست گاہ میں جمتی۔ رنگ برنگے دبیز قالینوں پر گدوں اور گاؤ تکیوں کا اہتمام ہوتا۔ خود رئیس صاحب کی نشست ایک لمبی چوڑی چوکی پر ہوتی جہاں وہ نیم وا اور موندی موندی آنکھوں سے عجب عالم میں رہتے، گویا اپنی ذات اور محفل کے سرور سے سرشار ہوں۔ عام طور پر یہاں کی فضا میں اس شورا شوری، اضطراب و تکرار، ہاؤ ہو اور جوش و جذبے کا فقدان ہوتا جو باہر برپا ہونے والی محفلوں کی جان تھے۔ کبھی کسی کونے میں ہلکا ہلکا صندلی لوبان بھی مہکتا رہتا۔ یہاں اکثر موضوعات بھی مختلف اور حاضرینِ محفل بھی جداگانہ مزاج کے نمائندے ہوا کرتے تھے۔ 'عالمِ ارواح اور مابعد الطبیعیاتی' ماورائیت کے دل چسپ اور حیران کن معاملات، مثلاً جنات کی کرشمہ سازیاں، عالمِ برزخ کے احوال، روحوں کی افتاد، بھوت پریت کے فسانے، چھلاوے کی حقیقت جیسے موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ کبھی علمِ بشریت، نفسیات، مابعد نفسیات، جنسیات، توہمات، انتشارِ ذہنی، توجہاتِ فکری، جذبہ و احساس کے تصادم، خوف، دہشت اور کم ہمتی جیسے سنجیدہ مسائل، عقل، شعور و ادراک اور فکر و احساس کے معاملات خواب و خیال، مراقبے اور ہپناٹزم ایسے موضوعات زیرِ بحث ہوتے تھے جو بظاہر ٹھوس علمی و تحقیقی بنیادوں کے بجائے بعض مذہبی و نیم مذہبی اعتقادات، توہمات اور مفروضات کا حاصل سمجھے جاتے تھے، لیکن رئیس صاحب ان سب موضوعات پر عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ اظہارِ خیال فرماتے۔ یہ ان کے اندازِ گفتگو کی جاذبیت تھی کہ اکثر سننے والے ان کے ہم نوا بھی ہو جاتے تھے۔ ویسے روزمرہ زندگی کے معمولات میں رئیس امروہی بڑے منطقی، تعقل پسند اور غیر جذباتی آدمی تھے۔ سیاسی، سماجی اور معروضی حالات و حقائق پر بڑی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ وہ منقولات سے کہیں زیادہ معقولات اور جذباتی اندازِ فکر کی جگہ دلیل و استدلال کے قائل تھے۔ ان کی محفل کے آداب بھی ذرا مختلف تھے، جہاں منتخب خواتین و حضرات ادب و احترام کے ساتھ دوزانو ہو کر اپنے اپنے مسائل پیش کرتے۔ رئیس صاحب ان کے سوالات کے جواب دیتے، مشاورت طلب کرنے والوں کی رہنمائی فرماتے۔ آخر آخر میں قوتِ ارادی کے استحکام و استقرار کے لیے شمع بینی کی مشق بھی کرائی جاتی۔ شنید ہے کہ کچھ وظائف اور چلہ کشی کے سلسلے بھی ہونے لگے

تھے۔ شعروشاعری اور لطفِ سخن سے ایسی فضا بنتی کہ ان کی محفل سے کسی کا بور ہو کر اُٹھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ علم وفکر کے موضوعات چھیڑتے تو گویا معلومات کے دریا بہا دیتے۔ اگر کوئی علم دوست کسی جدید اور تازہ تر سائنسی تحقیق اور انکشاف کا ذکر چھیڑتا تو اس کی گفتگو کو بڑے انہماک سے سنتے اور حاضرینِ محفل کو بھی متوجہ کرتے جاتے کہ ''دیکھیے صاحب یہ ہے جدید ترین خام مواد ذخیرۂ علم وادراک کی توسیع کا۔ اور پھر وہ خود اپنی تلاش وجستجو سے متعلقہ موضوع کی باریکیوں تک پہنچنے کی کاوش فرماتے۔ نوجوانوں کی ٹولیاں پھاٹک کے ساتھ واقع ''انشا'' کے دفتر اور ملحقہ چبوترے اور لان میں اِدھر اُدھر جم جاتیں، لوگ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں آتے جاتے رہتے۔ کسی ٹولی کا جی چاہتا تو پڑوس میں واقع چائے خانے کا چکر بھی لگا آتی۔ شام کے وقت یوں بھی آس پاس کی گلیاں رنگ ونور سے چھلک رہی ہوتی تھیں کہ حسیناؤں کے پَرے کے پَرے جماعت خانے کی طرف آتے جاتے دکھائی دیتے تھے، غرض ایک عجب طلسماتی فضا تھی جو 'نرجس' کے اندر اور باہر پھیلی ہوتی تھی۔ سحر بھائی، تقی صاحب کے گرد جمع سامعین میں ہوتے ہوں کہ رئیس صاحب کی محفل میں، وہ اکثر ذہین اور سنجیدہ سامع کا کردار ادا کرتے اور لوگ انھیں اہمیت بھی دیتے۔ وہ خواہ مخواہ کسی بحث مباحثے میں کود پڑنے کے قائل نہ تھے۔ ہاں کوئی انھیں مخاطب کرتا اور ان کی رائے طلب کرتا یا موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی جاتی تو سہج سہج انداز میں اپنی سوچی سمجھی رائے کا اظہار کرتے، خواہ وہ دیگر حضرات کی رائے سے یکسر مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ کج بحثی میں پڑنے کے بجائے اکثر خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے پاس حفظِ مراتب کا اہتمام ہمیشہ دیکھنے میں آیا ہے۔

ایسی ہی چند ملاقاتیں انڈیا کافی ہاؤس، کیفے جارج، اور زیلنس (Zelins) ریسٹورنٹ (جو کبھی عبداللہ ہارون روڈ پر الیکٹرونک مارکیٹ میں واقع تھا) کی بھی یاد آتی ہیں، جہاں لکھنے پڑھنے والوں کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ دراصل وہ کافی ہاؤسوں اور چائے خانوں کا دور تھا۔ جہاں اہلِ علم ودانش اور صاحب الرائے لوگ جمع ہوتے تھے اور آزادیِ خیال اور ارتباط باہمی سے فکر ودانش کے چراغ جلایا کرتے تھے۔ یہاں معروضی حالات پر بھی کسی نہ کسی انداز میں تبصرے ہوتے، لیکن جیسے جیسے ملک میں جمہوری اقدار کا دائرہ محدود ہوتا گیا اور غیر جمہوری حکمرانوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی، ویسے ویسے ملک سے ان مراکز کا بھی خاتمہ ہونا شروع ہوگیا جہاں پڑھے لکھے لوگوں کے جمع ہونے کے امکان ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کراچی، لاہور اور دوسرے بڑے شہروں میں کیفے کلچر کا خاتمہ عمل میں آیا۔

دراصل سن اٹھاون تک ہم بھی گریجویشن سے فارغ ہو چکے تھے اور کچھ کاروباری سلسلوں میں ہمارا کراچی زیادہ تواتر سے آنا جانا ہونے لگا تھا۔ عام طور پر تین چار ماہ میں ایک آدھ پھیرا ضرور لگ جاتا تھا۔ عام طور پر ہر پھیرا چار چھ دن کا ہوتا تھا، لیکن اکثر یہ مدت بڑھ بھی جاتی۔ ہر چکر میں چند ایک باتیں گویا لازماً شامل ہوتیں، مثلاً کافی ہاؤس، کیفے جارج اور صدر کے دوسروں ہوٹلوں میں جہاں شاعر ادیب بیٹھا کرتے ہیں، ضرور حاضر ہونا۔ بے تکلف دوستوں کے ساتھ کوئی اچھی انگلش فلم دیکھنا اور اگر موقع نصیب ہو تو جون ایلیا سے ملنے ان کی کوٹھی نرجس کا چکر لگانا وغیرہ۔ سحر بھائی سے ملاقات ان سب مشاغل میں سرِفہرست ہوتی تھی۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ ہم محسوس کرتے کہ وہ کھلے دل اور کشادہ بانہوں کے ساتھ ہمارا استقبال کرتے اور خندہ پیشانی کے ساتھ ہماری آؤ بھگت بھی فرماتے ہیں۔ ان کے ہاں ظاہرداری کا گمان نہ ہوتا تھا۔ جس زمانے میں جامعہ کراچی شہر سے بارہ میل پَرے شفٹ نہیں ہوئی تھی صدر کے ہوٹلوں کی محفلیں دوپہر ہی سے گرم ہو جاتی تھیں جس کے دوران سحر بھائی سے ملاقات کا دورانیہ بھی اچھا ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں مزے کی بات تو یہ تھی کہ ان سے مل لینا گویا پورے شہر سے مل لینے کے مترادف ہوتا کہ ہر ملاقات میں پتا چل جاتا کہ آج شہر کی ادبی وثقافتی سرگرمیوں کی کیا صورت ہے؟ اور گزشتہ کل وہ کون کون سی ادبی تقریبات میں شریک تھے۔ لوگوں کا تذکرہ ہوتا تو وہ تفصیل سے بتا دیتے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ کس کس نے تازہ نظم، غزل یا افسانہ لکھا ہے، کتابوں کی بات چلتی تو پتا چلتا کہ انگلش اور اُردو کی تازہ کتابیں اور رسالے بازار میں آ گئے ہیں۔ اس باب میں ان سے بہتر رہنمائی کسی اور سمت سے مل ہی نہیں سکتی تھی۔ آپ چاہیں تو ان سے ہر کتاب کی خاص خاص باتیں بھی جان لیں کہ وہ اکثر تازہ کتابوں اور رسالوں کو پہلی ہی فرصت میں خرید لیا کرتے تھے، جس کے لیے انھیں اپنی کتنی ہی دوسری اہم ضرورتیں پسِ پشت ڈالنا پڑ جاتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ ہم نے کسی خاص کتاب یا رسالے کے حصول میں دل چسپی ظاہر کی اور اس کی دستیابی کی بابت جاننے کی کوشش کی تو اگلی ملاقات میں سحر بھائی مطلوبہ کتاب خود حاصل کر کے ہمیں بطورِ تحفہ پیش کر دیتے جو ہمارے لیے قدرے خجالت کا سبب بھی ہوتا لیکن سحر بھائی بھی اس سلسلے میں مہمان نوازی کے قائل تھے۔ یونی ورسٹی کے پرانے کیمپس پرنس علی روڈ سے صدر تک کے راستے میں جتنے کتاب گھر پڑتے تھے، ان سب میں وہ روزانہ کی بنیاد پر چکر لگایا کرتے تھے جن میں پرانی اور سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے مراکز بھی شامل ہوتے۔ یہ سب باتیں جہاں ان کے ذوقِ مطالعہ کی نشان دہی کرتی تھیں وہیں معاشرے میں کتاب کلچر پھیلانے کے سلسلے میں سحر بھائی کی خواہش اور کوششوں کی مظہر بھی تھیں۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ مطالعے کی جو علت انھیں لڑکپن سے لگی ہے اس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے اور کسی بھی موضوع کے مطالعے پر وقت کی پھپھوند نہیں لگنے دیتے بلکہ مسلسل مطالعے سے علمی جستجو کی جوئے ادب تو ہمیشہ رواں دواں رکھتے ہیں۔

جامعہ کراچی کے نیو کیمپس چلے جانے کے بعد سحر بھائی کا مرکزِ شہر میں آنا جانا کم ہو گیا تھا۔ اب ان کی مصروفیت جامعہ کے اندر مرکوز ہو گئی تھیں جہاں سے ایم اے انگلش کے بعد اُردو ادبیات کی کلاس میں داخلہ لے لیا تھا اور ایم اے اُردو کے بعد وہ لسانیات میں ڈگری لینے پر تُل گئے تھے۔

اب ان کا شمار جامعہ کے باقاعدہ دانش وروں میں ہونے لگا تھا۔ انگلش لٹریچر کے فیکلٹی ممبران میں تو ان کی دھاک پہلے ہی بیٹھی ہوئی تھی، اُردو ڈپارٹمنٹ میں بھی انھیں خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوتی تھی۔ لسانیات میں ایم

اے کر لینے کے بعد انھیں ایک طرح اپنے ہم عمروں پر غیر معمولی فوقیت حاصل ہوگئی تھی اور شاید ان جیسی کوئی دوسری مثال سامنے تھی بھی نہیں۔ جامعہ کراچی میں انھوں نے بطورِ طالب علم چھ برس کا طویل ترین دورانیہ گزارا تھا۔ چناں چہ اس پورے عرصے میں چاروں طرف ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔

تعلیم سے فراغت پاتے ہی وہ بلوچستان یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے منسلک ہوگئے تھے۔ یہاں انھوں نے اُردو کے ساتھ شعبۂ انگریزی میں بھی کام کیا اور انگریزی بھی پڑھائی تھی۔ اس زمانے میں پروفیسر مجتبیٰ حسین بلوچستان یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ اُردو تھے، جب کہ ڈاکٹر احسن فاروقی شعبۂ انگریزی کے صدر نشین تھے۔ پروفیسر کرار حسین یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ سحر بھائی کو ان تینوں حضرات سے قرب حاصل تھا اور وہ حضرات بھی ان کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ بزرگ اپنے عہد کے نہایت وسیع المطالعہ لوگ تھے اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کے پرچارک بھی۔ زندگی کے نت نئے تجربوں سے لذت کشید کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ چناں چہ انھیں بلوچستان یونی ورسٹی کا ماحول ذرا مختلف لگا تھا۔ ویسے بھی یہ ادارہ ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا، چناں چہ ضرورت اس بات کی تھی کہ لوگ یہاں اپنا ماحول آپ پیدا کریں۔ بلوچستان کے قیام کے شروع دنوں ہی میں پروفیسر مجتبیٰ حسین نے انھیں بتایا تھا کہ ''یہاں کی شامیں اور راتیں ذرا طویل، خنک اور سنسان ہوا کرتی ہیں۔ دن میں تدریسی مشاغل کے علاوہ وقت گزاری کے مواقع کم کم ہیں۔ اس لیے لوگ تنہائی اور سناٹے سے بچنے کے لیے کوئی نہ کوئی تفریحی مشغلہ ڈھونڈ لیتے ہیں کہ بوریت سے بچا جاسکے۔ دن اور شام کا وقت تو آدمی چہل قدمی وغیرہ کر کے گزار لیتا ہے لیکن راتیں بوجھل ہوجاتی ہیں۔ اس لیے اگر ممکن ہو تو تم بھی جلد از جلد تاش کے پتوں میں برج کا کھیل سیکھ لو۔ تاش کے پتوں میں برج کا کھیل ذرا مشکل اور ٹیکنیکل ہوتا ہے اور اس کے کچھ قاعدے اور روایتیں ہیں جو دُنیا بھر میں یکساں طور پر تسلیم کی جاتی ہیں۔ صاحبِ ذوق لوگ اس کھیل میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مختلف استادانِ فن کی کتابیں پڑھتے ہیں۔'' اس مشورے پر سحر بھائی نے بھی برج پر دستیاب لٹریچر کھنگال ڈالا لیکن صد حیف کوششِ بسیار کے باوجود وہ اس پیچیدہ کھیل کی الف ب بھی نہ سمجھ پائے۔ انھوں نے اپنی اس کمی کو بھی ایک غیبی اشارہ سمجھا اور تاش کے جھمیلے میں پڑنے کے بجائے دستیاب فرصت کو زیادہ سے زیادہ مطالعے کے لیے وقف کرنے کو ترجیح دی۔ چناں چہ اس اعتبار سے بھی وہ بلوچستان کے قیام کو بہت بارآور خیال کرتے ہیں کہ اس دور میں انھیں اپنی شاعری پر بھی توجہ دینے کا موقع مل گیا تھا۔

ابھی بلوچستان یونی ورسٹی میں دو ڈھائی برس ہی گزرے تھے کہ انھیں جامعہ کراچی کے شعبۂ اُردو سے آفر آ گئی اور وہ کراچی لوٹ آئے۔ جامعہ کراچی کے شعبۂ اُردو سے ان کی وابستگی خاصی طویل مدت پر محیط رہی ہے۔ یہاں انھوں نے کئی برس شعبۂ اُردو کی صدر نشینی کے فرائض بھی سرانجام دیے ہیں۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ کی رہنمائی اور درس و تدریس ان کی ذمہ داریوں میں شامل تھیں۔ اس عہد کے تمام اہم علمی و ادبی شخصیتوں اور اساتذہ سے ان کے ذاتی مراسم قائم تھے۔ چناں چہ کرار حسین، حسن عسکری، مجنوں گورکھ پوری اور پروفیسر ممتاز حسین وغیرہ جیسے بزرگ کبھی جامعہ کراچی تشریف لاتے تو اپنا بیش تر وقت ان ہی کے کمرے میں گزارتے تھے۔

سحر بھائی اور ہمارے تعلقات میں ایک ذرا قربت اور لگاؤ کی صورت اندرونِ سندھ میں ادبی اجتماعات کے حوالے سے بھی پیدا ہوئی تھی کہ سکھر، لاڑکانہ اور خیر پور وغیرہ میں منعقد ہونے والے مشاعروں اور مذاکروں میں کراچی کے شرکا میں سحر بھائی بھی اکثر شامل ہوا کرتے تھے اور ان کی میزبانی کا شرف کبھی کبھی سکھر میں ہمیں بھی حاصل ہوتا تھا۔ لاڑکانہ میں یہ شرف مسلم شمیم کے حصہ میں آتے یوں بھی کراچی کے احباب کو بالائی سندھ کے شہروں کی ادبی و ثقافتی فضا بالعموم بہت پسند آتی تھی کہ کاسموپولیٹن شہر کی ہنگامہ خیز فضا اور ہاؤ ہو سے نکل کر نسبتاً چھوٹے شہروں کی پرسکون زندگی میں دو ایک روز گزار لینا ان سب ہی کو اچھا لگتا تھا۔ چناں چہ لاڑکانہ کے ایک مشاعرے کی روئیداد سحر بھائی کو اب تک یاد ہے اور کبھی کبھی وہ دوستوں کے درمیان اسے سناتے رہتے ہیں۔ انھیں یاد ہے کہ ''لاڑکانہ کے ایک مشاعرے کے بعد سب لوگوں کی چارپائیاں کھلی چاندنی میں ڈال دی گئی تھیں جن پر اُجلی چادروں اور خوب صورت اجرکوں کے بچھونے کیے گئے تھے، جگہ جگہ کورے مٹکے اور صراحیاں رکھ دی گئی تھیں جن میں موتیے کے ہار لپیٹے گئے تھے۔ یہ ساری فضا ان لوگوں کو بہت طلسماتی اور من موہنی لگی تھی۔ دوسرے دن صبح کا مریڈ جمال الدین بخاری کے مکان پر کراچی، لاہور اور دوسرے شہروں سے آئے ہوئے مہمانوں کے ناشتے کا اہتمام تھا، جہاں ان کی بیگم کامریڈ شانتا بخاری چند لڑکیوں کی مدد سے ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ کہیں پوریاں تلی جارہی تھیں، کہیں پراٹھوں کا اہتمام ہو رہا تھا، غرض بڑی گھریلو فضا تھی۔ سب لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر نیم دراز اس کیفیت کا لطف لے رہے تھے۔ فیض صاحب ناشتے کے لیے آئے تو سب لوگوں کو یک جا دیکھ کر خفگی کا اظہار کیا کہ انھیں بطورِ خاص ڈاک بنگلے میں ٹھہرانے کی منطق کیا تھی اور انھیں اس پُرفضا دو سالہ ماحول سے محروم کیوں کیا گیا۔ دو چار دوستوں کی ٹولی ناشتے سے پہلے ذرا بازار کا چکر لگانے نکلی تو سب نے سندھی ٹوپیاں اجرک اور سندھی چپلیں بھی خرید لیں۔ انھوں نے دیکھا کہ بازار میں پراٹھے کے ساتھ تازہ مکھن کے دونے بھی دیے جارہے ہیں۔ چناں چہ لوگوں نے تازہ مکھن بھی خرید لیا۔ ایک مٹھائی کی دکان پر بہت رش تھا، معلوم ہوا کہ یہ یہاں کی خاص سوغات ہے جسے ایک ہندو گھرانا چلاتا ہے۔ سندھی ٹوپی اور اجرک کے ساتھ جب یہ ٹولی واپس آئی تو کسی نے فقرہ لگایا کہ ''میاں بس بیلوں کی ایک جوڑی بھی لے لیتے تو منظر نامہ مکمل ہوجاتا۔'' صہبا لکھنوی ہندو مٹھائی کا چرچا سن چکے تھے۔ چناں چہ انھوں نے رٹ لگا رکھی تھی کہ بھئی ہندو مٹھائی تو ضرور لینی ہے۔ جب یہی فقرہ دو چار مرتبہ سننے میں آیا تو آخر فیض صاحب نے انھیں جھاڑ پلا دی کہ ''بھئی ہندو مٹھائی کیا ہوتی ہے۔ لاڑکانہ کی سوغات کیوں نہیں کہتے۔'' اسی سفر میں سب لوگوں کو کھلی جیپوں میں سوار کرا کے موہنجوداڑو لے جایا گیا تھا۔ موہنجوداڑو کی سیر کے بعد دوپہر کے کھانے کا اہتمام بھی وہیں ریسٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ یہ ساری روداد وہ اس طرح سناتے ہیں جیسے کسی ناقابلِ فراموش پکنک کا احوال سنا رہے ہوں۔ سحر بھائی کو مشاعروں کے علاوہ اکثر سیمیناروں میں بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ یہاں ان کی تقاریر پسند کی

جاتی تھیں۔ سکھر میں غالب کی صد سالہ تقریب جس میں فیض اور پروفیسر کرار حسین کے علاوہ پاکستان کے پچاس سے زائد مہمان بھی شریک تھے، سحر بھائی نے غالب پر اہم مقالہ پیش کیا تھا، اور فیض نے غالب کی ایک غزل کی تشریح کر کے غالب کے فنی مزاج پر روشنی ڈالی تھی۔ غرض اس طرح کی متعدد یادیں ہیں جو سحر بھائی کا اور ہمارا مشترک سرمایہ ہیں، اور جسے ہم گاہے گاہے تازہ کر لیا کرتے ہیں۔

۱۹۷۲ء کے اواخر میں ہم سکھر سے کراچی منتقل ہو چکے تھے، اور یہاں یونائیٹڈ بینک سے بہ حیثیت لا آفیسر منسلک ہو گئے تھے۔ حسنِ اتفاق سے ہمارا دفتر آئی آئی چندریگر روڈ کی اسٹیٹ لائف بلڈنگ میں واقع تھا جس سے ملحق عمارت فنلے ہاؤس میں برٹش کونسل کے شعبہ اطلاعات کا آفس تھا، جہاں سحر بھائی برٹش کونسل کا خبر نامہ ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ محمد علی صدیقی بھی اسی شعبے سے منسلک تھے۔ اس زمانے میں کبھی ہم سحر بھائی سے ملنے ان کی طرف چلے جاتے تھے اور کبھی وہ اپنے پرانے دوست س م صولت سے ملنے ہماری عمارت میں آ جاتے تھے جہاں صولت صاحب کا بھی دفتر تھا۔ ان طویل ملاقاتوں میں کھلا کہ سحر بھائی صرف ادب ہی میں ترقی پسندیت کے قائل نہیں، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں سائنسی نکتہ نظر اختیار کرتے ہیں۔ ہر چند سوشلزم اور جمہوری تصورات کو ضروری خیال کرتے ہیں لیکن کسی معاملے میں جامد کٹر پن کے قائل نہیں ہیں۔ چناں چہ ادب کی ترقی پسند تحریک کے بارے میں بھی معروضی حالات اور سماجی محرکات کی روشنی میں تبدیلی کے عمل کو لابدی سمجھتے ہیں۔

اسی زمانے میں سحر بھائی کو بی بی سی ریڈیو کی طرف سے بھی پیش کش موصول ہوئی تھی اور ڈیوڈ اسٹریڈ (David Strade) نے انھیں انٹرویو میں کلیئر بھی کر دیا تھا، لیکن تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے تحت سحر بھائی نے بسلسلۂ ملازمت پاکستان سے باہر جانے کے خیال کو مسترد کر دیا، حالاں کہ یہی تصور اکثر لوگوں کے لیے زندگی کی معراج ہوا کرتا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد سحر بھائی متعدد بین الاقوامی جامعات میں بھی تدریسی فرائض انجام دے چکے ہیں جن میں کورنیل یونی ورسٹی امریکا، دائتو بنکا یونی ورسٹی جاپان اور چین کی معروف درس گاہیں شامل ہیں۔ دراصل درس و تدریس کا عمل ان کی سرشت میں داخل ہے اور وہ اب بھی وفاقی اُردو یونی ورسٹی، جناح یونی ورسٹی برائے خواتین اور پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی سے وابستہ چلے آتے ہیں اور حسبِ ضرورت و خواہش مذکورہ اداروں کو اپنی خدمات سے مستفیض کرتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ طلبہ و طالبات کی ایک طویل فہرست ہے جو تحقیقی کاموں میں ان سے ہدایات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی سرشت میں ایک نرم خو اور سبک رَو شخصیت کے مالک ہیں۔ تیزی و طراری، چھینا جھپٹی اور جوڑ توڑ ان کے مزاج میں شامل نہیں، بلکہ طبیعت میں عاجزی، تحمل اور ایثار پسندی کے عناصر غالب ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ٹیچنگ کیریئر کے ابتدائی دنوں میں ایک مرتبہ وہ اُردو کالج کی لیکچرر شپ کے مقابلے میں شریک ہوئے تھے۔ انٹرویو بورڈ میں ڈاکٹر ممتاز حسین، ڈاکٹر شاہ علی اور پروفیسر خلیل اللہ جیسے جید لوگ شامل تھے اور مقابلے میں ڈاکٹر کریم الدین احمد اور ڈاکٹر عالیہ امام جیسے نامی گرامی اساتذہ، لیکن سحر بھائی پی ایچ ڈی نہ ہونے کے باوجود منتخب کر لیے گئے تھے۔ بعد میں جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ آسامی دراصل پروفیسر یونس شرر کو جو پہلے ہی جامعہ میں خدمات انجام دے رہے تھے، مستقل کرنے کے لیے نکالی گئی تھی۔ تو انھیں اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان کے انتخاب سے یونس شرر کی ملازمت پر کوئی منفی اثر نہ پڑ جائے۔ چناں چہ یہ خود جا کر ڈاکٹر ممتاز حسین سے ملے اور اپنے اندیشے کا اظہار کیا اور بتایا کہ وہ تو ابھی ملازمت میں ہیں اس لیے یونس شرر کی جگہ لینا ہرگز پسند نہ کریں گے۔ ڈاکٹر ممتاز حسین نے انھیں یقین دلایا کہ یونس شرر کے علاوہ ایک اور اسامی بھی نکالی گئی ہے جس کے لیے آپ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس لیے آپ کے انتخاب سے یونس شرر کے معاملے پر کوئی منفی اثرات مرتب نہ ہوں گے۔

دوست داری اور احباب نوازی کے معاملے میں بھی اُن جیسی مثال کم نظر آتی ہے۔ وہ یک طرفہ دوستی کے زیادہ قائل ہیں اور اپنی ہی طرف سے دوستی نبھائے چلے جاتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی پر ہمیشہ کمر بستہ رہتے ہیں۔ چناں چہ کراچی سے شائع ہونے والی ہر دوسری تیسری کتاب پر سحر بھائی کا دیباچہ، تقریظ یا کم از کم رائے ضرور مل جاتی ہے۔ یہی صورتِ حال ادبی تقریبات کی ہے اور شہر بھر میں منعقد ہونے والی شاید ہی کوئی ادبی تقریب ہو جس میں سحر بھائی شریک نہ ہوتے ہوں۔ اور کبھی کبھی تو ایک ہی روز میں ایک سے زیادہ محفلوں میں بھی انھیں دیکھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی ہمت، حوصلے اور فعالیت کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ بعض لوگ تو ادبی تقریب کا پروگرام بناتے ہوئے سب سے پہلے سحر بھائی ہی کا نام ٹانکتے ہیں جس کے لیے اُن کی پیشگی اجازت، تائید و توثیق کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی کیوں کہ سحر بھائی کو ایک ذرا سی منت سماجت سے بہر حال راضی کر لینا دشوار نہیں ہوتا۔ اسی خوبی کے پیشِ نظر مشفق خواجہ (مرحوم) نے اپنے کالم میں اُنھیں ''شہر انصاری'' کا خطاب دیا تھا۔ اگر کبھی کسی بے تکلف دوست نے ادھر توجہ دلائی بھی تو جواباً وہ یہی کہتے ہیں کہ ''بھائی زندگی سے کٹ کر آپ کیسے جی سکتے ہیں۔ اگر ادب کا مشغلہ پسند خاطر ہے تو اس میں دامے درمے سخنے شریک ہونا ہی پڑتا ہے۔'' لیکن سحر بھائی یہ تو سراسر تضیع اوقات ہے نا۔ آخر اس وقت میں آدمی اپنا لکھنے پڑھنے کا کام کیوں نہ کرے۔ اس دوستانہ پند و نصیحت کے جواب میں سحر بھائی کہتے ہیں، ''جناب وہ تو آپ کا کام ہے اور آپ کو بہر حال کرنا ہی ہے، لیکن لوگوں سے ملنا جلنا بھی زندگی کے عمل میں شامل ہوتا ہے جس کے بغیر تہذیب وجود میں نہیں آتی۔ خانقاہی چلّہ کشی ممکن ہے، نفسِ مطمئنہ کو تقویت فراہم کرے لیکن تخلیقی سطح پر بنجر پن کو بھی جنم دیتی ہے۔ محسوسات کی نیرنگیاں اور گرم جوشی انسانوں کے درمیان رہنے سہنے ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ دو طرفہ عمل ہے جس سے مفر نہیں۔'' ان کی فعالیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انھیں کسی خاص گروپ اور جماعت سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کسی بھی پلیٹ فارم سے انھیں اپنے شخصی خیالات پیش کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ نہ تو موقع اور ماحول کے لحاظ سے انھیں اپنے فکری و نظریاتی خیالات اور اسٹینڈ کو یکسر بدل لینے کا ہنر آتا ہے اور نہ وہ اس موقع پرستی کو پسند کرتے

ہیں۔ اتفاق ہو کہ اختلاف دونوں رویوں کو وہ علم واستدلال کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، لیکن بات بات پر دوسروں کے ساتھ سینگ لڑانے کا شوق انھوں نے کبھی نہیں پالا، کیوں کہ وہ اختلافِ رائے اور کج بحثی کے فرق کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

نوجوانی میں انھیں اپنے سینئر اور بزرگ معاصرین کی بے انتہا شفقت اور محبت حاصل رہی ہے۔ چناں چہ جوش، فیض، مجنوں گورکھ پوری، حسن عسکری، عزیز حامد مدنی، رئیس امروہی، پروفیسر مجتبیٰ حسین اور پروفیسر ممتاز حسین وغیرہ نے ہمیشہ ان کی شاعرانہ اور ناقدانہ صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ فیض نے تو انھیں اپنی معنوی اولاد تک کہا اور اپنے آپ پر وی جی کیرنن اور الیکسی سرکوف کے لکھے ہوئے مضامین کے نہ صرف ان سے ترجمے کروائے بلکہ ''سرِوادیِ سینا'' اور ''نسخہ ہائے وفا'' میں شامل بھی کیے ہیں۔ دورانِ اسیری ایلس فیض کو لکھے ہوئے اپنے خطوط کا ترجمہ فیض نے خود کیا ہے اور اس سلسلے میں مرزا ظفر الحسن کے ساتھ سحر بھائی ہر اتوار کی صبح فیض سے املا لیا کرتے تھے۔ یہی نہیں، بلکہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''نمود'' میں شامل شاعری کو فیض نے ایک بہت تعلیم یافتہ، خیال افروز اور سنجیدہ ذہن کی تخلیق کہا ہے، اور ان کی شاعری میں موجودہ درد اور احساس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''نمود'' کو پڑھتے ہوئے ن م راشد اور مصطفےٰ زیدی کی یاد آتی ہے۔

اسی طرح پروفیسر مجتبیٰ حسین نے ''نمود'' کو ''سوچتے ہوئے ذہن کی شاعری'' قرار دیا ہے۔ عزیز حامد مدنی اکثر ان کی غزل کے منتخب اشعار کو نئی غزل کی تائید اور ستائش کے طور پر پیش کرتے تھے۔ یہ باتیں محض حوصلہ افزائی کے زمرے میں نہیں رکھی جاسکتیں، بلکہ ان میں سوچی سمجھی ناقدانہ رائے اور توصیف و ستائش کا جوہر نمایاں ہے۔ محبت، شفقت اور حوصلہ مندی کی جو سوغات انھوں نے اپنے بزرگوں سے پائی تھی اس میں کئی گنا اضافہ کر کے وہ نئے لکھنے والوں میں تقسیم کرتے چلے جارہے ہیں، چناں چہ کسی نئی کتاب پر ان کے لکھے ہوئے چند حوصلہ بخش فقرے بھی نئے لکھنے والوں کی اگلی مسافتوں کو اجال دیتے ہیں تو اس عمل کو ان کی مسلسل فیض رسانی سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔

ہمیں غالب لائبریری میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک نشست یاد ہے جس کی صدارت پروفیسر ممتاز حسین فرمارہے تھے۔ دورانِ گفتگو حاضرین میں سے کسی صاحب نے صدرِ جلسہ سے فرمائش کی کہ وہ (پروفیسر ممتاز حسین) فیض کی شاعری پر مغربی شاعری کے اثرات پر اظہارِ خیال فرمائیں۔ ممتاز صاحب نے کہا، صاحب یہ ایک اہم اور پھیلا ہوا موضوع ہے جسے محض چند فقروں میں نہیں ٹرخایا جاسکتا۔ بہت سے حوالے بھی پیش کرنے ہوں گے جو فی البدیہہ تقریر میں ممکن نہیں، لیکن جب حاضرین کا اصرار بڑھ گیا تو پروفیسر ممتاز حسین نے سحر بھائی کو اظہارِ خیال کی دعوت دی اور انھوں نے کم وبیش ایک گھنٹے تک اس فرمائشی موضوع پر نہایت مدلل اور مرصع تقریر کی جو متعدد حوالوں سے بھی مزین تھی۔ وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ غیر معمولی یادداشت، مرتب نظامِ فکر اور قوتِ بیان پر ماہرانہ دسترس کا مظاہرہ تو ہم کم وبیش روز ہی ان کی ادبی تقریروں میں دیکھتے ہیں۔ ان جلسوں میں وہ لکھے ہوئے مضمون پڑھنے کے بجائے زبانی تقریر کیا کرتے ہیں، جن کے محفوظ کرنے کا کوئی خصوصی انتظام بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔

ہمارا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ تو یہی ہے کہ سحر بھائی ایک نہایت دل گداختہ شخص اور دردمند آدمی ہیں اور حتی الامکان دوستوں کے دکھ درد میں شریک رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی ادیب، شاعر دوست اور واقف کار کی علالت کی خبر مل جائے تو اس کی عیادت گویا ان پر فرض ہو جاتی ہے، اگر بوجوہ خود نہ جاسکیں تو ٹیلی فون پر ہی مزاج پرسی کر لیتے ہیں۔ ہم نے تو اس شہرِ سفاک میں اکثر یہ بھی دیکھا ہے کہ اہم بلکہ مشہور لکھنے والوں تک کی آخری رسومات میں بھی صرف اس کے قریبی عزیز واقارب ہی شریک ہوا کرتے ہیں اور ادبی حلقوں کی نمائندگی بس معدودے چند افراد ہی کی ذمہ داری سمجھ لی جاتی ہے۔ سحر بھائی کا شمار ان ہی معدودے چند لوگوں میں ہوتا ہے کہ ہر ایسی تقریب میں موجود رہتے ہیں جسے ہم پوری ادبی دُنیا کی نمائندگی تصور کرتے ہیں، لیکن کبھی کبھی کوئی ایسی صورتِ حال بھی دیکھنے میں آجاتی ہے جس کا جواز ہی سمجھ میں نہیں آتا — شوکت صدیقی کی رحلت کے سانحے نے یوں تو اُردو دُنیا ہی کو دکھی کر دیا تھا، لیکن خاص طور پر پاکستان کے ادبی حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی تھی اور عوامی سطح پر بھی ایک مقبول صاحبِ قلم کی موت پر غیر معمولی سوگواریت کا اظہار ہوا تھا۔ جس کی وجہ ان کی افسانہ نگاری کے علاوہ معرف ٹی وی ڈرامے ''خدا کی بستی'' کی مقبولیت بھی تھی۔ چناں چہ اس موقعے پر کراچی کا شاید ہی کوئی لکھنے والا رہا ہو جو تعزیت کے لیے مرحوم کے گھر پر حاضر نہ ہوا ہو، ان کی تدفین بچوں اور عزیزوں کی انتظار کی وجہ سے کچھ التوا میں رہی تھی۔ ان دنوں ہم جب بھی وہاں حاضر ہوتے ہم نے سحر بھائی کو سوگوار ہی شامل پایا۔ جنازے میں بھی خاصا بڑا ہجوم تھا، لیکن چند گنے چنے لوگ تدفین میں شریک نہ تھے کہ اس دن گورنر سندھ نے صوبے بھر سے اُردو سندھی کے منتخب ادیبوں کو لنچ پر مدعو کیا تھا، لیکن اکثر ادیب شوکت صدیقی کے جنازے کی وجہ سے معذرت کر چکے تھے۔ قبرستان میں سحر بھائی کی عدم موجودگی کا احساس ہوا تو ہم نے انھیں فون کیا کہ معلوم کریں وہ راستے میں کہاں ہیں؟ تھوڑی ہی کوشش سے سحر بھائی نے فون اٹھالیا اور ہمارے استفسار پر بتایا کہ وہ اس وقت گورنر ہاؤس کے لنچ میں شرکت کرنے کے لیے پہنچ چکے ہیں جہاں کراچی سے باہر کے ادیب و شاعر پہنچ چکے تھے، لیکن کراچی کے لکھنے والوں کا انتظار ہو رہا ہے۔ بعد میں جب وہ میٹنگ شروع ہوئی تو سحر بھائی نے کھڑے ہو کر سب سے پہلے شوکت صدیقی کی رحلت پر تعزیتی قرارداد پیش کی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کروائی۔ گورنر نے اعلان کیا کہ شوکت صدیقی کی تمام تحریروں کو یک جا کر کے ان کی اشاعت کا خاص بندوبست کیا جائے اور کراچی کی کسی خاص سڑک کو ان کے نام سے منسوب کر دیا جائے گا۔ پہلے ہمیں بھی سحر بھائی کے اس انتخاب پر شدید حیرت ہوئی تھی، لیکن مزید غور کرنے پر گورنر ہاؤس کے اجلاس میں ان کی شرکت کا جواز سمجھ آیا جہاں ان کی تجویز پر سرکاری طور پر شوکت صدیقی کی رحلت پر تعزیت کا اظہار کیا گیا تھا۔

ان کی شخصیت کا ایک اہم تابندہ پہلو ان کی کتاب دوستی بھی ہے۔

میں نے انھیں عمر کے کسی حصے میں کتاب کے بغیر نہیں دیکھا۔ جب تک بغل میں دو چار کتابیں نہ دبی ہوں ان کا شخصی کردار نکھرتا ہی نہیں۔ جس ذوق وشوق سے وہ کتابیں تلاش کرتے ہیں اور جس بے تابی کے ساتھ انھیں حاصل کر لیتے ہیں، وہ بجائے خود بہت دل چسپ عمل ہے۔ انھیں علم ہوتا ہے کہ پرانی نایاب کتابیں اور رسائل کہاں کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ ان کی تلاش اور جستجو میں وہ جگہ جگہ مارے مارے پھرتے ہیں۔ عمر کے اس حصے میں بھی وہ نہایت پابندی سے اتوار یا کسی بھی تعطیل والے دن صبح ریگل چوک اور صدر کی ان گلیوں کے چکر لگاتے ہیں جہاں پرانی کتابوں کی دکانیں لگتی ہیں۔ یہاں وہ ڈھیر سے اہم اور نایاب کتابیں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر وہ ایک ایک کتاب کو دیکھتے اور ان سے اپنے مطلب اور پسند کی کتابیں چھانٹ لیتے ہیں۔ اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ کتب فروش حضرات خود چاہتے ہیں کہ ان کے پاس آمدہ ہر نیا اسٹاک پہلے سحر بھائی کی نظر سے گزر جائے۔ کراچی کے علاوہ اسلام آباد، لاہور، ملتان وغیرہ کے کتابی مراکز بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ حصولِ کتاب کے اس ذوق کے طفیل سحر بھائی کے پاس کم وبیش پچیس تیس ہزار کتابوں کا وافر ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ جس میں ہر موضوع پر منتخب جواہر پارے شامل ہیں۔ کتابوں کے اس عظیم الشان ذخیرے کے لیے ایک علاحدہ جگہ حاصل کی گئی ہے، لیکن اپنی عدیم الفرصتی کے سبب وہ ان کتابوں کی باقاعدہ کیٹلاگنگ وغیرہ کا بندوبست نہیں کر سکے ہیں، جس کا انھیں افسوس ہے۔ چناں چہ عام شائقینِ ادب سحر بھائی کے ذخیرۂ کتب سے عملاً استفادہ کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں شہر کے بعض اداروں اور مخیّر حضرات پر لازم آتا ہے کہ وہ ان کتابوں کے لیے کسی پبلک ہال میں مناسب اور ضروری فرنیچر اور اسٹاف فراہم کر کے سحر انصاری کے نام اور نگرانی میں باقاعدہ کتب خانہ قائم کریں تاکہ عام لوگ بھی اس علمی ذخیرے سے استفادہ کر سکیں ورنہ اس طرح کے شخصی کتب خانے تادیر دستِ بُردِ زمانہ سے محفوظ نہیں رہ پاتے ہیں۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ سحر بھائی کے مذکورہ کتب خانے کا ایک حصہ شہر کی دہشت گردی کے باعث نذرِ آتش ہو چکا ہے۔ اور اس شہر کی شوریدہ سری میں کل کیا پیش آئے گا کی خجائت کوئی بھی فراہم نہیں کر سکتا۔ چناں چہ بے یقینی کی اس فضا میں سحر بھائی کے کتب خانے کے تحفظ کے لیے کوئی نہ کوئی عملی اقدام ضروری ہو گیا ہے۔

سحر بھائی زندگی کے ہر دور میں خواتین میں خاصے مقبول رہے ہیں۔ یوں بھی درس وتدریس کے شعبے میں طلبہ وطالبات کے درمیان یکساں مقبولیت کا جواز نکل آتا ہے، لیکن اب جب کہ وہ کسی تعلیمی ادارے سے باقاعدہ منسلک نہیں ہیں۔ ان سے رہنمائی حاصل کرنے والی طالبات کی قطار میں کمی دیکھنے میں نہیں آتی۔ شعروسخن کے میدان میں نوآموز خواتین بھی سحر بھائی کی توجہ حاصل کرنے میں لگی رہتی ہیں اور وہ بھی اپنی سرشت کے مطابق کسی کی حوصلہ افزائی میں کمی نہیں آنے دیتے۔ ہم نے انھیں بعض سفید بالوں والی خواتین کے سروں پر بھی دستِ شفقت پھیرتے دیکھا ہے جو غالباً پہلے بھی ان کی شاگردرہ چکی ہوں۔ ایک روز ہم نے یک طرفہ بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے انھیں کریدنے کی بہت کوشش کی کہ خواتین میں مقبولیت رکھتے ہوئے شاید کبھی کوئی جذباتی چنگاری دہکی ہو، لیکن وہ اس قسم کی ہر قیاس آرائی کی سختی سے تردید کر دیتے ہیں اور اس معاملے میں بھی اپنے اناڑی پن پر اصرار کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے جس خاتون سے پہلی محبت کی اسی سے شادی بھی رچالی اور زندگی بھر اس کی توجہ اور محبت سے فیض اُٹھاتے رہے، اور وہی ان کے بچوں کی ماں بھی ہے۔ اس لیے کسی اور طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ ہم جانتے ہیں کہ نظری سطح پر تو ہر مرد کا بیانِ حلفی یہی ہوا کرتا ہے لیکن اس بیان کو غیر مصدقہ قرار دے کر فردِ جرم عائد کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی شہادت تو ضرور درکار ہوتی ہے۔ چناں چہ یہاں بھی بالآخر انھیں شک کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں ان کے اس بیان پر صاد کرتے ہی بن پڑتی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ آدمی خواہ کتنا ہی حلیم الطبع اور صلحِ کل کیوں نہ واقع ہو، زندگی کے کسی نہ کسی تلخ تجربے سے اس کے منہ کا ذائقہ ضرور خراب ہوتا ہے۔ اور بعض ناگوار تجربات کے منفی ردِعمل سے گریز ممکن نہیں ہوتا، لیکن اس باب میں بھی ہم نے سحر بھائی کو کسی کے خلاف گلہ کرتے نہیں سنا۔ ایسا نہیں کہ وہ ذاتی انا کے احساس سے عاری ہوں یا سیلف ریسپیکٹ نہ رکھتے ہوں، بلکہ ہم نے اس معاملے میں بھی ہمیشہ کہیں زیادہ چونکنا پایا ہے۔ وہ دوسروں کے لیے حفظِ مراتب اور حسنِ سلوک کے جذبات رکھتے ہیں تو جواباً اپنے لیے بھی ایسے ہی ردِعمل کی توقع کرتے ہیں کہ یہ ایک فطری خواہش ہے اور ان کے سلسلے میں بھی ہمارا مشاہدہ یہی ہے کہ سحر بھائی کو ہر ادبی اور ثقافتی حلقے میں نہایت ادب واحترام سے دیکھا جاتا ہے، لیکن یہ بات بھی ہمارے ذاتی علم میں ہے کہ بعض مفاد پرست اور سازشی ذہن رکھنے والے عناصر ان کی طبیعت کی سادگی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور انھیں ایکسپلائٹ کرنے سے کبھی نہیں چوکتے اور وہ جانتے بوجھتے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اگر انھیں کسی جگہ عزتِ نفس کے مجروح ہو جانے کا ذرا بھی اندیشہ ہو جاتا ہے تو وہ پہلے تو خود ہی گریز پائی اختیار کرتے ہیں۔ ورنہ بہ صورتِ دیگر عزتِ نفس کے تحفظ میں ڈٹ جاتے ہیں خواہ اس سے کیسا ہی گراں قدر نقصان ہوتا کیوں نہ نظر آ رہا ہو۔ ایسے ہی دو ایک خاص واقعات اور معاملات کے سلسلہ میں جب ہم نے ان سے اصل حقیقت جاننی چاہی تو سحر بھائی نے ہمارے اصرار پر تسلیم کیا کہ ہاں انھیں بھی اپنے بعض ہم عصروں کے مفاد پرستانہ، سازشی ساز باز اور حاسدانہ رویے کے نتیجے میں ذہنی صدمے اور اذیت سہنی پڑی تھی۔ ''ان میں سے ایک ہم عصر نقاد اور دوسرے ہم عصر شاعر تھے، جن سے دوستانہ تعلقات بھی بہت تھے، لیکن دونوں حضرات انتہائی خودغرض، مفاد پرست اور سازشی جوڑ توڑ کے ماہر تھے اور انھوں نے حاسدانہ جذبات کے تحت مجھے بھی اپنا تختۂ مشق بنانا چاہا تھا، لیکن میں نے اذیت سہنے کے باوجود انھیں معاف کر دیا تھا اور اب جب کہ وہ دونوں زندہ نہیں ہیں، میں ان باتوں کا تذکرہ تک کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ میری دُعا اب بھی یہی ہے کہ خدا مرحومین کو غریقِ رحمت فرمائے اور بس۔ زندہ باشی سحر بھائی زندہ باشی۔ کہ ان ہی باتوں سے ہماری زندہ روایت کا سلسلہ قائم ودائم چلا آتا ہے۔

جدت پسند شاعری

رضی مجتبیٰ
(کراچی)

سحر انصاری کے دو شعری مجموعے ''نمود'' اور ''خدا سے بات کرتے ہیں'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں کی شاعری اور زیرِ تعبیر و تشریح موجودہ نظموں کے مطالعے کے بعد بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک جدید یا جدت پسند (میں دونوں میں کوئی فرق روا رکھنے کا قائل نہیں ہوں) شاعر ہیں تاہم ان کی جدت پسندی روایت سے یوں بغاوت نہیں کرتی جیسے اور بہت سے، خصوصاً نئی نسل کے شعرا کی شاعری کرتی ہے۔ وہ روایت سے گزر کر روایت سے گزرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم ان کی نظموں پر بات کریں ہمارے لیے اچھی طرح اس بات سے آگاہ ہونا لازمی ہے کہ روایت اور جدت میں یا اس کی آئیڈیالوجی میں کیا فرق ہے۔

میں نے سیکڑوں جدید نظمیں پڑھیں ہیں۔ اکثر شعرا کی نظموں میں واضح طور پر شاعر کا انفرادیت طرازی کی مثال بن جانے کا خواب صاف نظر آتا ہے۔ یہ شعرا اتنی سی بات نہیں سمجھ پاتے کہ منفرد ہونا اور جدید ہونا ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے جدیدیت اور روایت کے فرق کو انتہائی سنجیدگی سے پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ اس فرق کو بے شمار مغرب اور مشرق کے نقادوں نے تفصیلاً بیان کیا ہے، لیکن میں اس کے باوجود اپنی observations کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ تو اس لیے کہ یہ اصطلاح اب اتنی ہی پرانی ہو گئی ہے جتنی کہ ہوائی جہاز یا وائرلیس کی ایجاد۔ جدیدیت کا سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ جدید شاعری کا اپنا ایک syntax ہے۔ اسے ہم Free Verse بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن آزاد نظم کوئی نئی چیز نہیں۔ لہٰذا ہم کو جدید شاعری اور روایتی یا غیر جدید شاعری کے فرق کو محض ترکیبِ نحوی پر منحصر نہیں سمجھنا چاہیے۔ ٹی ایس ایلیٹ پر اسی معیار پر بہت سی شاعری کو غیر معیاری قرار دینے کا الزام ہے۔ جدیدیت پسندی کی پرکھ دراصل محض ترکیبِ نحوی میں نہیں، بلکہ نظم میں استعمال ہونے والے امیج اور سمبل میں مضمر ہوتی ہے۔ جدیدیت پسند شاعری کا سنہرا اصول یہ ہے، Dont tell me, show me. یعنی مجھ سے بیان مت کرو، مجھے دکھلاؤ۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ جدیدیت پسند شاعر کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے تجربے کو بیان نہ کرے، بلکہ ہم کو اس تجربے سے دوچار کرے۔ اس کی مثال Cubist پینٹنگ سے دی جا سکتی ہے، جس میں کسی بھی شے کو کئی زاویوں سے دیکھا جاتا ہے۔ انگریزی شاعری میں اس کی بہترین مثال ٹی ایس ایلیٹ کی نظم ''دی ویسٹ لینڈ'' کے آغاز میں پائی جاتی ہے۔ اس نظم کے پہلے دو مصرعے چوسر، فریزر اور جیسی واتسن کے تناظر کو اپنے اندر سموئے ہیں۔ جدیدیت پسند شاعری کی آئیڈیالوجی کا تقاضا ہے کہ خیال کو بجائے ایک منطقی تسلسل میں پیش کرنے کے اسے فی الفور پیش کیا جائے۔ اس بات کو جان لینے کے بعد free verse میں کسی خیال یا تجربے کو پیش کرنا ایک کارِ رائگاں بن جاتا ہے اس لیے کہ نہ وہ شاعری کی صنف میں شمار کیا جا سکتا اور نہ نثر کی۔

بہت سے لوگ نثری نظم کو شاعری کی صف سے خارج کرتے ہیں اور قافیائی نظم کو آنکھ بند کر کے شاعری مان لیتے ہیں۔ پاؤنڈ کے نزدیک یہ جدیدیت پسند شاعری کے نظریے کے بالکل منافی ہے۔ شاعری کا انحصار اس خصوصیت پر ہوتا ہے کہ نہ تو وہ الفاظ کی ترکیبِ نحوی، نہ کلام کی موزونیت نہ ڈکشن اور نہ vocablary سے۔ شاعری کی سب سے اہم کسوٹی ایجاد یا originality ہوتی ہے، جسے سحر انصاری تازہ کاری کہتے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کے بہ قول شاعری کو ایک خالص امیج کی طرح ہونا چاہیے نہ کہ ایک تمثیل کی طرح۔ وہ اپنی نظم ''دی ویسٹ لینڈ'' میں اس اصول پر قائم رہا، لیکن اپنی نظم Four Quartets میں تجربات کی تشریح میں الجھ کر رہ گیا۔

جدیدیت اور روایت میں جو سب سے واضح فرق ہے، وہ یہ ہے کہ جدیدیت داخلیت کو اہمیت دیتی ہے اور روایت معروضیت کو۔ جدیدیت کا تعلق انفرادی خیالات اور آرا سے ہوتا ہے۔ اس میں کسی ایک بات پر ہی سچائی منحصر نہیں ہوتی، بلکہ کئی مختلف خیالات پر مبنی ہوتی ہے جو بظاہر متضاد بھی ہوتے ہیں۔ اس کا سبب روایت میں معروضیت کی موجودگی پر ہے۔

جدیدیت اور روایت میں ایک اور فرق یہ ہے کہ جدیدیت میں کلاسیکل ہیئت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی جب کہ روایت میں ہیئت کا ہونا لازمی ہے۔ ورجینیا وولف کا ناول ''لائٹ ہاؤس'' اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ یہ سارا ناول کرداروں کے داخلی مشاہدات پر مبنی ہے۔ بیانیہ بھی شعور کی رو کے تحت لکھا گیا ہے۔ اس ہی طرح سیموئل بیکٹ کا مشہورِ زمانہ ڈراما Waiting For Godot بھی جدیدیت کا شاہ کار سمجھا جاتا۔ اس ڈرامے میں نہ زمان و مکاں کا تعین پایا جاتا ہے نہ Godot جس کے انتظار میں ڈراما لکھا گیا ہے۔

مغرب کی جدید شاعری کا نقطۂ عروج شاید ڈلن ٹامس سے وابستہ ہے جب کہ ہمارے ہاں جدیدیت پسندی کی مثالیں کئی شعرا میں پائی جاتی ہیں، لیکن کسی کے یہاں نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی نہیں۔ اس کی وجہ شاید ہماری شاعری میں تغزل کی لازمیت ہے۔

اب تک ہم نے جدیدیت پسند نظریے اور روایت سے اس کا موازنہ کیا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظریے کے تحت شاعر کی کیا حیثیت ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اب بھی شاعروں پر جدیدیت پسندی کی آئیڈیالوجی اور روایت کے تصادم کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔ مغرب میں اس اثر نے فن برائے فن کی تحریک کو فروغ دیا اور نقاد بھی شاعری میں اسی اثر کے تحت اسلوب اور جمالیات پر

زور دیتے رہے۔اس کے نتیجے میں جمالیاتی کلچر کی ترویج ہوئی، لیکن بعد میں جدت پسندی نے شاعری میں انسان کو فلسفۂ وجودیت کے تناظر میں دیکھنے پر اصرار کیا اور خصوصاً اس انسان پر جو بہ قول ہائیڈیگر کے فلسفے کے مطابق اس انسان پر جو thrownness-into - being کا مارا ہوا تھا اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ انسان اس دنیا میں پھینک دیا گیا ہے (flung-into-being)۔اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوا کہ انسان باہر کی دنیا سے اور اطراف سے کوئی تعلق قائم کر ہی نہیں سکتا۔یہی نہیں بلکہ انسان کی آفرینش اور اس کے منتہائے زیست کو طے کرنا ممکن ہی نہیں۔یعنی انسان وہ مخلوق ہے جس کو تاریخ سے کوئی علاقہ ہی نہیں۔تاریخیت کی یہ نفی جدیدیت پسندی کی رو سے دو مختلف صورتیں اختیار کرتی ہے۔اوّل، انسان اپنے تجربے کے زندان میں قید ہے اور اس سے باہر نہیں نکل سکتا اور دوم یہ کہ انسان کی اپنی بھی کوئی ذاتی یا نجی تاریخی حیثیت نہیں۔اس کا وجود لایعنی ہے اور اس بے معنویت کی کوئی تہہ بھی نہیں۔اس قسم کی شاعری اور فکشن میں بسا ہوا مورال یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان کا مقسوم اور اس کی condition کیا ہے۔آج کا انسان ہمیشہ سے یوں ہی تھا اور ہمیشہ یوں ہی رہے گا۔مگر ہم نے دیکھا کے بڑے ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں اس نظریے کا بطلان کیا، مثلاً جیمز جوئس، کافکا نے اپنی شاہ کار تخلیقات کو تاریخ سے وابستہ کیا اور جوئس نے زمان و مکاں اور تہذیب کے حوالوں کے لیئے ڈبلن کا انتخاب کیا اور کافکا اور میوزل نے Hapsburg Empire کا۔گو ان زمانی مکانی اور تہذیبی حوالوں کو محض پس منظر کے طور پر استعمال کیا گیا۔یہ حوالے فن کارانہ ارادت یا انتخاب کے ذیل میں بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔انسانی وجود کا تاریخ سے جدا ہو کر شکست و ریخت کا خود بھی شکار ہونا اور اطراف کی دنیا کو بھی اس میں مبتلا کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ٹی ایس ایلیٹ نے اس نقطے کو اپنی شاعری میں جس طرح وضع کیا ہے، وہ یوں ہے:

Shape without form,shade without colour,

Paralysed force, gesture without motion

اس کسی قدر طویل تمہید کی سحر انصاری کی نظموں کی تشریح و تعبیر کے لیے ضرورت تھی، کم از کم میں نے تو ایسا ہی محسوس کیا۔میں ان کے مجموعے ''خدا سے بات کرتے ہیں'' پر ایک تفصیلی مضمون لکھ چکا ہوں۔اس مضمون میں ان کی نئی نظموں پر بات کرتے ہوئے ان کی تمام شعری کاوشیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں، ان پر بارِ دگر غور کرنا ضروری ہے اس لیے کہ اس سے ان کی شاعری کو ہم نے جو کہا ہے کہ وہ جدیدیت پسندانہ شاعری ہے، اس کو برحق قرار دیا جا سکے۔

ان کی نظموں کے موضوعات کا محیط بہت بڑا ہے اور عصرِ حاضر کے انسان کی داخلی اور خارجی صورتِ حال کو سحر انصاری نے اپنے وسیع اور مختلف النوع مطالعے سے بڑی richness عطا کی ہے۔ان کی نظموں میں آپ مختلف علوم سے کشید کی ہوئی گوناگوں کیفیتیں دیکھ سکتے ہیں، جن سے آج کا انسان دوچار ہے۔یہی خاص بات ہے ان کی جدیدیت پسندی میں۔ان کی حسیت اس دور کی ہر شے کو ایک جمالیاتی ہالے میں لیے ہوئے ہے۔ان کی نظموں میں تلمیحات کی بڑی اہمیت ہے۔''خدا سے بات کرتے ہیں'' میں بُرجِ بابل، نمرود، فرزندِ آذر، حمورابی، بخوکدنصر، سب اس دور کے chaotic فریم میں ایسی پرچھائیاں ہیں جو ماضی، حال اور مستقبل کو مربوط کرتی ہیں، لیکن یہ سمجھنے کے لیے اس سیاق و سباق کا ادراک لازم ہے جس میں ان کرداروں اور بُرجِ بابل کی خیر و شر سے وابستگی تھی یا اب تک ہے۔دہشت گردی، قتل و غارت اور انسان کی بے قدری کے اس دور پر سحر انصاری کی گرفت ملاحظہ کیجیے:

مقدر اس زمیں کا وقفِ نیرنگِ زمانہ ہے
فراتِ اشک میں یا دجلۂ خوں میں نہانا ہے

اندھیروں کے شکنجوں میں ابھی تک کیوں اجالے ہیں
جو مظلوموں کی لاشوں پر بھیانک رقص کرتے ہیں
تمدن ساز نقا ّشوں کی تخلیقات کے ہوتے
سگانِ خیرہ سر کیسے گلی کوچوں میں آ پہنچے

کروڑوں رینگتے انساں ہیں اب بھی نعرہ زن ہر دم
کوئی آواز اب جاتی نہیں کیوں تیری ہیکل تک
حریری شبنمی لہجوں کی تجھ کو کیا ضرورت ہے
تجھے تو آگ کے شعلوں سے آتا ہے سخن کرنا
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں
(خدا سے بات کرتے ہیں)

یہ خدا سے مکالمے کی خواہش بُرجِ بابل پر ہی کیوں پوری ہو سکتی ہے؟ اس سوال میں ان گنت سوالات پوشیدہ ہیں ایسے سوالات جو اپنی سرشت میں گلوبل کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔یہ سوالات خدا سے ایک شکوے کی حیثیت رکھتے ہیں اور انسان کی نیکی سے لاتعلقی کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں، اور کافکا کی زبان میں اس total impotence کی جس کا ماڈرن انسان شکار ہے۔کسی بھی دور کے ناسمجھ میں آنے والے جبر کے آگے یہ سوالات سحر انصاری کی شاعری میں ہمیں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ان سوالات کو پڑھ کر ہمیں Benjamin کا یہ قول یاد آتا ہے کہ اس قسم کے وژن کی روشنی میں یہ احساس ہوتا ہے کہ تاریخ کی رو بتدریج eternal کی طرف سفر نہیں کر رہی، بلکہ ایک ناگزیر شکست و ریخت کی جانب۔لیکن سحر انصاری اپنی شاعری کو حتمی طور پر جدیدیت کے منفی نظریے سے بچا کر اسے مثبت جہت عطا کرتے ہیں۔ان کی نظم ''عام آدمی'' کی کاٹ بہت ہی معنی خیز ہے۔

اب میں ان کی نظم ''یوحنا'' کے بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ نظم ''خدا سے بات کرتے ہیں'' میں اٹھائے جانے والے سوالات کا جواب ہے۔عیسائیت میں یوحنا کو ایک ایسے مسیحا کی طور پر مانا جاتا ہے جس نے حضرت عیسیٰ کی دنیا میں آنے کی

بشارت دی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا ذکر قرآن میں بھی کیا گیا ہے، لیکن سورۃ مریم پڑھیے تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ قرآن شریف میں حضرت یحییٰ کا تذکرہ ہرگز بھی عیسائیوں کے یوحنا کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ اس نظم میں سحر انصاری نے تلمیح، علامت اور تمثیل کا بہت خوب صورت استعمال کیا۔ لیکن اپنے حتمی تجزیے میں یوحنا مختلف ادوار میں مختلف اقدار کی علامت ہیں۔ اس نظم کے قابلِ تعریف اور قابلِ توجہ حصے ذیل میں درج ہیں جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یوحنا خیر و برکت کا ایک سمبل ہیں اور مختلف ادوار میں مختلف حیثیتوں سے ظاہر ہوتے ہیں:

جو کہہ رہے ہیں کہ عقل و دانش کی طاقتیں خام ہو چکی ہیں
بلند بینی کو پست کرنے کی سازشیں عام ہو چکی ہیں
وہ میری آمد سے بے خبر ہیں
انھیں خبر دو میں آ گیا ہوں

میں اپنی آزمائشوں کے ہجوم سے دور دیکھتا ہوں
کہ رب الارباب اپنی ہیکل کے
کنگرے پر کھڑا ہوا مجھ سے کہہ رہا ہے
ہلاک ہو جا، ہلاک ہو جا
فصیلِ خود آگہی سے گر کر ہلاک ہو جا

میں اب بھی کانٹوں کا تاج پہنے ہوئے ہوں
اور میرے دست و پا میں
مظالم و مصلحت کی کیلیں چبھی ہوئی ہیں

اور آج اس جاں کنی کے عالم میں دیکھتا ہوں
کہ اپنے اپنے وجود کی اعتراف گاہوں میں
اپنے اپنے گناہ کی بازگشت سن کر
ہلّو یاہ! کہنے والے
خجالت و انفعال کے شرمسار فرزند
اپنی اپنی صلیب اٹھائے ہوئے مرے پاس آ رہے ہیں

شاعری میں روایت سے حذر ممکن نہیں۔ اور کوئی بھی روایت مطلق نہیں ہوتی، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جاتی ہے۔ اس بات کو مان لیا جائے تو یہ بات بھی ماننی پڑتی ہے کہ شاعر کی زندگی کے کوئی معنی نہیں ہوتے جب تک کہ اس کی زندگی کسی شے سے مربوط نہ ہو، کسی absolute شے سے۔ سحر انصاری اس رمز کو خوب جانتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری اپنے دور کی عکاس بھی رہتی ہے اور اپنے دور کے لیے ایک سوالیہ نشان بھی۔

☆

- بقیہ -

اکیس ویں صدی اور ادیب

(Lingle نے اس تصور کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک پوری کتاب The Rise and Decline of the Asian Century تحریر کر دی ہے، یہ کتاب نہ صرف ہمیں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کا جائزہ لینے پر مائل کرتی ہے، بلکہ ہماری متعدد خوش فہمیوں کو دور کرنے کا بھی سامان مہیا کرتی ہے۔

بعض مفکروں نے جن میں نوم چومسکی بھی شامل ہیں، اکیس ویں صدی کو ذہن اور زبان کی صدی Century of the Mind and Language قرار دیا ہے۔ گزشتہ صدی کے اختتامی مراحل میں ذہنِ انسانی کے مطالعے کی جو نئی راہیں دریافت کی گئی تھیں، ان پر قابلِ قدر پیش رفت ہو رہی ہے۔ اسی طرح زبان کا مسئلہ بھی ہے۔ ہمارے اپنے معاشرے میں لسانی تعصّبات کو ذرا سی دیر میں ایسی ہوا دے دی جاتی ہے کہ سارے اچھے اقدامات خاک ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایک طرف یہ سوال ہر ادیب کے ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کس لسانی معاشرے کے لیے کس زبان میں لکھا جائے؟ پھر اس نوع تحقیقات بھی خاصی روح فرسا ہیں کہ چند بڑی زبانوں کو چھوڑ کر دنیا کی متعدد زبانیں ایک صدی کے اندر اندر یا تو ختم ہو جائیں گی یا محض بول چال کی زبان بن کر رہ جائیں گی۔ ادیب کا یہ دعویٰ اپنی جگہ درست ہے کہ:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

لیکن اگر اظہار کے سب سے بڑے اور مؤثر ذریعے کا یہ حشر ہونے والا ہے تو اس ''دوام'' کی گواہی دینے والے کتنے اور کہاں رہ جائیں گے۔

میری معروضات سے ایک تاثر یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنے مقامی اور ملکی مسائل پر کم توجہ دی ہے اور عالمی تناظر کو زیادہ پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کیوں کہ اب Global Village اور ذرائع ابلاغ کی تیز رفتاری کے زمانے میں کوئی ملک بھی یکہ و تنہا جزیرہ بن کر نہیں رہ سکتا۔ ہمارے فکر و دانش کے بیشتر حوالے اور ادب کی زیادہ تر تحریکوں کا تعلق مغرب ہی سے رہا ہے، اس لیے ہم نے یا تو انھیں رد کیا ہے، یا قبول کیا ہے۔ بہر حال لاتعلق اور غیر جانب دار نہیں رہ سکے۔

کارِ ذات مشکل ہے

مبین مرزا
(کراچی)

کہا جاتا ہے کہ سچا شاعر اپنے شعر میں دراصل خود ہی کو لکھتا ہے۔ اب اس بحث میں پڑے بغیر کہ ادب و شعر کے مطالعے میں اس نوع کے کلیے کس درجے مفیدِ مطلب ہوتے ہیں، بلکہ ہوتے بھی ہیں کہ نہیں — میری ناچیز رائے میں یہ بیان بہرحال ادھورا ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ ہر سچا اور باشعور شاعر اپنے شعر و سخن میں احوالِ ذات کے ساتھ ہی ساتھ اپنے عصر کی فکری و جذبی کیفیت کو بھی گرفت کرتا ہے، تو شاید ہم کسی بھی شاعر اور اس کے فن کا مطالعہ قدرے بہتر پیمانوں کے ساتھ اور ذرا زیادہ بڑے کینوس پر کر پائیں گے۔ اس لیے کہ ہر زندہ تخلیقی تجربے کی مثال اُس شجر کی سی ہوتی ہے جس کے سارے جیتے جاگتے اور چہکتے مہکتے پھول تو بے شک اس کی شاخوں پر، ہوا میں یعنی زمین کے اوپر طلوع ہوتے ہیں لیکن اُس کی نمو کا سارا کام زمین کے اندر پیوست اس کی جڑیں کرتی ہیں۔ فن کار اور اُس کے عصر کے مابین ارتباط کی نوعیت کچھ ایسی ہی ہوا کرتی ہے اور اسی کی بدولت اُس کے فن کو ماورائے عصر زندہ رہنے اور سفر کرنے کی قوت عطا ہوتی ہے۔ سحرؔ انصاری کی شاعری فن کی اسی قوت کا ایک بلیغ نمونہ ہے۔

سحرؔ انصاری سے میرے قرب و موانست کا زمانہ کم و بیش رُبع صدی کو محیط ہے، لہٰذا کم سے کم اتنی بات تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کما حقہٗ نہ سہی مگر اُن کی شخصیت کے رنگوں، مزاج کی کیفیات اور اُفتادِ طبع کے کچھ پہلوؤں کا شناسا میں ضرور ہوں۔ چنانچہ یہ جو اُنھوں نے ازراہِ التفات اپنے اس دوسرے شعری مجموعے پر لکھنے کی ذمے داری مجھے سونپی تو میرے ذہن نے ان کے فکر و فن کی بابت متعدد سوالوں پر سوچنا شروع کر دیا — ان میں ایک سوال ضمنی یا غیر فنّی نوعیت کا بھی ہے، لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر اسی سوال کو بنیاد بنایا جائے تو گمان غالب ہے کہ ان کے فن کی تفہیم کا مرحلہ ہم پر قدرے آسان ہو جائے گا اور وہ سوال یہ ہے کہ سحرؔ انصاری نے اپنا دوسرا شعری مجموعہ مرتب کرنے میں اس قدر تاخیر سے کام کیوں لیا؟

حضرتِ مشتاق احمد یوسفی نے افتخار عارف کے دوسرے مجموعے کی اشاعت کے موقعے پر لکھا تھا کہ افتخار عارف کے پہلے مجموعے ''مہرِ دو نیم'' اور ''حرفِ باریاب'' کے درمیان دس سال، ایک براعظم، ہزاروں میل کی مسافتیں، ایک خوابِ نیم روز اور خود افتخار عارف حائل تھے۔ سحرؔ انصاری کے سلسلے میں یہ دورانیہ دس نہیں بلکہ تیس برس سے بھی زیادہ کا ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سارے خارجی عوامل کے ساتھ، اس مسئلے میں ایک عنصر داخلی نوعیت کا بھی شامل رہا ہے اور وہ ہے آگہی۔ وہ آگہی جس میں من جملہ دیگر عناصر و عوامل کے ایک خاص حصہ شکستِ خواب کا بھی ہوتا ہے۔ سحرؔ انصاری کے یہاں مسئلہ محض ایک خواب کا نہیں بلکہ ایک سلسلۂ خواب کی شکست کا نظر آتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ کون سے خواب تھے؟

یہ وہ خواب تھے جو آدمی کے طرزِ زیست کو متعین کرتے ہیں، اس کے ذہن کی تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں یا اُس کی قلبِ ماہیت کا سبب بنتے ہیں۔ آگہی کا یہ عمل کسی بھی فن کار کے احساس کا سب سے عمیق، وقیع اور نازک تجربہ ہوتا ہے۔

سحرؔ انصاری جانے پہچانے آدمی ہیں۔ اس شہر کی اکثر و بیشتر ادبی تقاریب میں کسی نہ کسی عنوان ان کی شرکت لازمی سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ رہی تھی کہ مشفق خواجہ مرحوم نے اپنے ایک کالم میں انھیں ''شہر انصاری'' کہہ کر پکارا تھا۔ ان کی یہ مصروفیت آج کی نہیں ہے بلکہ گزشتہ لگ بھگ دو دہائیوں سے تو میں انھیں اسی طرح قلندرانہ زیست کرتے دیکھ رہا ہوں۔ اور ان کی یہ مصروفیت کچھ اس شہر کی ادبی تقاریب پر ہی موقوف نہیں، گاہے بہ گاہے ان کا ملک کے دوسرے شہروں میں بھی آنا جانا رہتا ہے، دوسرے شہروں ہی کے نہیں، دوسرے ملکوں کے دورے بھی ہوتے ہیں۔ ادبی تقریب نہ ہو تو شہر بھر کی کتابوں کی دکانوں کا پھیرا، آرٹس کونسل میں ڈیرا یا پھر کسی دوست کے آستانۂ درویش پر کبھی مختصر اور کبھی طویل بسیرا اور اس کے لیے:

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

کا بھی ایسا کوئی التزام نہیں۔ بس یوں ہے کہ:

آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

والا معاملہ چل رہا ہے اور مقصود تو صرف ملاقات ہے، کچھ اور نہیں۔ گویا زندگی جو ہے:

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

کی تفسیر بنی ہوئی ہے۔ تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس سب کی آخر کوئی معنویت بھی ہے، کوئی ایسی معنویت جس کا تعلق سحرؔ انصاری کے بطونِ ذات سے ہو اور جو ان کے یہاں زندگی کی ماہیت کو بیان کرنے کا حوالہ بن سکے — یا یہ سب محض سیر سپاٹا اور شغلِ وقت گزاری اور تفریحِ طبع کا سامان ہے۔ میرا خیال ہے کہ سحرؔ انصاری کی بگولہ مزاج زندگی دراصل ان کے نہایت گہرے باطنی تجربے کو آشکار کرتی ہے۔

سحرؔ انصاری دوست دار آدمی ہیں۔ وہ مجلسی مزاج رکھتے ہیں۔ اُن کے ملنے والوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ اُن کی دلچسپی کے حوالوں کا دائرہ بھی خاصا پھیلاؤ رکھتا ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں اور ایک آدمی، کسی بھی آدمی کے طرزِ زندگی کو سمجھنے اور جاننے کا بنیادی حوالہ بن سکتی ہیں — لیکن یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یہ سارے پہلو ایک شخصیت کا ظاہری رُخ سامنے لاتے ہیں، اُس کی باطنی جہت کو ہم پر نہیں کھولتے۔ اور آدمی کو (بالخصوص سحرؔ انصاری ایسے آدمی کو) ہم اس کے ظاہر پر انحصار کر کے جان ہی نہیں پاتے۔ اس لیے کہ ایسے لوگوں کے یہاں دراصل اظہار خود کسی اخفا کا پردہ بن جایا کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سحرؔ انصاری جیسا آدمی کہ جسے قدرت نے تخلیقی جوہر

ودیعت کیا، بصیرت دی، دلِ گداختہ سے نوازا اور جس نے خاندانی تہذیب اور سماجی اخلاق سے اپنے احساس کو تہ دار بنایا اور مطالعے سے فکر کو جلادی اور نظر کی گہرائی پائی، وہ جب اس نوع کی سماجی سطح کی زندگی گزارتا ہے تو ایسا محض مجلسی مزاج کی وجہ سے نہیں ہوتا، ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ یہ مسئلہ اُس کے بطونِ ذات سے تعلق رکھتا ہے اور اُس کے ذہنی رویے کو متعین کرنے اور مزاج کو رُخ دینے کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ اس مسئلے کی نوعیت کو سمجھنے کا مطلب ہے، ایک فن کار کے تخلیقی جوہر کو سمجھنا اور اُس کی معنویت کو پانا۔ اور یہ جو شے تخلیقی جوہر کہلاتی ہے، اسے کسی لگے بندھے قاعدے کلیے سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ انسانی فطرت کی طرح یہ جوہر بھی بہ یک وقت اظہار و اخفا کا اپنا ہی قرینہ رکھتا ہے اور مختلف مراتب میں ظہور کرتا ہے۔ اس کا ہر مرتبہ خود ایک بڑی وسعت کا حامل ہوتا ہے، لہٰذا اس کی سیاحت کارِ سہل ہرگز نہیں۔ البتہ اہلِ نظر ایک بات کہتے آئے ہیں کہ ہر تخلیقی جوہر کی بنیاد کسی ایک مرکزی نکتے پر استوار ہوتی ہے۔ اسی مرکزی نکتے کو ہم تخلیق کار کا بنیادی مسئلہ بھی کہہ سکتے ہیں — وہ مسئلہ جو اُس کے فن کا جواز بنتا اور اُس کی صورت گری کرتا ہے۔

سحر انصاری کا تعلق اُس نسل سے جس کے اوائلِ عمر کے کتنے ہی خوابوں کا سلسلہ برصغیر کی آزادی اور تقسیم سے کسی نہ کسی طور جڑا تھا۔ نئے ملک کی نئی آب و ہوا اور فضا میں یہ نسل پروان چڑھتی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے خواب بھی مستحکم اور توانا ہوتے جاتے تھے۔ لیکن پھر ایک حادثہ ہوگیا — حادثوں کی اپنی ایک منطق ہوا کرتی ہے اور ضروری نہیں کہ کسی فرد کی ذاتی منطق سے تقدیر و تاریخ کی منطق کی کوئی ظاہری مطابقت بھی قائم ہو جائے۔ خیر، تو یوں ہوا کہ یہ نسل بلکہ اس کے بعد کی بھی نسل تو آگے بڑھتی چلی گئی مگر وہ جو خوابوں کا ایک سلسلہ ان کے ساتھ تھا، وہ کہیں پیچھے رہ گیا یا ٹوٹ گیا۔ خوابوں کا مسئلہ یہ ہے کہ کاشت تو آسانی سے ہو جاتے ہیں لیکن اگر آبیاری نہ ہو پائے تو مرجھانے لگتے ہیں یا ٹوٹ جاتے ہیں۔ مجھے یہاں اپنی سیاسی تاریخ لکھنی ہے اور نہ ہی تاریخ کے اوراق میں درج ہزیمتوں کو شمار کرنا ہے کہ یہ نہ تو میرا منصب ہے اور نہ ہی میری گفتگو کا سرِدست موضوع۔ میرا مقصود تو محض اس مرحلۂ فکر کی نشان دہی ہے جہاں سروں پر خاک پڑی تھی اور دلوں کو درد ملے تھے۔ خیر، وقت کا کیا ہے، گزرتا ہے، گزر جائے گا کے مصداق زندگی اپنی راہ پر آگے بڑھتی رہی کہ اُسے تو بڑھتے ہی رہنا ہوتا ہے لیکن خوابوں کی مسیحائی نہ ہو پائی — اور شاید ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ سحر انصاری کی شاعری اسی مسئلے کی نسبت سے ہم سے کلام کرتی ہے لیکن محض اُن کے ذاتی نہیں بلکہ پوری نسل کے تجربے اور احساس کے تناظر میں:

میں وہ مسافرِ دشتِ غمِ محبت ہوں
جو گھر پہنچ کے بھی سوچے کہ گھر نہیں آیا

☆

کسی کو ربطِ مسلسل کا حوصلہ نہ ہوا
مثالِ دودِ پریشاں ہم اپنے گھر میں رہے

☆

اُداس جس نے رکھا ہے تمھاری آنکھوں کو
اسیر ہم بھی اسی خوابِ رائگاں کے ہیں
نہیں ہے کوئی بھی منزل اگر مری منزل
تو پھر یہ پاؤں تلے راستے کہاں کے ہیں

یہ مضمون ایک گل کا تو نہیں بلکہ دُکھ کا ہے، مگر ہے ایسا کہ شاعر کا حساس دل اور مضطرب جاں اپنے اظہار کے لیے اسے سو رنگ سے باندھنے پر آمادہ ہے اور ستم یہ کہ سو رنگ سے باندھ کر بھی اضطراب کم ہوتا ہے اور نہ ہی دلِ بے قرار کو قرار آتا ہے۔

خوابوں کی ٹوٹ پھوٹ، خوابِ رائگاں کی اسیری، بے گھری اور بے منزلی کے مستقل احساس نے سحر انصاری کے بطونِ ذات میں دو طرح کی تبدیلیاں پیدا کیں — پہلے تو انھیں خود اپنے رُوبہ رُو لا کھڑا کیا ہے اور یوں کہ اُن پر تنہائی کا شدید احساس منکشف ہوا۔ اب سے پہلے گداز دل اور رومانی مزاج جواں سال شاعر نے زندگی کا، جذبوں کا اور تنہائی کا جو تجربہ کیا تھا، اس میں ذاتی اور جذباتی طرزِ احساس کا ایک خاص دخل رہا تھا۔ کسی کی بے التفاتی، عدم توجہی یا کم نگہی نے ہجر کا کرب تو بے شک زندگی میں جگایا تھا لیکن اُسے وحشت نہیں بننے دیا تھا مگر اب یہ صورتِ حال بدل چکی تھی۔ اب یہ ہجر محض ایک شخص سے منسوب نہیں رہا بلکہ ایک معاشرے اور ایک نسل اور اُس کے پورے عہد کے ہجر میں بدل چکا تھا۔ چنانچہ اب شاعر اپنے دل میں اور اپنی خلوت میں تنہائی کا رنج نہیں جھیل رہا تھا بلکہ ہنستے گنگناتے اور بہت آباد شہر میں تنہائی کی اذیت سے دوچار تھا:

گھر کی تنہائی بھی کرب انگیز ہے لیکن سحر
کوئی ہنستے گنگناتے شہر میں تنہا نہ ہو

☆

بہت آباد ہے یہ شہر پھر بھی
سحر اس شہر میں تنہا بہت ہے

☆

کہہ رہا ہے کوئی بے نام ستارہ سرِ شام
ساری دُنیا کی ہوس ناک نگہ سے بچ کر
اپنے کمرے کی اداسی سے رہیں محوِ کلام
گھر جسے کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ ''سکونت کی مشین''
اور مشینیں نہیں تنہائی مٹانے والی
بس یہی بات تھی اس رات سنانے والی

(الف لیلہ کی ایک رات)

تنہائی عہدِ جدید کے انسان کی تقدیر ہے جس سے مفر کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ لیکن عصرِ حاضر کا یہ خرابہ ہماری دنیا کے سماجی مسائل، زمینی

حقائق اور انسانی ابتری کا جو نقشہ پیش کرتا ہے، وہ تنہائی کے اس احساس کو سہ چند کر دیتا ہے۔ تکوینی حقائق پر ایمان اور رجائیت پر ہزار یقین کے باوجود ایسے میں معاشرتی، سیاسی، تہذیبی اور انسانی اخلاق واقدار پر اعتبار قائم رکھنا کارِ دارد ہو جاتا ہے۔ اور پھر وجودی تجربہ زندگی کی سب سے بڑی سچائی بن جاتا ہے۔ اضمحلال کا جان لیوا احساس آج کی انسانی زندگی کی ناگزیر حقیقت بن گیا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو اضمحلال اور تنہائی کا یہ احساس انسان کا ذہنی تجربہ ہے لیکن آج کا تخلیقی فن کار اپنے احساس کی شدت کے زیرِ اثر اسے وجودی سطح پر برتتا اور جھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس تجربے کی نوعیت ایک حد تک Existentialism کی بیان کردہ وجودی لایعنیت اور تنہائی سے مماثل نظر آتی ہے۔ لیکن میرا احساس یہ ہے کہ ذہنی اور فکری سطح پر سحؔر انصاری وجودیت کو فلسفے کی حیثیت سے خواہ کچھ بھی جانتے ہوں لیکن اس کے افکار و نظریات اور اس کے اثرات اُن کے یہاں مردم گزیدگی اور دنیا سے بیزاری کے رویے کے طور پر نظر نہیں آتے۔ کیرکے گارد نے زندگی کو کھوکھلی اور لغو شے قرار دیا تھا۔ ایک کیرکے گارد ہی کیا، کارل جیسپرز، مارٹن ہائیڈیگر، ژاں پال سارتر غرض وجودیت کے کسی بھی نمائندے سے مل کر دیکھیے، زندگی کی لایعنیت دردِ لادوا نظر آئے گی۔ لیکن سحؔر انصاری نے اپنی زندگی کو لایعنیت کے اس نظریے کے پاس رہن ہرگز نہیں رکھا ہے۔ اُن کے یہاں فرار کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔ نہ اپنے آپ سے، نہ اپنے زمانے سے اور نہ ہی اپنی تہذیبی زندگی سے۔ اس کے برعکس سارے دُکھوں کے باوجود اُن کے یہاں زندگی سے ربط کا احساس ہوتا ہے — یہ الگ بات ہے کہ اس ربط نے اکثر و بیشتر اک اضطراب، اک رنجِ خاطر کو پیدا کیا ہے لیکن ربط بہرحال قائم رہتا ہے۔ زندگی سے ربط کا اظہار سحؔر انصاری کے یہاں کسی ایک انداز سے بھی نہیں ہوتا بلکہ متعدد صورتوں میں ہوتا ہے۔ کہیں یہ انفرادی قربِ جاں کی خواہش بن کر ظاہر ہوتا ہے تو کہیں مہیب تنہائی کے مداوے کی تمنا اور کہیں اپنے عہد کے احوال پر تشویش اور اُس کی تبدیلی کی آرزو کے طور پر، کہیں اپنے نظام سے ٹکراؤ کی شکل میں تو کہیں معاصر متداول افکار، نظریات اور علوم سے دل چسپی کے انداز میں کہ شاید ان کے ذریعے زندگی کا رنگ و مزاج بدل سکے۔ کبھی یہ مقاومت کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اپنے وجودی اثبات پر مُصر نظر آتا ہے۔ کہیں اپنی محرومی اور حزنِ جاں کے اخفا کی کوشش میں ظاہر ہوتا ہے۔ اظہار کی یہ صورتیں دیکھیے:

کوچہ و بازار میں گم سانس لیتی خواہشیں
سانس لیتی خواہشوں کا نوحہ گر کیسے رہوں

☆

اسی فضا میں مرے روز و شب گزرتے ہیں
شکستِ ذات کا ہر ماجرا نہ کہہ مجھ سے

☆

فصیلِ شہر میں پیدا کیا ہے در میں نے
کسی بھی بابِ رعایت سے میں نہیں آیا

☆

عجب طرح سے میں صرفِ ملال ہونے لگا
جو شہر کا تھا وہی دل کا حال ہونے لگا

☆

ابھی تو زندگی کو ریزہ ریزہ چن رہا ہوں میں
ابھی سے یہ شکست کا سوال کیسے آ گیا

اور اس غزل کے اشعار میں تو گراں باریِ دل کے کتنے ہی رنگ سمٹ آئے ہیں:

جسے گزار گئے ہم بڑے ہنر کے ساتھ
وہ زندگی تھی ہماری ہنر نہ تھا کوئی
بنائے جاؤں کسی اور کے بھی نقشِ قدم
یہ کیوں کہوں کہ مرا ہم سفر نہ تھا کوئی
ہجومِ شہر میں شامل رہا اور اس کے بعد
سحؔر اُدھر بھی گیا میں، جدھر نہ تھا کوئی

سحؔر انصاری کے شعری تناظر میں ایک مضمون مسلسل سامنے آتا ہے جس سے ایک استعارہ وضع ہوتا ہے، ایک مستقل نوعیت کا استعارہ اور وہ ہے گھر۔

ہے خود اک جبرِ مسلسل منصبِ آوارگی
دربدر جب خاک اڑانی ہو تو گھر کیسے رہوں

☆

عجیب ہوتے ہیں آدابِ رخصتِ محفل
کہ اٹھ کے وہ بھی چلا جس کا گھر نہ تھا کوئی

☆

در و دیوار کا وہ حشر دیکھا ہے ان آنکھوں نے
کہ دل میں حسرتِ تعمیر تک آنے نہیں پاتی

مجھے تخلیق کار کے نفسیاتی تجزیے یا تحلیلِ نفسی وغیرہ کا کام نہیں آتا جو ہمارے یہاں بعض نقادوں اور مدرّسوں نے تنقید کے نام پر بڑی دل جمعی سے کیا ہے، اس لیے میں اس استعارے کا تحلیل و تجزیہ کر کے یہ تو نہیں بتا سکتا کہ اس کے پیچھے سحؔر انصاری کے فلاں فلاں طرح کے ذاتی اور فلاں فلاں قسم کے سماجی عوامل اور محرکات کارفرما ہیں۔ یوں بھی مجھے کسی تخلیق کار کی ذاتی اور نجی زندگی کی شماریاتی قسم کی چھان پھٹک سے الجھن ہوتی ہے۔ میرا یہ مسئلہ ہی نہیں ہے کہ سحؔر انصاری کی ذاتی زندگی اور ان کے ذاتی گھر کا اس شعری استعارے کی تشکیل میں کیا کردار ہے۔

ویسے بھی اتنی بات تو ادب کے سبھی طالب علم جانتے ہیں کہ کسی بھی تخلیق کار کے یہاں کوئی استعارہ تشکیل پاتا ہے تو خواہ اُس کی بنیاد کتنی ہی ذاتی کیوں نہ ہو مگر اظہار کی سطح تک آتے آتے وہ بہت حد تک معاصر انسانی حقیقت کا نفسِ

ناطقہ بن جاتا ہے اور سماجی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ سحرؔ انصاری کے یہاں جس گھر کا ذکر ہمیں بار بار ملتا ہے، وہ کوئی چار دیواری قسم کا گھر نہیں ہے بلکہ یہ انسانی زندگی کی اُس طلب کا سوال ہے جو عہدِ جدید میں ایک بے حد گہرے المیے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ فرد سے سماج تک اور سماج سے کائنات تک معنویت کی مختلف سطحوں پر ابلاغ کرتا ہے۔ اس کی ایک جہت شاعر کے، آپ کے اور میرے تجربے کو بیان کرتی ہے اور دوسری جہت انسان کے ازلی گھر یا Paradise Lost کی علامتی نوعیت کو سامنے لاتی ہے۔ لہٰذا میری دلچسپی اس امر سے ہے کہ یہ استعارہ آرکی ٹائپل سطح پر جس طلب کو ظاہر کرتا ہے، اُس کے تحت آج کی انسانی زندگی کی معنویت کو اس سے کیا فروغ ملتا ہے، فرد کے داخلی اضطراب اور محرومی کی کس شدت کو یہ ابلاغ کی سطح تک لاتا ہے اور پھر یہ کہ فرد، سماج اور کائنات کی تکون کے زاویے میں یہ استعارہ کیا کسی ایسے نکتے کی دریافت میں ہماری کوئی مدد کرتا ہے جہاں تینوں زاویے یکساں قوت سے اثر انداز ہوتے ہوں اور ہم گھر کے استعارے کو معاصر انسانی زندگی میں بے گھری کے المیے کی جو جو صورتیں ہمارے سامنے آ رہی ہیں، اُن کو انسانی احساس کے مجموعی تناظر میں دیکھ سکیں۔

یہ سوال انسانی احساس کی مختلف کیفیتوں، تجربے کی مختلف نوعیتوں اور معاصر انسانی صورتِ احوال کی مختلف سطحوں کا بہ یک اور پوری سفاکی سے احاطہ کرتے ہیں۔ سحرؔ انصاری نے اپنے شعری سیاق میں اس قبیل کے جتنے سوالوں کا براہِ راست سامنا کیا ہے، اتنا اُن کے کسی دوسرے معاصر نے بلکہ کتنے ہی معاصرین نے مل کر بھی نہیں کیا ہوگا۔ چنانچہ اس مرحلے پر ہمیں ان کی شاعری میں اپنے عہد کی اس نفسی گونج کو سہارنے کی قوت نظر آتی ہے جس کے اثر کی ہول ناکی سے بچنے کے لیے کتنے ہی شاعر خیالی رومان کی پینگیں لیتے یا پھر نیم سیاسی و نیم اخلاقی (مگر قطعی غیر جذباتی) مشقیں کرتے پوری پوری عمر کو رائگاں گزار دیتے ہیں اور انھیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن سحرؔ انصاری نے آنکھیں نہیں چرائیں، اپنے آپ سے، نہ اپنے عہد سے، نابود ہوتی ہوئی اس تہذیب سے جس کے وہ پروردہ تھے اور نہ ہی عہدِ جدید کی اُس تہذیب سے جس کی غارت گری کا وہ اور اُن کا معاشرہ شکار ہوا— اور یہ بلاشبہ بڑا کام ہے، فرد اور اُس کے کام ہی کو نہیں پورے ایک عہد اور اس کے المیے کو نفسِ ناطقہ عطا کرنے والا کام۔ چنانچہ سحرؔ انصاری کے یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ عالمِ خیال و مثال کی شکست کے بعد نہایت دل خراش سوال زبان پر آتے ہیں:

اب کہاں لے جا رہی ہے جستجو تعبیر کی
کیا ہمارا ایک خوابِ رائگاں کافی نہیں

☆

میں ہر ایک شب یہی بند آنکھوں سے پوچھتا ہوں سحر تلک
کہ یہ نیند کس لیے اُڑ گئی اگر ایک خواب نہیں رہا
میں اکثر سوچتا ہوں شاعری کس کی ضرورت ہے
جسے ہم سہ گئے وہ زندگی کس کی ضرورت ہے
(دامِ خیال)

لیکن یوں ہے کہ آرزو کی شکست اور خوابوں کی رائگانی کا یہ سارا عمل نہ تو بے بنیاد ہے اور نہ ہی کسی بے خبری میں ہوا ہے۔ سحرؔ انصاری نے جذبے کی سطح پر اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اس تجربے کو ذہنی اور عقلی سطح پر بھی جاننے اور سمجھنے کی بخوبی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ اس مضمون کی ابتدا میں کہا گیا تھا، اُن کے شعری اسلوب کی تشکیل اور اظہار کے قرینوں کے تعین میں آگہی کا عمل دخل رہا ہے اور یہ آگہی اُن کے یہاں طرزِ زیست کے طور پر نظر آتی ہے— اور ایک عمیق حزن سے مملو ہے:

بھولنے کی بات بس اک بات ہے
درحقیقت بھولتا کوئی نہیں
ذہن میں اک بار جو تصویر بن جائے
کبھی وہ محو ہو سکتی نہیں
بھولنے کی بات اک دھوکا ہے اپنے آپ سے
درحقیقت تجربوں کو بھولتا کوئی نہیں
(درحقیقت)

☆

آساں نہیں ہے کشمکشِ ذات کا سفر
ہے آگہی کے بعد غمِ آگہی بہت

☆

ذرّہ و بیاباں کا رمز ڈھونڈنے والو!
کارِ ذات مشکل ہے کارِ زیست آساں ہے

سحرؔ انصاری کے یہاں آگہی کا یہ عمل محض اپنے ذاتی جذبہ و احساس کی کیفیات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انسانی معاشرے اور کائنات سے ہوتا ہوا خدا تک پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آگہی کے عمل میں تفکر کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ سطورِ گزشتہ میں عرض کیا کہ سحرؔ انصاری نہایت وسیع المطالعہ شخص ہیں۔ شعر و ادب تو خیر ان کا اوڑھنا بچھونا ہے ہی لیکن تاریخ، تہذیب اور فلسفے کے علاوہ جدید تر سماجی و سیاسی نظریات کے ساتھ سائنسی افکار سے بھی ان کی دلچسپی غیر معمولی درجے کی ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ ہمارے شاعر حضرات عام طور سے سنجیدہ علمی و ادبی مباحث سے دست کش رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ متداولہ علوم سے رغبت ان کی شعر گوئی کی وہبی صلاحیت اور اوریجنلٹی کو متاثر کر سکتی ہے۔ خدا جانے یہ گم راہی ہمارے یہاں کب اور کس وجہ سے پھیلی۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ شعر و ادب سے وابستہ شخصیات ایسی ہمہ جہت ہوا کرتی تھیں کہ بہ یک وقت مختلف شعبہ ہائے ابلاغ و اظہار پر مثالی دست گاہ ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ امیر خسرو اور رازی سے لے کر حالی و شبلی اور ہادی رُسوا تک تو ہمیں ایسی ہی مثالیں ملتی تھیں۔

بہرحال، سحرؔ انصاری عہدِ جدید کے اُن قلیل التعداد شعرا میں ہیں جو نہ صرف یہ کہ اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ علم وآگہی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں بلکہ انھوں نے اپنی ذہنی درّا کی اور متواتر اور ہمہ جہت مطالعے سے اپنے شعر وسخن کو وہ آب دی ہے جو اُن کی شناخت کا ایک جدا حوالہ بنتی ہے۔ ذرا یہ اشعار دیکھیے:

ذرّے میں دل کی دھڑکن ہے جب سے یہ معلوم ہوا
ایک ستارے کی گردش سے سو مہتاب بناتے تھے

☆

سنا ہے میں نے صدائیں کبھی نہیں مرتیں
پکارتے رہیں یارانِ رفتگاں سے کہو

یہ دونوں اشعار سائنسی انکشافات کا اشاریہ ہیں۔ تاہم میرے نزدیک اہم بات یہ نہیں ہے کہ کوئی شاعر کسی سائنسی، فکری، تاریخی، سماجی یا نظری نکتے کو شعر کے قالب میں ڈھال دے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ وہ نکتہ شعر بنا کہ نہیں اور شعر بنتا ہے انسانی احساس کی کیفیت اور فنی جمالیات کے تال میل سے۔ سحرؔ انصاری کے یہاں دوسرے معاصر اور جدید علوم سے اخذ واستفادہ کی صورتیں ہمیں صاف دکھائی دیتی ہے لیکن اُن کا ہنر یہ ہے کہ علم جب شعر کے قالب میں آتا ہے تو اپنا ابلاغ بہ یک وقت دو سطحوں پر کرتا ہے، یعنی عقلی اور جذبی سطح پر۔ مثال کے طور پر مندرجہ بالا اشعار دیکھ لیجیے یا اسی طرح اُن کی نظم ''سال گرہ کا تحفہ'' اور ''تجربہ گاہ میں ایک دن'' پڑھیے۔ یہ نگارشات ایک طرف سائنسی حقائق بیان کرتی ہیں اور یقیناً اس کی اپنی ایک اہمیت ہے لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کے ذریعے ہمیں انسانی احساس کی اُس کیفیت کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے جو جدید انسان کے ذہنی اور وجودی احوال کو ہم پر ایک بالکل الگ صورت میں افشا کرتی ہے۔ کچھ سائنسی اور فکری مباحث پر ہی موقوف نہیں سحرؔ انصاری نے اپنے عصر کی سیاسی اور جغرافیائی حقیقتوں کو بھی گرفت کیا ہے جیسے ان اشعار کو پڑھ کر ہم بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شاعر نے نیو ورلڈ آرڈر اور یونی پولر دُنیا میں خداوندِ عالم بننے والی قوتوں کی چیرہ دستیوں اور انسانوں کے استحصال اور تہذیبوں کی غارت گری کے ہتھکنڈوں کی طرف صاف لفظوں میں اشارہ کیا ہے:

بامِ مہتابِ فلک تک ہی رسائی ملی ہے
کون سی آپ کو دُنیا کی خدائی ملی ہے
پا بہ زنجیر مجھے اُس نے کیا ہے ایسے
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ رہائی ملی ہے

معاصر زندگی اور اُس کے حقائق ہی نہیں تاریخی بلکہ علمی حقیقتیں بھی سحرؔ انصاری کی توجہ کے مستقل موضوعات میں شامل رہی ہیں جیسے اُن کا یہ شعر:

گرا ہے کوئی تلافی کو تیغِ عریاں پر
مآلِ حسن کے اندیشۂ زیاں سے کہو

مجھے یہ شعر پڑھ کر شیکسپیئر کا ڈراما Othello یاد آتا ہے۔ شیکسپیئر نے اس ڈرامے میں اوتھیلو کی ٹریجڈی ہی کو نہیں بلکہ انسانی تاریخ کے ایک المیہ راستے پر سفر کرتے ہوئے ضمیرِ آدم اور اضمحلالِ حیات کی اندوہ ناک کیفیت کو نہایت عمدگی سے گرفت کیا ہے — اور سحرؔ انصاری نے اسی کیفیت کے دریا کو شعر کے کوزے میں بند کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اسے محض مطالعے کی برکت یا فنی چابک دستی کہہ کر آگے بڑھ سکتے ہیں؟ نہیں۔ اس لیے کہ اگر مطالعہ، نظریہ اور خارجی حوالہ خود شاعر کے اندر تحلیل ہو کر اور خون بن کر اُس کی شریانوں سے ہوتے ہوئے دل تک نہ پہنچ پائے تو اُس گداز سے محروم رہتا ہے جو جمالیاتی سطح پر تجربے کی بازیافت کا ذریعہ اور ادبی تخلیق کا جواز قرار پاتا ہے۔ سحرؔ انصاری کے فن کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ سائنس، فلسفہ، مذہب، تاریخ، جغرافیہ اور دوسرے سماجی علوم کا مطالعہ جب اُن کے شعر وسخن میں بیان ہوتا ہے تو خالص انسانی جہت کے تحت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے فکری وعقلی رویے سے خواہ تطبیق کا رشتہ قائم کرے یا تردید کا لیکن ہم تک اس کا ابلاغ جذبہ واحساس کی سطح پر ہوتا ہے۔

خواتین وحضرات! غزل تمام ہوئی اور رات باقی ہے کے مصداق بیان ختم ہوا اور بات باقی ہے۔ مضمون کے اختتام پر آ کر میرا یہ احساس قوی تر ہوئے جاتا ہے کہ کہنے کی کئی باتیں ابھی دائرۂ بیان تک آئی ہی نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ میں اس مجموعے میں شامل نظموں کا قدرے تفصیلی مطالعہ کرنا چاہتا تھا، خصوصاً ''درحقیقت''، ''کولاژ''، ''ہم آرہے ہیں''، ''نظامِ نو'' اور بالالتزام اُس نظم کا جس سے اس مجموعے کا نام لیا گیا ہے یعنی ''خدا سے بات کرتے ہیں'' — ان نظموں میں معاصر زندگی کے اندوہ ناک سیاسی، تہذیبی اور انسانی المیوں کو جس فن کاری اور متانت کے ساتھ گرفت کیا گیا ہے، اس سے جدید شاعری کے اسلوب واظہار کے کمال کا ایک نیا نشان ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسی طرح آج حیاتِ انسانی کی معنویت اور انسانوں کے باہمی سماجی روابط کی نوعیت کو جس طرح ان نظموں میں دیکھا گیا ہے، وہ اندازِ نظر بھی گفتگو طلب کئی پہلو سامنے لاتا ہے۔ اسی طرح سحرؔ انصاری کے شعری لحن نے گزشتہ تین دہائیوں میں ''نمود'' کے بعد جن تبدیلیوں کو اختیار کیا ہے، وہ اُن کے موضوع اور طرزِ احساس سے ہم آہنگی کی کیا صورتیں رکھتا ہے اور ابلاغ کی کن سطحوں تک آتا ہے، یہ سب باتیں غور طلب ہیں، جن کو اس مضمون میں دیکھا ہی نہیں جا سکا۔

خیر، یہ ایسی کچھ بری بات بھی نہیں، بلکہ اگر میں سحرؔ انصاری کی شاعری کے تمام پہلوؤں کو محض ایک مضمون میں سمیٹ پاتا تو شاید اسے تنقید اور اُس کے discipline کی کامیابی تو ضرور قرار دیا جا سکتا لیکن یہ تجربہ میرے لیے ذاتی سطح پر خوشی کا باعث ہرگز نہ ہوتا۔ وہ یوں کہ میں تنقید پر تخلیق کی سبقت اور تقدم ہی کا قائل نہیں ہوں بلکہ اس حقیقت پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ زندہ تخلیقی تجربہ رہ رہ کر ہم پر اپنے معنی کی ایک نئی تہ کھولا کرتا ہے۔ ہم اُسے ایک بار پڑھنے کے بعد مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتے، ہرگز نہیں۔ سحرؔ انصاری کی شاعری کا مطالعہ میرے اس احساس کو مزید مستحکم کرتا ہے۔

سوچتی ہوئی شاعری

پروفیسر مجتبیٰ حسین
(کوئٹہ)

سحرؔ انصاری کی شاعری کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی نظمیں آپ سے اس ''شخص'' کا تعارف کرادیتی ہیں جو آپ میں موجود ہے۔ میں نے قصداً ''شخص'' کی جگہ ذات کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس لیے کہ ''ذات'' کو نیم صوفی، نیم حکیم نوآموز شعرا نے گورکھ دھندا بنا دیا ہے جس میں جہل چھپا ہوا ہے اور جس کا اظہار وہ اعترافِ جہل نہیں بلکہ اظہارِ جہل کے طور پر کرتے ہیں۔ سحرؔ نے ''ذات'' کے سلسلے میں ایک جگہ بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

آدمی سے آدمی کے اجنبی رہنے کا غم
ذات کے سارے غموں سے ہے شدید

سحرؔ انصاری کی شاعری اسی غم کی امین ہے اور اسی غم سے نمو بھی پاتی ہے۔ یہ وجود کا غم ہے۔ اس نظامِ شمسی میں وجود کے تعین اور اعتبار کا غم ہے۔ تہذیبوں کے مٹنے اور ریزہ ریزہ ہو جانے کا غم ہے۔ معاشرتی حد بندیوں کا غم ہے۔ سود و زیاں کے پیمانوں سے آدمی کی قدر و قیمت کو گھٹانے بڑھانے کا غم ہے۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے مجھے کئی بار یہ احساس ہوا کہ ہماری جدید نظم نگاری میں ایک فانیؔ پیدا ہوا ہے۔۔۔ حالانکہ فانیؔ اور سحرؔ انصاری میں ہر لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ یہاں میری مراد اس فرق سے نہیں ہے جو غزل اور نظم کے صنفی تقاضوں سے پیدا ہوتا ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دونوں کے یہاں غم کی کارفرمائی ہے۔ البتہ انداز اور رُخ مختلف ہے۔ فانیؔ غم نواز شاعر بھی ہیں۔ سحرؔ غم نواز نہیں ہیں۔ غم شناس ہیں۔ اس غم شناسی کی اُن کے یہاں کئی جہتیں ہیں جو عہدِ جدید کے علم و ادب کے گہرے مطالعے اور خود ان کی رسیدہ شعری شخصیت سے پیدا ہوئی ہیں۔۔۔ مذہب، اخلاق، سیاست، سرمایہ و محنت اور جسم و جاں کی آمیزش اور آویزش نے آدمی کو کیا بنایا اور کیا بنا رہی ہے۔۔۔ حیاتیاتی اور طبیعاتی عمل کے تحت رینگتا ہوا آدمی معاشرتی عمل کے دائرے میں آکر کیونکر کھڑا ہوا، آگے بڑھا اور آج کدھر بڑھ رہا ہے۔۔۔ اور پھر معاشرتی عمل کا دائرہ جو دائرہ در دائرہ ہے، کتنا پھیلتا جا رہا ہے۔۔۔ ان تمام پہلوؤں پر سحرؔ کی شاعری غور کرنے میں ''مصروف'' ہے۔۔۔ یہ ایک ایسے شاعر کا کلام نہیں ہے جس کا ذہن غیر مصروف ہو۔ اسی لیے یہ ایک ایسی سوچتی ہوئی شاعری ہے جو دوسروں کو بھی سوچنے پر مائل کرتی ہے۔ غور و فکر کا یہ پہلو کسی اور نئے شاعر کے یہاں اس انداز سے نہیں ملتا۔ بیشتر نئے شعراء کے یہاں ادعائے فکر ہے۔ مدّعائے فکر غائب، تاریخی اور معاشرتی ادارک کے بغیر یا ان کی نفی کر کے جو شاعری کی جائے گی وہ مصرعے لکھنے کی شاعری ہوگی۔

سحرؔ کے یہاں ہر مصرعہ آپ کو روک کر آپ سے کہتا ہے کہ اب پھر سے اپنے کو دریافت کرنے کی کوشش کیجیے۔

تم یہ کہتے ہو احساس کیا چیز ہے
اور احساس کی زندگی میں کوئی قدر و قیمت نہیں
زندگی تو کسی اور ہی رمز کا نام ہے
مگر تم نے اس رمز کو رمز کی طرح سمجھا کہاں ہے؟

تم جھوٹ اور سچ کے دوراہے پر تھے
گزرتے لمحوں کی آواز نے تم سے پوچھا
''کیا تم سچ کی راہ پہ چل سکتے ہو؟''

مُردہ تہذیب دیکھتی ہے
کہ زندہ تہذیب کے فلک بوس قصر و ایواں
ہلاکتوں سے سجے ہوئے ہیں
اور اس کے مامن
تابکاری کی وحشتوں کے بنے ہوئے ہیں
اور اس کے اجسام
کوہِ آتش فشاں پہ غافل کھڑے ہوئے ہیں

سحرؔ کے یہاں اُن نظموں میں بھی جن میں ہجر و وصال کی باتیں ہیں، غور و فکر کا عنصر ملتا ہے۔ ''عہدِ فراموش'' جسم اور جاں دونوں کو تازہ کرنے والی نظم ہے۔ مگر سوچ کی کڑواہٹ اس میں بھی گھُلی ہوئی ہے۔ غور و فکر کے یہ بادل جو سحرؔ کی شاعری پر منڈلاتے رہتے ہیں ان کی نظموں کو بوجھل اور مرطوب نہیں بناتے۔ یہ کوئی معمولی فن کاری نہیں ہے۔ سحرؔ شاعری کے معاملے میں اناڑی نہیں ہیں وہ فن کا احترام کرتے ہیں۔ ان کی فکر کی تازگی ان کے مصرعوں کی روانی بن گئی ہے۔ ان میں بڑا دم ہے۔ طویل نظموں میں ان کی لمبی سانس کہیں ٹوٹتی نہیں۔ ان کی شاعری سانس کی آمد و شد کے نظام سے واقف ہے۔ اسی لیے طویل نظمیں ہوں یا مختصر دونوں کے انتظامِ نفس میں فرق نہیں آنے پاتا۔ ''انتظار'' کو دیکھیے، کتنی مختصر نظم ہے مگر کتنی سجل، کتنی بھرپور ہے۔ اس نظم میں اس غم کی موسیقی کی بھی سُنیے جو اس کے پس منظر سے مصرعہ بہ مصرعہ اُبھرتی ہے۔

میں نے اوپر سحرؔ کے غم کے سلسلوں پر بات کرتے وقت فانیؔ کا بھی ذکر چھیڑ دیا تھا، میں رلکےؔ کا بھی حوالہ دے سکتا تھا مگر اصل میں فانیؔ اور رلکےؔ دونوں سے ہٹ کر مجھے بات کہنی تھی۔ فانیؔ کے یہاں غم معبود ہے۔ سحرؔ کو اب تک کوئی معبود نہیں مل سکا۔ اُن کے غم کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے۔ رلکےؔ کا غم مابعد الطبیعیاتی ہے اور ایک خاص قسم کی مسیحی یاسیت اس میں پنہاں ہے۔ سحرؔ کے یہاں

اس نوع کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اُن کی شاعری محرومی اور مایوسی کی شاعری نہیں ہے۔ مابعد الطبیعیات سے زیادہ طبیعیات کا دخل اُن کی نظموں میں ملتا ہے۔ ان کا غم کوئی انوکھا نہیں۔ یہ وہی ہے جو بنی نوع انسان کا غم ہے۔۔۔ جو عہد بہ عہد گھٹتا بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سحر کی شاعری ہراساں، منفعل اور مضمحل نہیں ہے۔ یہ غموں کو جھوٹی رجائیت کے پردے میں چھپانے کی قائل نہیں ہے۔ اس میں بڑا حوصلہ ہے۔

مگر مرے کربِ آتش افروزِ جاں نے ابتک نہیں کہا ہے
ایلی ایلی لما شبقتنی

سحر کی آواز میں دکھ ہے مگر اسی کے ساتھ یہ ڈری ہوئی سہمی ہوئی آواز نہیں ہے۔۔۔ یہ بے خوف اور بے لاگ آواز ہے۔ ان کی ایک نظم بھی ایسی نہیں ہے جس میں کہنے کی بات کہنے کی طرح نہ کہی گئی ہو۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعری کا فن اور شاعر کی شخصیت ایک ہو جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں نہ ابہام کا حبس ہے نہ فکر کا، نہ غم کا۔۔۔ ان کی شاعری ہر حبس کو توڑتی ہوئی نکل جاتی ہے اور نئی آہٹوں کو سموتی رہتی ہے۔ یہ مہذب اور مرتب شاعری ہے جو ایک ترقی یافتہ ذہن ہی سے ممکن ہے۔

اس مجموعے میں غزلیں بھی شامل ہیں۔ تہذیب شاعری سے باخبر ہونے کی بنا پر سحر کے یہاں نظمیں اور غزلیں ایک دوسرے کی حریف نہیں ہیں۔ ان غزلوں میں بھی وہی فکر افروزی اور دلنوازی ہے جو ان کی نظموں میں ہے۔

اپنے عہد کے المیے کو انسانی تاریخ سے ربط دے کر پڑھنا اور پھر شعر میں ڈھالنا حوصلے اور جرأت کا کام ہے۔ یہ نوحے کی کتاب ہے۔۔۔ آگہی سے قبل کا نوحہ اور آگہی کے بعد کا نوحہ:

ہوا کے نوحوں میں بازگشتِ صدا کی تکمیل کر رہا ہے
ان نوحوں میں اتنی توانائی ہے کہ انسانیت اور انسانیت کی بقا کے بارے میں ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

پنجابی (دیسی) کیلنڈر

برِصغیر پاک و ہند کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس خطے کا دیسی کیلنڈر دنیا کے چند قدیم ترین کیلنڈرز میں سے ایک ہے۔ اس قدیمی کیلنڈر کا اغاز 100 قبل مسیح میں ہوا۔ اس کیلنڈر کا اصل نام بکرمی کیلنڈر ہے، جبکہ پنجابی کیلنڈر، دیسی کیلنڈر، اور جنتری کے ناموں سے بھی جانا جاتا ہے۔

بکرمی کیلنڈر کا آغاز 100 قبل مسیح میں اُس وقت کے ہندوستان کے ایک بادشاہ "راجہ بکرم اجیت" کے دور میں ہوا۔ *راجہ بکرم کے نام سے یہ بکرمی سال مشہور ہوا۔ اس شمسی تقویم میں سال "ویساکھ" کے مہینے سے شروع ہوتا ہے۔*

تین سو پینسٹھ (365) دنوں کے اس کلینڈر کے نو مہینے تیس (30) تیس دن کے ہوتے ہیں، اور ایک مہینا وساکھ اکتیس (31) دن کا ہوتا ہے، اور دو مہینے جیٹھ اور ہاڑ بتیس (32) بتیس دن کے ہوتے ہیں۔

۱۔ *ویساکھ (وسط اپریل–وسط مئی)
۲۔ جیٹھ (وسط مئی–وسط جون)
۳۔ ہاڑھ (وسط جون–وسط جولائی)
۴۔ ساون (وسط جولائی–وسط اگست)
۵۔ بھادوں (وسط اگست–وسط ستمبر)
۶۔ اسو (وسط ستمبر–وسط اکتوبر)
۷۔ کاتک (وسط اکتوبر–وسط نومبر)
۸۔ مگھر (وسط نومبر–وسط دسمبر)
۹۔ پوہ (وسط دسمبر–وسط جنوری)
۱۰۔ ماگھ (وسط جنوری–وسط فروری)
۱۱۔ پھاگن (وسط فروری–وسط مارچ)
۱۲۔ چیت (وسط مارچ–وسط اپریل)

بکرمی کلینڈر (پنجابی دیسی کیلنڈر) میں ایک دن کے آٹھ پہر ہوتے ہیں، ایک پہر جدید گھڑی کے مطابق تین گھنٹوں کا ہوتا ہے.

ان پہروں کے نام یہ ہیں:

دھمی ویلا: صبح 6 بجے سے 9 بجے تک کا وقت
دوپہر ویلا: صبح کے 9 بجے سے دوپہر 12 بجے تک کا وقت
پیشی ویلا: دوپہر کے 12 سے دن 3 بجے تک کا وقت
دیگر ویلا: سہ پہر 3 بجے سے شام 6 بجے تک کا وقت
نماشاں ویلا: رات کے اوّلین لمحات، شام 6 بجے سے لے کر رات 9 بجے تک کا وقت
کفتاں ویلا: رات 9 بجے سے رات 12 بجے تک کا وقت
ادھ رات ویلا: رات 12 بجے سے سحر کے 3 بجے تک کا وقت
اسور ویلا: صبح کے 3 بجے سے صبح 6 بجے تک کا وقت

(لفظ "ویلا" وقت کے معنوں میں برصغیر کی کئی زبانوں میں بولا جاتا ہے۔)

''بُرجِ بابل''

(سحر انصاری کی نظموں سے کشید)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

خدا سے بات کرتے ہیں

نظر کے سامنے تاریخِ بابل خوں چکاں آئی
شہیدوں کی زباں میں داستاں درداستاں آئی

یہیں نمرود نے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی
یہیں فرزندِ آذر نے
دہکتی آگ کو گلزار کا مژدہ سنایا تھا
حمورابی، نبوکد نصر تھے آئین ساز اس کے
چھپے ہیں اس زمیں میں ریزہ ریزہ سارے راز اس کے
مقدر اس زمیں کا وقفِ نیرنگِ زمانہ ہے
فراتِ اشک میں، یا دجلۂ خوں میں نہانا ہے
مرے دل کو گلہ ہے آج پھر عشتارِ بابل سے
اسے تو عشق پر اور جنگ پر یکساں ہی قدرت ہے
اٹھی پھر عشق کو رد کر کے وہ کیوں جنگ کی خاطر
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

اندھیروں کے شکنجوں میں ابھی تک کیوں اُجالے ہیں
جو مظلوموں کی لاشوں پر بھیانک رقص کرتے ہیں
وہ کرگس کس نے پالے ہیں
تمدن ساز نقاشوں کی تخلیقات کے ہوتے
سگانِ خیرہ سر کیسے گلی کوچوں میں آ پہنچے

تباہی کے مناظر ہم نے خود آنکھوں سے دیکھے ہیں
کہیں شعلے بھڑکتے ہیں، کہیں لاشے تڑپتے ہیں
وغائے کاذبِ دوراں میں بچوں کی خطا کیا تھی
نہتّی عورتوں، معصوم بچوں کی خطا کیا تھی؟
چلو ہم برجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

سکت کس سمت سے ملتی ہے اب اقصائے عالم میں
کسی کو ظلم کرنے کی، کسی کو ظلم سہنے کی
ستم کاروں کے لشکر فتح پاتے ہیں تو کیوں آخر
رواں ہے بستیوں میں کس لیے سیلابِ خوں آخر
جہنم سے زیادہ تُند شعلے کیوں دہکتے ہیں
یہ بے تابوت لاشے کس کی آخر راہ تکتے ہیں
چلو ہم برجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

جو گھر میں اک دیے کی روشنی کرنے سے قاصر ہوں
وہ دہشت گرد کہلائیں!
جو لمحہ بھر میں زندہ بستیاں تاراج کر ڈالیں
وہ امن و آشتی و صلح کے ہم درد کہلائیں

وہ دن ماتم کے دن تھے جب سیہ کاروں کے لشکر میں
خوشی کے شادیانے بج رہے تھے حلقہ در حلقہ
وقار و عزت و ناموس ہیں، اب نوحہ خوانوں میں
انہیں بیچا گیا ہے بے ضمیری کی دُکانوں میں
نہ میزانِ عدالت ہے، نہ احساسِ ہلاکت ہے
کوئی قانون بھی باقی رہا ہے تیری دنیا میں؟
چلو ہم برجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

کروڑوں رینگتے انساں ہیں اب بھی نعرہ زن ہر دم
کوئی آواز اب جاتی نہیں کیوں تیری ہیکل تک
حریری شبنمی لہجوں کی تجھ کو کیا ضرورت ہے
تجھے تو آگ کے شعلوں سے آتا ہے سخن کرنا
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

چلو اُس وقت سے پہلے کہ ہم سب گنگ ہو جائیں
مبادا اپنے اپنے غم کدوں میں جا کے سو جائیں
ہمارے تیر مٹ جائیں، کمانیں چھین لی جائیں
مبادا پھر ہماری ہی زبانیں چھین لی جائیں
چلو ہم بُرجِ بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

موئنجو دڑو

قدیم تہذیب کے شکستہ بدن
تہہ بہ تہہ خاک کے اندھیروں سے
مسخ ہو کر
زمیں پہ اُبھرے ہیں اور
تہذیبِ نو کی آنکھوں کو
اپنی عظمت کی داستانیں سنا رہے ہیں

شکستہ آثار
نسلِ انساں کی گم شدہ ساعتوں کے نوحے
زندہ تہذیب کی امنگوں پہ دم بخود ہیں

یہ نصف عظمت، یہ نیم تہذیب
اپنی بے جا برہنگی پر
بہت خجل ہے
کہ اس کے جسمِ سقیم کے داغ
طشتِ تہذیبِ نو میں اب تک چمک رہے ہیں

شکستہ آثار
شرم سے دھنس رہے ہیں قاتل زمیں کے اندر
کہ میوزیم کے تمام کمروں میں
موت ہے موت کی نمائش

تمام انسان موت کے مسخ کردہ لمحوں کی کھوج میں ہیں
متاعِ پس خوردۂ اجل کو
تبرکاتِ بشر سمجھ کر
تمام انساں
بزرگ نسلوں کی مدح کرتے ہیں ان خرابوں میں
اور پیہم یہ سوچتے ہیں
کہ کیسی تہذیب
مردہ مٹی میں دھنس گئی تھی
کہ ان کے ہاتھوں نے
کوزہ گر کی دکان کے
سارے ٹھیکروں کو
اپنی تہذیب کے عجائب گھروں میں
محفوظ کر لیا ہے

شکستہ تہذیب دیکھتی ہے
کہ وقت کی نیم خوردہ خوراک
عصرِ حاضر کو کتنی مرغوب ہے کہ اب تک
ہے مردہ تہذیب زندہ تہذیب کے
قبائل کا خوانِ یغما
مردہ تہذیب دیکھتی ہے
کہ زندہ تہذیب کے فلک بوس قصر و ایواں
ہلاکتوں سے سجے ہوئے ہیں
اور اس کے مامن
تابکاری کی وحشتوں کے بنے ہوئے ہیں
اور اس کے اجسام
کوہِ آتش فشاں پہ غافل کھڑے ہوئے ہیں

زندہ تہذیب کوہِ آتش فشاں پہ استادہ
سوچتی ہے
کہ مردہ تہذیب کو بچا لے

مردہ تہذیب
زندہ تہذیب کے ارادوں پہ ہنس رہی ہے
مردہ تہذیب شرم سے
لمحہ لمحہ مٹی میں دھنس رہی ہے

شکست وریخت

میں اپنے آپ پہ جس وقت غور کرتا ہوں
کہ چند سال میں کتنا بدل گیا ہوں میں
تو مجھ کو آج بھی ہوتا ہے بار ہا محسوس
کہ اپنے آپ سے آگے نکل گیا ہوں میں

مری حیات کو تھا ناز جن سہاروں پر
انہی کو میں نے بڑی سرکشی سے ٹھکرا یا
رہا ہے قلب کو اصرار جن کی عظمت پر
انہی ''عظیم روایات'' پر ستم ڈھایا

میں کہہ رہا ہوں ہر اک بزم میں بہ بانگِ دُہل
خدائے قادرِ کن اب شعور ہے میرا
مگر یہ طرز یہ اقرار اتنا سہل نہ تھا
گواہ اس کا دل ناصبور ہے میرا

نئے خیال، نئے کلیّے، نئے افکار
جب آئے بن کے مرے ذہن کے ندیم وحبیب
تو وہم وعقل کی ہر کش مکش کے بدلے میں
رہا ہے دل میں مرے مدتوں خلائے مہیب

ہے یاد مجھ کو ، روایت شکن فضاؤں میں
صنم کدوں کی تباہی کا جب اٹھا تھا سوال
تو چیخ اٹھے تھے مری روح کے زمان ومکاں
کہ ان کی پشت پہ صدیوں کا ہے وقار وجلال

کسی کو بحث میں جب بھی شکست دی میں نے
تو سینہ کوب رہیں بے شمار تاویلیں
ملا بھی عقل کو منطق کی دوپہر میں سکوں
دیارِ جاں میں مگر چیختی پھریں چیلیں

شکستِ سحرِ مناروکلس پہ ہو کے حزیں
خرد کی سیج پہ کب سوئی ہیں مری آنکھیں
بجھی ہے دل میں مرے جب بھی شمعِ وہم کوئی
تو صبح و شام لہو روئی ہیں مری آنکھیں

جلے ہیں جب بھی مرے جسم وجاں میں دیروحرم
تو ہڈیوں کے چٹخنے کا شور میں نے سُنا
ہنسا ہوں جب بھی کسی اعتبارِ مذہب پر
توسیلِ اشک امڈنے کا شور میں نے سُنا

کتابِ وہم پہ کھینچا ہے جب خطِ تنسیخ
لرز اٹھا ہے قلم، کانپ اٹھا ہے دستِ جنوں
لہو نچوڑ لیا جاں کنی کی شدت نے
کھرچ کے چھوڑ دیا رنج نے بہ حالِ زبوں

کہا ہے مجھ سے مرے گھر کے ہر دریچے نے
سکونِ زیست گنوانے پہ کیوں ہو آمادہ
کہا ہے جاگتی راتوں میں مجھ سے بستر نے
کہ عقل و ہوش کے کیوں ہو گئے ہو دلدادہ

کبھی رہی ہے مری میز جیسے مجھ سے خفا
کبھی خموش کتابوں نے احتجاج کیا
کبھی ثواب نے گردن میں ڈال دیں بانہیں
کبھی عذاب نے درسِ خرد شکار دیا

میں مارا مارا پھرا اجنبی دیاروں میں
کہ جیسے دسترسِ غم سے بھاگ جاؤں گا
ہر اک قدم پہ یہی وسوسہ سا رہتا تھا
کہ ہر قدم پہ کئی بار لڑکھڑاؤں گا

میں اپنے آپ سے ڈرنے لگا، الجھنے لگا
ہر ایک بزم میں تنہا رہا وجود مرا
کسی نے مجھ کو کسی طرح کی پناہ نہ دی
کہ میں نے اپنی پناہوں کو پھونک ڈالا تھا

اورآج میں ہوں جو کہتا ہوں اک زمانے سے
کہ میں حریف ہوں اوہام کے زمانے کا
کسے خبر کہ مری جرأتِ تکلم میں
ہے کرب کتنے عقیدوں کے ٹوٹ جانے کا

○

لمحۂ فکریہ

زندگی کا ایک ہی رخ اب نہیں ہے سامنے
ذہن کے در وا کیے ہیں کتنی ایجادات نے
ایک پل میں ہے نظر سیّارگاں کے رقص تک
دوسرے پل جسمِ انساں رہ گیا اک عکس تک
اک طرف ہیں نیم جاں، مفلس قطار اندر قطار
کرگسانِ گرسنہ کو موت کا ہے انتظار
اک طرف بچے کے ہاتھوں میں ہے اک کاغذ کی ناؤ
اک طرف دہکا ہوا ہے چلتے شہروں کا الاؤ
اک طرف نازک سی گردن پھول مالا میں بسی
اک طرف دوشیزگی زنجیرِ عُسرت میں کسی
مدرسے بھی ہیں، معابد بھی، شفا خانے بھی ہیں
اوران کے سائے میں لاشوں کے نذرانے بھی ہیں
رقص و نغمہ آج بھی دل کو لبھاتے ہیں بہت
گولیوں کے ساز پر آنسو بہاتے ہیں بہت
جھانکتا ہے اک نئے روزن سے رازِ کائنات
معملوں میں اسلحوں کی چلتی رہتی ہے برات
آ چکا ہے آدمی غاروں سے رودِ نیل تک
نام آئندہ کا لے کر ہر گھڑی جیتا ہے کون
آدمی کے کاسۂ سر میں لہو پیتا ہے کون

○

تلافیوں کی سرزمیں

سنا ہے ہارنے کے بعد بھی بساطِ وقت پر
فریب مہرہ ایک نئی ادا کے ساتھ ابھرتا ہے
کہ جیسے ڈوب کر بھی آفتابِ شام قرمزیں
افق کے دامنِ سیہ میں اپنا رنگ بھرتا ہے
مگر مجھے یقیں نہیں
ابھی تو گردشوں میں ہے تلافیوں کی سرزمیں
ابھی تو درد کے نئے چراغ جھلملائیں گے
ابھی تو زخمِ دل ہی پھول بن کے مسکرائیں گے
ابھی تو شاخ شاخ ایک نیا گلاب چاہیے
ابھی تو عادتوں کو بھی نیا نصاب چاہیے
ابھی کہاں ہے وہ نظر کہ چاند کو نہ تک سکے
ابھی کہاں وہ دل جو سنگ و خشت میں دھڑک سکے
ابھی وہ قہقہے کہاں جو اشک میں نہ ڈھل سکیں
ابھی وہ راستے کہاں جو نقشِ پا بدل سکیں
یقین جبر کے لیے سکوت و صبر کے لیے
مجھے بھی وقت چاہیے، تجھے بھی وقت چاہیے
ابھی تو گردشوں میں ہے تلافیوں کی سرزمیں

○

''ابد کی شام''

حمد باری تعالیٰ

نہ صرف یہ کہ مرے جسم و جاں کا مالک تو
ہے کائنات کی روح رواں کا مالک تو

نہ تیرے ساتھ کوئی اور نہ تو کسی کے ساتھ
تو لا مکاں ہے مگر ہر مکاں کا مالک تو

ازل کی صبح کا آغاز تیری خلاّقی
ابد کی شام جہاں ہے وہاں کا مالک تو

زمیں کے رنگوں کے دامن میں تیری ہی خوشبو
خلا میں بکھری ہوئی کہکشاں کا مالک تو

دہکتی آگ میں زندہ رہے تری مخلوق
سمندروں کی متاعِ نہاں کا مالک تو

مری نظر کو ابھی تک حقیقتوں کی تلاش
مری نگاہ سے اَوجھل جہاں کا مالک تو

طلب کی راہ کا عرفانؔ تیری ہی بخشش
بسا ہے دل میں جو اُس آستاں کا مالک تو

غالب عرفان (کراچی)

سلام بحضور امام عالی مقامؓ

ہر دور معترف ہے صداقت حسینؓ ہیں
شہدائے کربلا کی امامت حسینؓ ہیں

جرأت، بہادری تو تھی میراث میں ملی
کرب و بلا گواہ شجاعت حسینؓ ہیں

ہر حال میں کلام الٰہی سے ہم کلام
رب کی رضا یہی تھی ،عبادت حسینؓ ہیں

سب جاں نثار منتظر تھے، جاں فدا کریں
قربان دل و جان، شہادت حسینؓ ہیں

جو خاکِ کربلا ہے وہ تو خاکِ شفا ہے
ہر مرض کی شفا ہیں، شفاعت حسینؓ ہیں

صبر و رضا کے دیپ تھے اوجِ کمال پر
دینِ مبیں کی ساری فصاحت حسینؓ ہیں

مابین حق و کفر کے جو معرکہ ہوا
اُس کی عظیم الشان روایت حسینؓ ہیں

شگفتہ نازلی
(لاہور)

عزت دار

مسرور جہاں
(لکھنؤ، بھارت)

میاں کے خاندان کی یہ پہلی شادی تھی جس میں پہلی بار ڈھولک رکھی گئی تھی۔ دولہا میاں سعید الحسن سید ھے ولایت سے بیرسٹری پڑھ کر آئے تھے۔اب تو گویا ان کو کئی باتوں کی چھوٹ مل گئی تھی اور بہنوں نے بھی پہلی بار ان سے کوئی فرمائش کی تھی۔ وہ بھی ان کی شادی خانہ آبادی کے مبارک موقع پر۔ گھر والوں کا یہ حال تھا کہ جب تک وہ ساتھ خیریت کے واپس نہیں آ گئے ان کی راتوں کی نیندیں اُڑی رہیں۔سب کو یہی دھڑ کا لگا رہتا تھا کہ صاحبزادے کہیں ایک عدد گوری میم لٹکا کر ساتھ نہ لے آئیں۔ وہ تو ولایت جانے سے پہلے ہی مغربی تہذیب سے متاثر تھے۔انہیں گوروں کی اصول پسندی اور وقت کی پابندی نے قائل کر دیا تھا۔مغربی ادب کے بھی شیدا تھے۔سعید میاں خاندان کے پہلے فرد تھے جو کالج اور یونیورسٹی میں کوٹ پتلون پہنتے تھے اور نکٹائی لگاتے تھے۔البتہ ابھی تک ان کا اتنا ہیاؤ نہیں کھلا تھا کہ گھر کے بزرگوں کے سامنے یہ لعنتی لباس پہننے کی جسارت کرتے۔ان کے والد اور چچا وغیرہ پشتینی زمیندار تھے۔زمینیں اور باغات ان کے خاندان کی کفالت کے ساتھ ان کی آن بان کے بھی ضامن تھے۔ پانچ بھائیوں اور تین بہنوں کا ایک وسیع خاندان تھا جو اپنی اپنی حویلیوں میں پھل پھول رہا تھا۔ان کے ہاں آپس میں ہی شادی بیاہ کرنے کا رواج تھا۔ایک تو خاندان میں رشتوں کی کمی نہیں تھی۔ دوسرے باہر رشتہ کرنے میں سو طرح کی دشواریاں تھیں۔شہر والے آپس میں اتنا گھاما گھیل تھے کہ کسی کی ننھیال سید ہے تو ددھیال شیخ ہے۔بے میل ہڈی تو اپنے ہی خاندان میں مل سکتی تھی۔سعید میاں بھی اپنی چچا زاد نازنین بیگم سے منسوب تھے۔اس رشتے میں کوئی برائی بھی نہیں تھی۔صورت کے ساتھ اس کی سیرت بھی اچھی تھی۔ وہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے پرائیویٹ ہائی اسکول پاس کیا تھا۔خاندان کے لڑکے البتہ لکھنؤ اور علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اور اچھے اچھے عہدوں پر فائز تھے۔

نئی حویلی میں شادی سے ایک ہفتہ پہلے ہی سے ڈھولک رکھی گئی تھی۔ اگلے والے دالان میں پھولدار سوزنی کا فرش تھا۔ جہاں میراثنیں بیٹھی مبارک بادیں اور بنری بنرے گا رہی تھیں۔ بیبیاں پچھلے دالان میں تختوں کے چوکے پر براجمان تھیں اور بہت فراخدلی سے میراثنوں کو نچھاور اور انعام واکرام دے رہی تھیں جو کہ میراثنوں کی ہیڈ اصغر باندی وصول کر رہی تھیں۔ کھانے کا وقت آتا تو پہلو والے بڑے دالان میں بیبیوں کے لیے دستر خوان لگا دیا جاتا۔ میراثنوں کو صحنچی میں تانبے کی بڑی بڑی سینیوں میں کھانا دیا جاتا تھا۔تام چینی کی پلیٹیں اور پیالے اِدھر سے اُدھر گردش کرتے تھے۔میاں کے خاندان میں شادی بیاہ ہو یا کوئی اور تقریب۔محرم میں مجالس ہوں یا تعزیہ کا جلوس۔اندر باہر میراثنوں کی برادری ہی سارے فرائض انجام دیتی تھی۔کئی سالوں سے یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا۔میاں لوگ ان کے ججمان تھے اور پرجا اپنے ججمانوں کی بہت عزت کرتی تھی۔ یہ قانون کہیں لکھا نہیں تھا لیکن اس کی اہمیت قانون سے کم بھی نہیں تھی۔ملک آزاد ہوا تو کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ خاتمۂ زمینداری بل پاس ہو گیا۔زمینداروں کے تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ان کی کل دولت یہ بہت خود کاشت زمینیں رہ گئی تھیں یا باغات تھے۔معاوضے کے نام پر برائے نام رقم کے بانڈ ملے جو آنسو پونچھنے کے بھی کام نہ آ سکے۔سب سے بڑا خسارہ یہ ہوا کہ صدیوں سے بنی ہوئی عزت اور ساکھ بھی داؤں پر لگ گئی۔کل تک جو لوگ میاں کے سامنے زمین پر اکڑوں بیٹھتے تھے یا ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔اب ان کے سامنے ٹھاٹ سے سر اٹھا کر سر کنڈے کے مونڈھوں پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ خاندان کے لڑکے تعلیم یافتہ تھے اور ان کا مستقبل محفوظ تھا۔اس کے باوجود کتنے ہی نوجوان نئے امکانات اور بہتر مستقبل کی تلاش میں ہجرت کر گئے۔ پرانے لوگوں نے اپنی جڑوں سے علیحدہ ہونا گوارا نہ کیا۔اور اپنی بچی کھچی زمین، باغات، پرانی حویلیاں، امام باڑے اور خاندانی ہڑواڑ (قبرستان) کلیجے سے لگائے بیٹھے رہے۔سعید میاں بھی اپنی مختصر فیملی کے ساتھ ہجرت کر گئے۔ بڑے لوگوں کی کون کہے۔ چھوٹے لوگ بھی اکھڑ کر اِدھر اُدھر نکل گئے۔ میراثنوں کی برادری بھی تتر بتر ہو گئی۔ ججمان اور پرجا سب کا حال بے حال تھا۔ایک نئے ملک کی کچی آبادی میں اصغر باندی نے بھی اپنے خاندان کے ساتھ زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا آباد کیا۔ چھوٹی چھوٹی دو کوٹھریوں والا ایک کواٹران کا ٹھکانہ بنا۔لیکن انہوں نے حسب نسب اور عزت سب کچھ اصغر باندی نے اپنے نام کر لیا تھا۔اگر ان کے بس میں ہوتا تو دو چار بیگھہ زمین اور ایک آدھ باغ بھی اپنے ساتھ لے آتیں۔یوں بھی ان دنوں ایسی آپا دھاپی مچی تھی کہ لوگوں کو شک وشبہ کرنے کی فرصت نہیں تھی۔اصغر باندی کی برادری کے کئی خاندان لکھنؤ میں آباد تھے۔شادی غمی کے مواقع پر ان کا آنا جانا بھی لگا رہتا تھا۔امراء اور شرفاء کی تہذیب اور رکھ رکھاؤ ان کے لیے نئی چیز نہیں تھا۔اب وہ اصغری بیگم تھیں ان کے بیٹے پُتّن اور للّن۔سید احتشام حسین اور سید ابرار حسین ہو گئے تھے۔ بیٹی نے اپنا نام نہیں بدلا تھا۔بس زلیخا سے زلیخا سید ہو گئی تھی کیونکہ وہ طاہرہ سید کی فین تھی۔ البتہ ابّا نے اپنا نام نہیں تبدیل کیا۔بیٹوں نے لاکھ سمجھایا کہ کسی خاندانی زمیندار کا نام اچھّن نہیں ہو سکتا۔اب وہ سید احترام حسین ہیں۔ بیٹوں کی دھاندلی پر انہوں نے پاؤں سے جوتی اتاری تو سب نے انہیں سنکی کہہ کر گھر میں نظر بند کر دیا۔انہیں بھی کون سا حویلی کے میاں لوگوں کی خدمت میں حاضری دینا تھی۔مزے سے کھاٹ پر لیٹے حقّہ گُڑگُڑایا کرتے اور سب کو باتیں سنایا کرتے۔اس ساری پیش بندی کے باوجود میراثی کا خون اچھلنے سے باز نہیں آ سکا۔زلیخا نے ایک استاد سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔

ریڈیو پروگرام ملنے لگے۔ٹی وی آیا تو اس کی شہرت کا دائرہ بھی وسیع ہوگیا۔اسٹیج شو بھی کرنے لگی بس نجی محفلوں سے دور رہی۔دیکھتے دیکھتے ان کے دن بدل گئے۔دونوں بھائی چھوٹی موٹی ملازمت کرنے لگے۔پھر زلیخا نے انہیں بزنس کرادیا۔آواز تو بھائیوں کی بھی اچھی تھی اور وہ باپ کے ساتھ محرم میں مرثیہ اور نوحے پڑھتے۔اگر پورا خاندان گانے بجانے میں گھستا تو ان کا پول کھل جاتا۔ اس لیے احتیاط کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہے۔

اصغر باندی کے ٹھاٹ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔لش لش کرتا ریشمی شلوار سوٹ زیب تن کیے، ہاتھ گلے نازک نازک زیور پہنے، ڈائی کیے ہوئے بالوں کا جوڑا بنائے۔ہاتھ میں قیمتی پرس، کارچوبی بٹوا، الائچی، سپاری اور قوام سے بھرا رہتا تھا۔چاندی کی نفیس ڈبیا میں سلیقے سے گلوریاں چنی رہتیں۔اوپر سے ان کا رئیسانہ ٹھسّہ شہد میں ڈوبی ہوئی زبان اور مہذب اندازِ گفتگو، گویا سونے پر سہاگہ تھا۔انہیں بھی کیا خبر تھی کہ اس شہر میں میاں سید ابوالحسن کے صاحبزادے، سید سعید الحسن ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ان کی بیگم نازنین اور بیٹی یاسمین امراء کے طبقے میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔اوپر والے نے جج سعید الحسن کو عزت، شہرت اور دولت سے خوب نوازا تھا۔یاسمین ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔جس نے حسن اپنی ماں سے پایا تھا اور ذہانت باپ سے لی تھی۔میڈیکل میں یہ اس کا چوتھا سال تھا۔باپ کا ارادہ تھا کہ ان کی بیٹی لندن یا امریکہ سے ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری لائے۔جب کہ ماں اس کی شادی کرنے کے حق میں تھیں۔جج صاحب کو اونچے طبقے کی محفلوں میں بطور خاص مدعو کیا جاتا تھا۔نازنین اور یاسمین ایسی محفلوں سے دور رہنے کی کوشش کرتی تھیں۔یاسمین کو اپنی پڑھائی سے فرصت نہیں ملتی تھی اور نازنین بیگم اب تک اپنی خاندانی روایات کی اسیر تھیں۔سعید الحسن بیوی کے جذبات کی قدر کرتے تھے۔وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ ان کی بیگم آج بھی اپنے آبائی گاؤں کی پشتینی حویلی میں سانس لے رہی تھیں اور اپنی پرانی آن بان سے ان کا رشتہ ایک لمحے کے لیے نہیں ٹوٹا تھا۔وہ اپنے حویلی نما گھر کے کشادہ صحن، اونچی چھتوں والے دالان، محرابی دروں والا امام باڑہ۔رشتے داروں سے چھلکتی ہوئی حویلیاں۔شادی بیاہ کی چہل پہل، محرم کی گہما گہمی۔بڑے ابّا۔ابّا اور چچاؤں کی مردانہ بیٹھک، کچھ بھی تو نہیں بھولی تھیں۔

نازنین بیگم کو بیٹی کی شادی کا خیال آتا تو ان کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی۔یہاں جس کو دیکھو خاندانی رئیس بنا ہوا تھا۔کوئی اپنا لاکھوں کا کاروبار چھوڑ کر آیا تھا۔کوئی اپنی ریاست اور تعلقہ گنوا چکا تھا۔کسی کا رشتہ شاہی خاندان سے تھا۔ کوئی خالص نواب تھا۔غرض سب خاندانی تھے۔سب کا حسب نسب اعلیٰ تھا۔وہ جو بے میل ہڈی اور خالص سیدوں کے خون کی امین تھیں۔اس نئے ماحول اور نئی جگہ چکرائی رہتی تھیں۔کسی پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرنا مشکل تھا۔سب کی شناخت سات پردوں میں چھپی تھی۔سب کی اصل گم ہو چکی تھی۔ان کی مثال تو ایک غول بیابانی جیسی تھی اور نازنین بیگم اس غول بیابانی میں راج ہنس تلاش کرنے میں ناکام ہو چکی تھیں۔اب تو بس اللہ پر ہی بھروسہ تھا۔

زلیخا سید کی قسمت کا ستارہ ان دنوں عروج پر تھا۔کچی بستی کا کواٹر بھیانک خواب بن کر کہیں پیچھے چھوٹ گیا تھا۔اس کا اسٹیٹس ترقی کرتا ہوا ایک مہنگے علاقے تک پہنچ گیا تھا۔اس کی شاندار کوٹھی کے پورچ میں دو دو گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔امپورٹڈ گاڑی مع باوردی ڈرائیور کے اس کے استعمال میں رہتی تھی۔ دوسری گاڑی بھائی اڑائے اڑائے پھرتے تھے۔کوٹھی میں اندر اور باہر ملازموں کی فوج خدمت کے لیے حاضر رہتی تھی۔چم چم کرتی نفیس کراکری میں ڈائیننگ ٹیبل پر چھری کانٹے سے کھانا کھاتے ہوئے انہیں گاؤں میں زمین کے فرش پر بیٹھ کر تابنے کی سینی میں رکھے تام چینی کے پیالوں اور رکابیوں میں کھانا یاد نہیں تھا۔وہ لوگ اتنے بے وقوف بھی نہیں تھے کہ ایسی بیہودہ باتیں یاد رکھتے۔اگر کوٹھی کے پچھلے کمرے میں بڑے میاں پڑے کھانستے نہ رہتے تو شاید وہ یہ بھی بھول جاتے کہ وہ اچھن میراثی کی اولاد ہیں۔ابھی اس شہر میں باہر کے ملکوں کی طرح اولڈ ایج ہوم کا وجود نہیں تھا۔ورنہ بڑی آسانی سے ابّا کا بھی انتظام ہو جاتا۔ابّا کی کھوں کھوں ماضی کو پوری طرح مرنے بھی نہیں دیتی تھی لیکن شاید قدرت بھی انہیں ان کی اوقات پر رکھنا چاہتی تھی۔

جج صاحب کے دوست قمر عالم کے بیٹے نایاب عالم کا ولیمہ تھا ان کی فیملی بھی مدعو تھی۔نازنین بیگم کی طبیعت کئی دن سے خراب تھی۔اس لیے وہ یاسمین کے ساتھ اس تقریب میں شریک تھے۔میجر صاحب نے بطور خاص انہیں زلیخا سید سے ملوایا۔وہ کوئی عام گانے والی نہیں تھی۔ملک کی مایہ ناز گلوکارہ تھی اور اونچا طبقہ اس کی شمولیت کو باعث فخر سمجھتا تھا۔یہ خاص ملاقات اس لیے بھی اہمیت رکھتی تھی کہ میجر صاحب کی معلومات کے مطابق دونوں کا تعلق یوپی کے زمیندار خاندان سے تھا۔حالانکہ جج صاحب نے کبھی اپنی خاندانی برتری کا اظہار نہیں کیا تھا اور پھر وہ کسی مجبوری کی وجہ سے تو سب کچھ چھوڑ کر آئے نہیں تھے۔یہ تو سراسر ان کا اپنا فیصلہ تھا اور وقت نے بتایا کہ ان کا فیصلہ بالکل درست تھا۔یہی وجہ تھی کہ کسی نے انہیں ماضی کا رونا روتے نہیں سنا تھا۔زلیخا کو البتہ یہ خوف ستاتا تھا کہ ماضی کی بجھی ہوئی راکھ سے کوئی دبی ہوئی چنگاری اچھل کر باہر نہ آجائے اور اس کا اتنی محنت سے سنوارا ہوا حال اور مستقبل نہ پھونک دے۔یہی سبب تھا کہ اس نے شادی نہیں کی تھی۔اس کی پوری کوشش تھی کہ ایک بار اس کا تعلق کسی بڑے خاندان سے ہو جائے۔اس کی ساری امیدیں اپنے بھتیجے سید وقار حسین سے وابستہ تھیں جو عنقریب امریکہ سے ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری لے کر آنے والا تھا اور مستقبل کی ڈاکٹر یاسمین اس کے لیے موزوں شریک حیات ہو سکتی تھی۔جج صاحب کا پروقار عہدہ، اعلیٰ حسب نسب، معاشرے میں ان کی عزت، گویا سونے کی تھالی میں رکھ کر اسے وہ سب مل جاتا جس کی اس کی تمنا تھی اور جس کے لیے اس نے بہت پاپڑ بیلے تھے۔

زلیخا سید نے تقریب کے دوسرے ہی دن میجر صاحب کو فون کیا اور

باقی صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ کیجیے

گائے کہانیاں

سلام بن رزاق
(مہاراشٹر، بھارت)

"ڈھونا چھوڑ دیا ہے".

حکومت نے جب سے گؤ رکشا کا نعرہ لگایا گؤ شالاؤں کے اچھے دن آ گئے۔ سرکار کی طرف سے گؤ شالاؤں کو دیے جانے والے فنڈ میں اضافہ کر دیا گیا۔

گؤ شالاؤں کے مالکوں کے وارے نیارے ہو گئے۔

پھر کیا تھا پاٹھ شالائیں اور دھرم شالائیں چلانے والوں نے اپنی شالائیں بند کر دیں اور گؤ شالائیں کھولنا شروع کر دیں۔

☆

دیٹس اے گڈ (That's a good)

دو شخص گائے کی اسمگلنگ میں گرفتار ہو گئے، اُن میں ایک مسلمان اور دوسرا ہندو تھا۔

تھانیدار نے مسلمان سے پوچھا۔

''یہ گائے تم نے خریدی ہے؟''

''جی سرکار''

''تم قصائی ہو؟''

''نہیں سرکار، میں تو ایک گوالا ہوں، دودھ کا بیوپار کرتا ہوں''

''اچھا، جب یہ بوڑھی ہو جائے تو تم اس کو کیا کرو گے؟''

مسلمان بے چارہ کیا جواب دے، خاموش رہا۔

انسپکٹر گرجا ''ڈالو سالے کو لاک اَپ میں۔''

پھر ہندو سے پوچھا۔

''جب یہ بوڑھی ہو جائے تو تم اس کا کیا کرتے ہو؟''

''میں اِسے کسی مسلمان کے ہاتھ بیچ دیتا ہوں۔'' ہندو نے رسان سے جواب دیا۔

'' That's a good چھوڑ دو اِسے۔"

☆

گؤ شالاؤں کے اچھے دن

حکومت نے جب سے گؤ رکشا کا نعرہ لگایا گؤ شالاؤں کے اچھے دن آ گئے۔ سرکار کی طرف سے گؤ شالاؤں کو دیے جانے والے فنڈ میں اضافہ کر دیا گیا۔

گؤ شالاؤں کے مالکوں کے وارے نیارے ہو گئے۔

پھر کیا تھا پاٹھ شالائیں اور دھرم شالائیں چلانے والوں نے اپنی شالائیں بند کر دیں اور گؤ شالائیں کھولنا شروع کر دیں۔

چلو تھانے

ایک شخص کاندھے سے ایک وزنی جھولا لٹکائے ہوئے تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا جا رہا تھا۔

ایک پولیس انسپکٹر کی اُس پر نظر پڑ گئی۔ اُسے شبہ ہوا، اس نے آواز دی۔

''اے رُکو۔۔۔''

وہ شخص رُک گیا، انسپکٹر اس کے قریب گیا اور اپنے ڈنڈے کی نوک سے اُس کے جھولے کو چھوتا ہوا بولا۔

''اس میں کیا ہے؟''

''گوشت ہے سرکار۔''

انسپکٹر نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا

''گوشت۔۔۔ گائے کا؟''

شخص نے رونی آواز میں کہا۔

''نہیں سرکار بھینس کا۔''

انسپکٹر نے کڑک کر پوچھا۔

''کہاں سے لا رہے ہو؟''

شخص نے گڑگڑاتے ہوئے کہا:

''میں ایک غریب قصائی ہوں سرکار، جانور خریدنے کی طاقت نہیں ہے اس لیے دوسرے گاؤں سے خرید کر لاتا ہوں اور بیچتا ہوں۔''

انسپکٹر نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔

''کیا نام ہے تمھارا؟''

''اصغر خان''

''کیا تم نہیں جانتے بیف خریدنا اور بیچنا منع ہے۔''

''مگر بیف کا بیوپار تو ہندو بھی کرتے ہیں سرکار۔''

''مگر وہ کھاتے تو نہیں'' انسپکٹر نے ڈنڈا اس کے جھولے پر مارتے ہوئے کہا:

''چلو تھانے۔''

☆

وزیر سے انٹرویو

گائے کے تحفظ کے نام پر جب گؤ رکشکوں نے ایک خاص فرقے کے لوگوں کو نشانہ بنانا شروع کیا اور ہجومی تشدّد کا سلسلہ دراز ہوتا گیا تو ایک رپورٹر نے منتری جی سے پوچھا۔

''منتری جی! یہ گؤ رکشکوں کے ہجومی تشدّد کی خبریں آ رہی ہیں اس کی روک تھام کے لیے حکومت کیا کر رہی ہے؟''

منتری جی نے اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا

''سرکار نے دودھ سستا کر دیا ہے، اب غریب سے غریب آدمی بھی

باقی صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیجیے

کُتّے والی عورت

دیپک بُدکی
(دہلی، بھارت)

دہلی میں سیاست دانوں اور سرکاری افسروں کا کوئی شمار نہیں۔ ہندوستان کا دارالخلافہ جو ہے۔ یہاں سبھی مرکزی محکموں کے ہیڈ کوارٹر ہیں جن میں سینکڑوں ملازم نوکری کرتے ہیں۔ ملازموں کے تناسب سے افسروں کی تقرری ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں تعلقات عامہ کے لیے ریاستوں کے لیازن اور تجارتی دفاتر ہیں۔ ریل تو ریل، ملٹری کے دفاتر بھی کچھ کم نہیں۔ پھر ان کے افسروں کی بھرمار۔ بری فوج، فضائیہ اور بحریہ۔ تینوں کے ہیڈ کوارٹر یہیں پر ہیں۔ صبح کنٹونمنٹ کی طرف نکل جاؤ تو کالی موٹر کاروں کی قطار نظر آتی ہے، کسی پر ایک سٹار، کسی پر دو سٹار اور کسی پر تین سٹار لگے ہوئے۔ ایک آدھ گاڑی پر چار سٹار بھی نظر آتے ہیں۔ یہ تو افسر شاہی کی بات ہوئی۔ اس کے علاوہ غریب عوام کے چنے ہوئے لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے نمائندے ہیں اور پھر مختلف سیاسی پارٹیوں کے مرکزی دفاتر۔ غرض دہلی لوک شاہی اور افسر شاہی کا عجائب گھر ہے۔

ان افسروں کے لیے رہائشی مکانوں کی ہمیشہ قِلّت رہتی ہے۔ جدھر دیکھو سرکاری کوارٹر نظر آتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے ملازم سے لے کر بڑے سے بڑے افسر کو سرکاری مکان چاہیے۔ دہلی میں اپنا نجی گھر بھی ہو پھر بھی سرکاری فلیٹ کو قبضے میں لینا بڑی حصولیابی مانی جاتی ہے۔ اپنے فلیٹ سے کرایہ وصول کیجیے اور سرکاری فلیٹ میں خود رہیے۔ ایک بار الاٹ ہوگیا تو فلیٹ کو چھوڑنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ زندگی میں ایک بار دہلی میں آپ کی تقرری ہوگئی تو پھر اس شہر کو چھوڑنے کا جی نہیں کرتا۔ اس کے کئی وجوہات ہیں، ایک تو یہ کہ آپ مقتدر اعلیٰ کے نزدیک ہیں اور اپنی بھلائی کے لیے دوڑ دھوپ کر کے ان کی بارگاہ تک رسائی پا سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دہلی کی تعلیم کا معیار دوسرے شہروں کی نسبت بہت ہی اونچا ہے۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک سکول ہیں، کالج ہیں، یونیورسٹیاں ہیں، تکنیکی تعلیم کے لیے نامور کالج ہیں اور پھر نائٹ کالج ہیں جہاں آپ غروب آفتاب کے بعد تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور اپنا کیریئر بنا سکتے ہیں۔ مرکزی ریاست ہونے کے باعث ان اداروں میں دھاندلیاں قدرے کم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملازم پیشہ لوگ اس شہر کو ترجیح دیتے ہیں۔

شیتل جب انڈین اکاونٹس اینڈ آڈٹ سروس کے لیے منتخب ہوئی اسے پروبیشن کے لیے جگہ جگہ گھومنا پڑا۔ پروبیشن ختم ہوا تو اس کی پہلی پوسٹنگ دہلی میں ہوئی۔ بہت مدت پہلے اس کے پتا جی آئی اے ایس کے رکن تھے مگر کار ایکسیڈنٹ کے سبب جوانمرگ ہوگئے۔ تاہم اس کا اثر و رسوخ ابھی تک برقرار تھا۔ تبادلے میں کبھی کوئی دقت پیش آتی تو آئی اے ایس سرکل میں ان کا نام لینا ہی کافی تھا۔ نتیجے میں شیتل دہلی میں ایک دفتر سے دوسرے دفتر اور دوسرے سے تیسرے دفتر میں منتقل ہوتی رہی۔ زیادہ کچھ ہوجاتا تو دہلی ہی میں کسی دوسرے محکمے، منسٹری یا پبلک سیکٹر انڈر ٹیکنگ میں ڈیپوٹیشن پر چلی جاتی۔ وہاں چند برس گزار کر پھر اپنے محکمے میں واپس۔ اس طرح اس نے اپنے کیریئر کے بارہ سال گزارے۔ ایک بات جو دیکھنے میں آئی وہ یہ کہ ان بارہ برسوں میں شیتل نے سول سروس افسروں کا میس کبھی نہیں چھوڑا۔ دو کمروں کا فلیٹ اس کی ضرورتوں کے لیے کافی تھا اور وہ بھی دہلی کے مرکزی علاقے میں۔ پھر افسروں کا انسٹی ٹیوٹ، لائبریری اور کینٹین بھی کمپلکس میں ہی دستیاب تھے۔ گیٹ کے باہر سبزی اور پرچون کا مارکیٹ تھا۔ اور نزدیک ہی سنٹرل گورنمنٹ ڈسپنسری بھی۔ اور کیا چاہیے ایک ناکتخدا لڑکی کو جس نے طے کرلیا ہو کہ وہ عمر بھر کنواری رہے گی۔

میں روزانہ صبح و شام اسے اپنے کُتّے کو گھماتے ہوئے دیکھتا تھا۔ چھوٹے قد کا سفید پیرین کُتّا تھا، بگلے کی طرح سفید، لمبے لمبے نرم ملائم بال، دھیمی آواز میں بھونکتا تھا اور عام طور پر کسی کو کاٹتا نہیں تھا مگر سنا ہے کہ کوئی اس کی مالکن کو ہاتھ لگاتا تو وہ جھٹ اس پر حملہ کر دیتا اور اپنے نکیلے دانت اس کے جسم میں پیوست کر دیتا۔ صبح سویرے دفتر جانے سے پہلے وہ اسے زنجیر لگا کر حوائج ضروریہ کے لیے ہوسٹل سے باہر لے جایا کرتی تھی مگر ہوسٹل کے احاطے میں نہ قلادہ کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ ہی زنجیر کی، آزادانہ طور پر گھومتا رہتا تھا۔ رات کو جب وہ دفتر سے لوٹ کر آتی تو خود بھی کھانا کھاتی اور کُتّے کو بھی کھلاتی۔ پھر دونوں سیر کرنے کے لیے ہوسٹل سے باہر چلے جاتے۔

شیتل خود بھی گوری تھی، قد قدرے چھوٹا تھا، جسم بھی ہلکا پھلکا تھا، بدن کے ابھار کہیں بھی نمایاں نہ تھے، لڑکوں کی مانند بال چھوٹے تراشے ہوئے تھے اور چہرے پر سنجیدگی و متانت چپکی رہتی تھی۔ اس کا لباس پہننے کا طریقہ بہت ہی عمدہ تھا۔ زیادہ تر سفید، ہلکے نیلے اور سبز رنگ کے کپڑے پہنا کرتی جن پر کہیں کوئی شکن نظر نہیں آتی تھی۔ کانوں میں دو پتلی سی بالیاں لٹکتی تھیں جبکہ بائیں ہاتھ کی انگلی میں ایک پتلی سی انگوٹھی تھی جس میں ہیرے جڑے تھے۔ بایں ہمہ مجھے نہ جانے کیوں اس پری پیکر میں کہیں کوئی دبی ہوئی درد کی لہر سی محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

میرا کام میرے چھوٹے بیٹے نے آسان کر دیا۔ وشال میں نہ جانے ایسی کونسی کستوری ہے کہ وہ منٹوں میں جانوروں سے دوستی کر لیتا ہے اور وہ اس کے گرویدہ ہوجاتے ہیں۔ کئی بار میرے منع کرنے کے باوجود اس نے چڑیا گھر میں کئی خونخوار جانوروں سے مصافحہ کر لیا۔ ایک روز شیتل اپنے کُتّے کو گھما رہی تھی کہ میرے بیٹے نے اسے گڈ مارننگ کہا اور پھر اس کے کُتّے کو پیار کر کے اسے گود میں اٹھا لیا، یہاں تک کہ اس کے منہ کو بھی چوم لیا۔ شیتل بس دیکھتی رہ گئی۔ وہ حیران تھی کہ یہ چھوٹا سا بچہ اتنا دلیر کیسے ہوسکتا ہے؟ اس واقعے کے بعد دونوں ایک دوسرے

کے دوست بن گئے۔

چھٹی کے دن وشال کبھی کبھی شیتل کے پاس چلا جاتا اور دونوں آپس میں جانوروں کی فطرت، رویےاوران کے پالنے کے طریقے پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔شیتل نے وشال کی دلچسپی کو دیکھ کر اسے کتّوں سے متعلق اپنی ذاتی لائبریری میں سے دوخوبصورت جہازی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں جو وشال نے کم اور میں نے زیادہ دھیان سے پڑھیں۔کبھی کبھار میں اور میرا بیٹا اکٹھے سیر کرنے کے لیے نکل جاتے تو شیتل سامنے دکھائی دیتی، انجام کار ہم دونوں میں بھی علیک سلیک ہونے لگی۔

اسی دوران میں وشال کو منی پال کے انجینئرنگ کالج میں سیٹ مل گئی۔سب سے اجازت لے کر وہ کرناٹک چلا گیا۔اس نے شیتل کو بھی اپنی روانگی کی اطلاع دی۔شیتل نے اسے کبھی کتابوں کا تقاضہ نہیں کیا اور اگر کیا بھی ہوگا تو وشال نے سنی ان سنی کر دی ہوگی۔لیکن اس کی بےفکری نے مجھے سنہری موقع میسر کیا۔ایک روز چھٹی کے دن میں نے شیتل کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔اس نے پہلے دروازے کے پیپ ہول سے اطمینان کیا کہ باہر کون ہے، پھر مجھے پا کر دروازہ کھول دیا۔میرے بغل میں اس کی دو کتابیں تھیں جنھیں وہ گھور رہی تھی۔

''ہیلو،آپ؟''

''گڈ آفٹرنون۔دراصل میں آپ کی یہ دو کتابیں لوٹانے آیا ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ وشال منی پال چلا گیا ہے۔کب آئے گا کچھ معلوم نہیں۔ مجھے تو اس کی لاپروائی کا علم ہے۔اس لیے سوچا کہ خود ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور کتابیں لوٹا دوں۔''

'' آپ کھڑے کیوں ہیں، بیٹھ جایئے۔''اس نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔کتابیں ابھی میرے ہی پاس تھیں۔وہ جلدی سے کچن میں چلی گئی اور ٹھنڈی شربت بنا کر لے آئی۔پھر گویا ہوئی۔''آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی، مجھے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ وشال یہ کتابیں نہیں لوٹائے گا پھر بھی اس کے جذبے اور دلچسپی کو دیکھ کر میں نے اس کو یہ بیش قیمتی کتابیں دی تھیں۔''

''میری زندگی کا اصول کچھ عجیب سا ہے۔میں امانت میں خیانت کرنا پسند نہیں کرتا خاص کر جب معاملہ کتاب کا ہو۔یہی بات بچوں کو بھی سکھاتا رہتا ہوں مگر ان پر تو غفلت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔''

''اوہ آئی سی۔''اس نے ہنس کر جواب دیا۔''میں نے تو کہیں پڑھا تھا کہ وہ آدمی بیوقوف ہوتا ہے جو کسی کو اپنی کتاب مستعار دیتا ہے اور پھر وہ آدمی اس سے بھی بڑھ کر بیوقوف ہوتا ہے جو کتاب واپس کر دیتا ہے۔میں کسی کو اپنی کتابیں نہیں دیتی مگر نہ جانے وشال نے ایسا کیا سحر کر دیا کہ اسے دینے سے خود کو روک نہیں پائی۔ہی ازاے لٹل سویٹ ہارٹ۔''

''تو آپ مجھ کو ڈبل بیوقوف سمجھ لیجیے۔''میں نے بھی اس کی ہنسی میں ہنسی ملائی۔

اس کے بعد میں نے دونوں کتابیں اس کے حوالے کر دیں اور اجازت لینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔لیکن اس نے روک لیا اور کہنے لگی۔''آیئے میں آپ کو اپنی ذاتی لائبریری دکھاتی ہوں۔''

میں اس کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرے میں چلا گیا جو دراصل اس کا بیڈروم تھا۔وہاں کتابوں کا ایک بہت بڑا انبار لگا ہوا تھا۔دائیں بائیں، اوپر نیچے، ہر جگہ کتابیں ہی کتابیں نظر آ رہی تھیں یہاں تک کہ چھت تک شیلف لگے ہوئے تھے جن میں کتابیں سجی ہوئیں تھی۔مجھے تعجب ہوا کہ وہ ایسے ماحول میں کیسے سوتی ہوگی۔کتابوں سے صاف ظاہر تھا کہ اسے آرٹ، لٹریچر اور موسیقی میں زیادہ دلچسپی ہے۔اکثر کتابیں انہی تین موضوعات پر تھیں۔وہ پھر گویا ہوئی۔''دِس از مائی سمال لٹل لائبریری۔''

''یو کال اِٹ سمال لٹل! اِٹ از اے ہیوج کلکشن۔مجھے بھی ان سبجکٹس میں کافی دلچسپی رہی ہے۔''

''اوہ آئی سی۔''

تھوڑی دیر بعد دونوں ڈرائنگ روم میں لوٹ آئے اور اس نے کوفی پینے کے لیے اصرار کیا۔اس کی میزبانی کو دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔شیتل نے اخروٹ کی مانند اپنے بیرون کو اس قدر سخت، سنجیدہ اور تہدید آمیز بنا رکھا تھا کہ کوئی اس کے درون کی ملائمت اور نرمی کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔لیکن مجھے خوش قسمتی سے اس کے اندر جھانکنے کا موقع مل گیا۔کوفی پی کر میں نے دوبارہ اجازت مانگی کہ اس نے کہا۔''آپ کو کوئی کتاب پسند آئی ہو،تو آپ لے جا سکتے ہیں۔آئی ٹرسٹ یو۔''

میں نے اس کو غور سے دیکھا، پھر دونوں واپس بیڈروم کی طرف چل دیے اور میں نے اپنی پسند کی دو کتابیں اٹھالیں،اس کے بعد شکریہ کہہ کر رخصت ہوا۔اپنی پسند کی کتابیں تو میں برٹش لائبریری سے ہر ماہ لاتا تھا مگر میں شیتل سے قطع تعلق نہیں کرنا چاہتا تھا،اس لیے سوچا کہ کتاب کا لین دین تعلقات کے تسلسل کے لیے مفید رہے گا۔اس کے بعد میرا اس کے گھر آنا جانا لگا رہا۔ایک روز اس نے بتایا کہ اس کے والدین بچپن ہی میں اس کو داغ مفارقت دے کر چلے گئے تھے۔اس کا ایک بھائی فوج میں تھا جس کو وہ بہت چاہتی تھی مگر وہ پنجاب میں دہشت گردوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔چنانچہ اکلوتی وارث تھی اس لیے والدین اور بھائی کی پنشن اور جائیداد مل گئی جس کو اس نے اپنی زندگی سنوارنے کے لیے استعمال کیا۔بھائی کی کمی وہ ہمیشہ شدّت سے محسوس کرتی رہی۔اس دفعہ رکھشا بندھن کے دن میں اچانک اس کے گھر پر حاضر ہوا اور میری کلائی پر راکھی باندھنے کی درخواست کی۔راکھی میں اپنے ساتھ ہی لے کر گیا تھا۔وہ حیران ہو گئی ۔پھر بڑی ندامت سے مجھے دیکھنے لگی۔کچھ دیر بعد وہ کچن میں جا کر تھالی میں سندوردانی اور کچھ پھول لے کر آئی۔اس نے میرے ماتھے پر ٹیکا لگایا اور میرے

بازو پر راکھی باندھ دی۔ پھر وہ واپس کچن میں جا کر چائے اور مٹھائی لے کر آ گئی ۔اس کے چہرے پر جتنی خوشی میں نے اس دن دیکھی اتنی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بھائی بہن کے رشتے کے تقدس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا ہمراز و ہمدرد بنایا۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنی زندگی کی کتاب میرے سامنے کھول کر رکھ دی۔

باتوں باتوں میں ایک بار میں نے اسے پوچھا کہ وہ لوگوں سے کچھی کچھی کیوں رہتی ہے اور شادی کیوں نہیں کرتی ؟اس کی عمر نکلتی جا رہی تھی۔ پھر زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں تھا، کب کونسی مصیبت آ جائے کسے معلوم، کم سے کم کوئی تو ساتھی ہونا چاہیے جو ایسے وقتوں میں کام آئے۔ وہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی، پھر ایسے بولتی چلی گئی جیسے طغیانی کے سبب دریا بہتا چلا جا رہا ہو۔

''دراصل میرے والدین کا دیہانت اس وقت ہوا جب میں بارہ برس کی تھی۔ ان کی موت ایک ایکسیڈنٹ کے باعث ہوئی تھی۔ اپنی کار میں شملہ سے آ رہے تھے کہ ایک ٹرک کے ساتھ ٹکر ہوگئی اور موقعے پر ہی دونوں نے دم توڑ دیا۔ گھر میں میں اور میرا بڑا بھائی رہتا تھا۔ وہ مجھ سے پانچ سال بڑا تھا۔ اس کو فوج میں جانے کا بہت شوق تھا۔ بڑی محنت کر کے این ڈی اے میں داخلہ لیا اور پھر ٹریننگ کے بعد بحیثیت سیکنڈ لیفٹننٹ سرحد پر چلا گیا۔ کہتا تھا دو سال کی بات ہے پھر جہاں رہوں گا تمھیں ساتھ رکھوں گا۔

پتا جی کے ایک چھوٹے بھائی تھے جو ہمارے ہی شہر میں رہتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ چنانچہ میں اکیلی ہوں اور گھر میں کوئی دیکھ بھال کرنے کے واسطے نہیں ہے اس لیے میں ان کے گھر میں منتقل ہو جاؤں۔ میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد ہامی بھر لی اور اس طرح ان کے ساتھ رہنے لگی۔ گھر میں ان کی بیوی اور دو بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک کی عمر میرے برابر تھی اور دوسری تین سال چھوٹی تھی۔ میرے چاچا جی گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے، شراب پینے کی بری عادت تھی اور نشے میں اناپ شناپ بولتے تھے۔ خیر میں نے ان کی زندگی میں جھانکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ چاچی نے کئی بار مجھ سے کہا کہ اس کا شوہر بہت پیتا ہے، پی کر بہک جاتا ہے، نشے میں دھت اس کے ساتھ گالی گلوچ کرتا ہے اور پھر پیٹتا بھی بہت ہے مگر میں نے اس معاملے کو کوئی اہمیت نہیں دی کیونکہ میں سوچتی تھی کہ تین چار سال کی بات ہے، تب تک میں بارہویں کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخلہ لوں گی اور وہیں پر ہوسٹل میں رہا کروں گی یا پھر بھائی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔

سال بھر معاملہ یوں ہی چلتا رہا پھر ایک دن چاچا کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔ انھوں نے چاچی اور لڑکیوں کو ننیہال اس لیے بھیج دیا کہ وہاں پر نانی کی طبیعت بہت خراب ہو چکی تھی۔ اس طرح ہم دونوں گھر میں اکیلے تھے۔ رات کو میں نے اپنے اور چاچا جی کے لیے کھانا تیار کیا اور ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔ ان کے منہ سے شراب کی تیز بدبو آ رہی تھی مگر میں نے ان دیکھی کر کے خود کو بچا لیا اور کھانے میں مگن ہوگئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ میرے کمرے میں آئے اور چکنی چپڑی باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتوں میں عریانیت عود کر آ گئی۔ وہ کبھی میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے رہے اور کبھی میری انگلیوں سے کھیلتے رہے۔ میں نے کسی خفگی کا اظہار نہیں کیا حالانکہ مجھے اندیشوں نے گھیر لیا تھا اور میں اندازہ لگا رہی تھی کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ میں نے فریج سے پانی کی بوتل لانے کا بہانا ڈھونڈ لیا اور اپنے کمرے سے باہر نکل گئی۔ چپکے سے صدر دروازہ کھولا اور مچھلی رات میں بگ ٹٹ بھاگتی رہی۔ نزدیک ہی ایک سہیلی کا گھر تھا، وہاں پر دستک دی ۔اس نے مجھے اپنے پاس پناہ دی۔

سہیلی کی ماں نے مجھے مستقبل کے لیے رہنمائی کی۔ وہ ایک سکول میں پرنسپل تھی، شوہر نے اس کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے شادی کر لی تھی، مگر اس نے اپنے دونوں بچوں کو اپنے پاس رکھ لیا اور الگ کرائے کے مکان میں شفٹ ہوگئی۔ اس نے خود زندگی کی کٹھنائیوں کو جھیلا تھا، چنانچہ عورت تھی اس لیے میرے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھ سکتی تھی اور مجھے صحیح راستہ دکھانے میں کوئی تامّل نہیں کیا۔ اس نے میرے بھائی کو چھٹی لے کر چند روز کے لیے گھر آنے کے لیے تار بھیج دی۔ بھائی آیا، میں نے اس کو سارا ماجرا سنایا اور اس نے وائی ڈبلیو سی اے ہوسٹل میں میرے رہنے کا انتظام کیا جس میں میری سہیلی کی ماں نے بہت مدد کی۔ میرے بھائی نے بنک میں میرا اکاونٹ کھلوا کر اس میں کافی رقم جمع کر لی اور مجھے زندگی میں آگے ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ یہ سلسلہ بہت مدّت تک یوں ہی چلتا رہا جب تک میں نے گریجویشن کر لی۔ اس دوران میرے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بھائی نے آپریشن بلیو سٹار میں حصہ لیا اور شہید ہوگیا۔ میں حواس باختہ ہوگئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ جی میں آئی کہ خودکشی کر لوں مگر سہیلی نے مجھے ایسا سوچنے سے منع کر لیا اور ہمت و حوصلے سے جینے کی تلقین کی۔ اس کی ماں نے بھی میری ڈھارس بندھائی۔ کہا تمھیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تمھارے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کافی ملکیت ہے، ٹھاٹھ سے جی سکتی ہو۔ مکان کرائے پر اٹھا لو اور خود ہوسٹل میں رہو۔ یونیورسٹی میں ایم اے کا داخلہ لے لو اور وہاں پر میں ہوسٹل میں تمھارے رہنے کا انتظام کرا لوں گی۔ کبھی کوئی پریشانی ہو تو ہم تو ہیں ہی۔

آخر کار میں نے ایک جانب ایم اے میں داخلہ لیا اور دوسری جانب انڈین سول سروسز امتحان میں شرکت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ خوش قسمتی سے امتحان میں کامیابی ملی اور مجھے انڈین اکاونٹس اینڈ آڈٹ سروس میں الاٹ کیا گیا۔ تب سے یہی کوشش کرتی رہی کہ دہلی میں تعینات رہوں۔ چونکہ پتا جی آئی اے ایس افسر تھے، ان کے جاننے والے بہت دوست ہیں جو وقتاً فوقتاً میری مدد کرتے ہیں۔ ابھی تک کوئی خاص مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔''

''بہن، تمھارے ساتھ جو کچھ ہوا بہت افسوس ناک ہے۔ میں تمھاری حالت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ نہ جانے یہ نئی تہذیب کی اُپج ہے یا پھر ہمارے سنسکاروں کا تنزّل ہے۔ پھر بھی تم خوش نصیب ہو کہ بچ نکلی ورنہ اس دنیا میں قدم قدم پر شکاری کُتّے مل جاتے۔ چاچا جی کے بعد تمھیں اچھے لوگوں سے واسطہ پڑ گیا، بُرے مل جاتے تو نہ جانے کیا ہوتا؟'' میں نے شیتل کی اشک شوئی کی۔ جب سے

اسے میں نے بہن بنالیا تھا میں اس کو چھوٹی بہن سمجھ کر ہی مخاطب ہوتا۔

''ہاں یہ تو ہے۔دوسری بات یہ بھی ہے کہ پتا جی نے سمجھداری سے کافی کچھ بچا کر رکھ لیا تھا اور نہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا۔''

''مگر شیتل، تم نے یہ نہیں بتایا کہ شادی نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟''

''سچ پوچھو تو مجھے مرد ذات ہی سے نفرت ہوگئی ہے۔جب سے چاچا جی کے ساتھ مُٹھ بھیڑ ہوگئی مجھے ہر مرد شیطان کی اولاد نظر آتا ہے۔حالانکہ ان کو اپنے کیے کی سزا مل گئی، بیوی اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر میکے میں جا بسی اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئی۔اب تو وہ بالکل اکیلا پڑ گیا ہوگا اور سنا ہے کہ شراب پی کر سڑکوں پر لڑھک جاتا ہے۔میں نے کبھی ان لوگوں سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔اُدھر سہیلی کی ممی نے جو اپنی رام کہانی سنائی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔عورت انتہائی حساس ہوتی ہے اور اپنی بے وقری برداشت نہیں کر پاتی۔جوانی لوٹ کر کوئی اس کو منجھدار میں چھوڑ جائے وہ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔انہی باتوں کے سبب مجھے اندیشوں نے گھیر لیا۔کل کو میرا شوہر بھی چاچا جی کی طرح ہی ہو تو پھر میں کیا کروں گی، کہاں جاؤں گی؟ ایسے لوگ تو کُتّے ہوتے ہیں جہاں دیکھو منہ مارتے رہتے ہیں۔''

''بہن، تمھارے تجربات کچھ ایسے ہیں کہ میرے پاس ان کا جواب ہی نہیں۔دراصل روایتاً ہمارے معاشرے میں شادی کا رواج بڑی اہمیت رکھتا ہے۔یہ ایک ایسا ادارہ ہے جسے لوگ مستقبل کے تحفظ کا ضامن سمجھتے ہیں۔عورتیں یہ جان کر بھی کہ ان کے شوہر باہر کسی دوسری عورت کے ساتھ گُھرّے اڑاتے ہیں یا قحبہ خانوں کے چکّر مارتے ہیں، ان سے نباہ کرنے پر قانع رہتی ہیں۔انھیں معلوم ہے کہ الگ ہوجانے کے بعد سماج ان پر ہی انگلیاں اٹھائے گا کیونکہ نرینہ عصبی سماج کسی مرد کو مورِدِ الزام نہیں ٹھہراتا۔تاہم اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔کچھ مرد اس بات سے آگاہ ہوتے ہیں کہ ان کی بیوی کسی غیر مرد سے تعلق رکھتی ہے پھر بھی وہ پردہ پوشی کرنے میں ہی مصلحت سمجھتے ہیں۔کہاوت ہے کہ گھر کی بیوی ہانڈی گھر کُتّوں جوگا۔اس کی وجہ یا تو عدم تحفظ ہے یا خود اعتمادی کی کمی ہے یا پھر بچوں کا خیال ہے۔دراصل انسانی رشتے اس برف کے تودے کے مانند ہیں جس کا دس فیصد حصہ نظر آتا ہے اور نوّے فیصد حصہ پانی میں غائب رہتا ہے۔میٹرو پولیٹن شہروں میں تو زیادہ ہی خراب حالت ہے، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ ہمیشہ لگی رہتی ہے اور ازدواجی وفاداری کا گراف روز بروز نیچے گرتا جا رہا ہے۔''

''بھائی صاحب، آپ نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دیا۔ایسے ماحول میں جہاں ایک فریق دوسرے فریق پر بھروسہ نہیں کرتا اور اس کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتا ہے، ازدواجی بندھن بے معنی بن جاتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو بھٹکے ہوئے جسم دن بھر کی تگ و دو کے بعد رات کو ایک ہی جائے پناہ میں شرن لینے آتے ہیں اور رات بھر صبح ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ایک دوسرے کے ساتھ بے تعلقی سے بات کرنا اور چند جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنا زندگی نہیں کہلاتا۔اس وقت میں ہوں، میری اپنی دنیا ہے اور میری اپنی آزادی ہے جس میں کسی کی شرکت مجھے منظور نہیں۔''

''تمھاری بات سے میں صد فیصد متفق ہوں۔اگر انسان کسی طور دوسرے انسان سے ایڈجسٹ نہیں کر سکتا تو اسے اکیلا ہی رہنا چاہیے۔گھٹ گھٹ کر جینے سے کیا فائدہ؟'' دریں اثنا میری نظر دیوار پر ٹنگی گھڑی پر پڑی۔رات کے دس بج چکے تھے۔بہت دیر ہوچکی تھی۔اس لیے میں نے شیتل سے اجازت لی اور اپنے گھر چلا گیا۔اس روز کے بعد میں نے شیتل سے ازدواجی مسئلے پر کبھی کوئی بات نہیں کی۔

سال بھر کے بعد میرا ٹرانسفر آسام ہوا۔شیتل کے ساتھ میرا رابطہ خط و کتابت کے ذریعے بدستور برقرار رہا۔ان دنوں موبائل کا چلن عام نہیں تھا۔ہاں کبھی کبھار ٹیلی فون پر بات ہوتی تھی۔شیتل مجھے ہر برس راکھی بھیجنا نہیں بھولتی تھی۔

ایک روز اس نے ٹیلی فون پر مُژدہ سنایا۔''بھائی صاحب، آپ کو ایک خوشخبری دینا چاہتی ہوں۔''

میں دفعتاً سوچ میں پڑ گیا۔''معلوم نہیں کیا بات ہوگی.....؟''

کچھ وقفے کے بعد شیتل گویا ہوئی۔''میں نے مقامی یتیم خانے سے دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں گود لے لیں۔بڑی پیاری بچّیاں ہیں۔گھر اب بھرا بھرا سا لگتا ہے، سوچا پہلے آپ کو خبر دے دوں۔''

- بقیہ -

گائے کہانیاں

دودھ کا سیوَن کر سکتا ہے۔''

رپورٹر نے مائک منتری جی کے مزید قریب کرتے ہوئے پھر پوچھا۔

''گو رکشکوں کے نام پر سماج کے بعض غنڈہ عناصر بے گناہوں کو قتل کر رہے ہیں۔حکومت نے اب تک اس سلسلے میں کیا کیا ہے؟''

منتری جی نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا

''دیش میں ماہی گیری کو خوب بڑھاوا مل رہا ہے، اب تو ہم مچھلیوں کی برآمد بھی کرنے لگے ہیں۔''

رپورٹر نے پھر اصرار کیا۔

''مگر وہ گو رکشکوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

منتری جی کی کار دھیرے دھیرے رینگنے لگی تھی، منتری جی بولے

''مجھے ایئرپورٹ پہنچنا ہے، باقی باتیں آئندہ۔''

اور منتری جی کی کار آگے بڑھ گئی۔

اِنَّھُمْ فَعَلُوْھَا

جمیل عثمان
(نیویارک)

دمشق کی سڑکوں پر ایک نیم پاگل سا شخص چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ لباس تار تار، جسم نزار، سر پر غبار، آنکھوں میں وحشت، چہرے پر گھبراہٹ، چال میں لڑکھڑاہٹ، برہنہ پا، برہنہ گریبان، نہ راستے کا تعین، نہ منزل کا نشان، نہ دیدے ٹھکانے پر تھے نہ اسے کسی بات کا ہوش تھا، بس سڑکوں پر چلا جاتا تھا جیسے مدہوش تھا۔ بہت کم کھاتا تھا اور بہت کم سوتا تھا۔ نہ کسی سے آنکھ ملا کر بات کرتا تھا نہ کسی کی بات سنتا تھا۔ نہ کسی کو اس کے خاندان کا علم تھا اور نہ اس کا کوئی گھر تھا۔ دن رات وہ سڑکوں پر مارا مارا پھرتا۔ تھوڑی دیر کے لیے کہیں پڑ کر سو رہا، پھر اٹھا اور وہی سڑکیں ناپنے لگا۔ لوگ اسے رجلِ مجنون کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ کسی سوال کا جواب نہیں دیتا اور نہ خود کسی سے کوئی سوال کرتا۔ لوگوں نے اس کے منہ سے کوئی دوسری بات کبھی سنی ہی نہیں۔ سوائے اس ایک جملے کے:

ھَلْ صَحِیْحَۃ، اِنَّھُمْ فَعَلُوْھَا!؟

(''کیا یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ یہ سب کچھ کر گزرے؟'')

وہ کون لوگ تھے جن کی یہ مجذوب شخص بات کرتا تھا؟ ان لوگوں نے کیا کیا تھا؟ وہ کون سا ایسا فعل تھا جس کے بارے میں یہ شخص رٹ لگائے ہوئے تھا کہ ''کیا وہ یہ سب کچھ کر گزرے؟''

کسی نے اس سے پوچھنے کی کوشش کی مگر اس کے منہ سے تو دوسری کوئی بات نکلتی ہی نہ تھی۔ جب منہ کھولتا یہی کہتا ''کیا یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ یہ سب کچھ کر گزرے؟'' سڑکوں پر چلتے پھرتے وہ بس یہی ایک جملہ دہراتا رہتا ''کیا یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ یہ سب کچھ کر گزرے؟'' اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ ''کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟ کس نے کیا کیا ہے؟'' تو وہ خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا اور پھر وہی جملہ دہرا دیتا۔ ''کیا یہ صحیح ہے کہ وہ یہ سب کر گزرے؟'' لوگ تنگ آ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے۔ برسوں گزر گئے، کسی نے اس کے منہ سے کوئی دوسرا جملہ نہیں سنا۔ کئی سال بیت گئے وہ شخص اسی طرح دمشق کی گلیوں میں گھومتا رہا اور وہی ایک جملہ دہراتا رہا۔

ھَلْ صَحِیْحَۃ، اِنَّھُمْ فَعَلُوْھَا!؟

مجذوب کی بڑ سے کسے دلچسپی ہو سکتی تھی؟ لوگوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ رجلِ مجنون کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نہ اس کے منہ سے کوئی دوسرا جملہ نکلا۔

مزید کئی برس بیت گئے۔ پھر ایک مسافر دمشق میں وارد ہوا۔ مسافر نے جب مجذوب کی بڑ سنی تو اسے یہ ''بڑ'' نہیں معلوم ہوئی۔ ''اس جملے کے پیچھے ضرور کوئی گہرا راز پوشیدہ ہے۔'' مسافر نے سوچا۔ ''کیا یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ یہ سب کچھ کر گزرے؟'' مسافر سوچتا رہا۔ یہ پاگل کن لوگوں کی بات کر رہا ہے۔ وہ کون لوگ تھے اور انہوں نے ایسا کون سا فعل کیا تھا؟

ایک روز مسافر مجذوب کے راستے میں آ گیا۔ مسافر کے ہاتھوں میں روٹی کے چند ٹکڑے اور کھجوریں تھیں۔ اس نے مجذوب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''روٹی کھاؤ گے؟'' اس نے پوچھا۔

مجذوب تھوڑی دیر کو رُکا۔ شاید اس روز اسے بھوک لگی تھی اس نے روٹی اور کھجوریں لے لیں۔

''بیٹھ جاؤ'' مسافر نے اس سے کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ دونوں روٹی کھانے لگے۔ کھانے کے دوران ہی مسافر نے سوال کیا۔

''وہ کون لوگ تھے جن کی تم بات کرتے ہو۔ انہوں نے کیا کیا تھا؟''

مجذوب مسافر کی طرف ایک لمحے کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

''کیا یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ یہ سب کچھ کر گزرے؟''

''کون لوگ؟ کن کی بات کر رہے ہو تم؟''

مگر مجذوب نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کھانا چھوڑ کر وہی جملہ رٹتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔

''کیا یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ یہ سب کچھ کر گزرے؟''

مسافر نے اس کے بعد بھی کئی بار کوشش کی مگر مجذوب اس ایک جملے کے سوا اور کچھ کہتا ہی نہیں تھا۔

ایک روز جب شام کی پیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور سائے لمبے ہو گئے تھے۔ درختوں پر چڑیاں اپنے گھونسلوں میں جانے سے پہلے شور مچا رہی تھیں۔ تندروں پر نانبائی روٹیاں لگا رہے تھے اور دن بھر مشقت کرنے والے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے تب مسافر اپنے سرائے سے نکلا اور تھیلی کندھے پر لٹکائے ہوئے ایک طرف کو چل پڑا۔ اچانک مجذوب پر اس کی نظر پڑی جو ایک جانب بھاگا چلا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا ''ھَلْ صَحِیْحَۃ، اِنَّھُمْ فَعَلُوْھَا!؟'' مسافر اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس بار مجذوب شہر سے باہر بہت دور نکل گیا۔ مسافر اس کے پیچھے ہی چل رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ کر مجذوب رک گیا اور جھونپڑیوں کے درمیان ایک درخت کے نیچے بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھ گیا اور اپنا جملہ دہرانے لگا۔۔

ایک جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک بوڑھا شخص ہاتھ میں لالٹین لئے ہوئے باہر آیا۔

مسافر دور کھڑا دونوں کو دیکھ رہا تھا اور ان کی آواز بھی سُن رہا تھا بوڑھا کہہ رہا تھا ''میں سمجھ گیا تھا کہ یہ تو ہی ہے۔ تیری آواز میری کُٹیا میں آ گئی تھی۔'' پھر اس نے لالٹین اوپر کیا اور مجذوب کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولا ''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تُو نے؟ اب تو ہوش ٹھکانے پر لے آ! آج کتنے برس بیت

گئے مگر تو ہے کہ اس کیفیت سے باہر آتا ہی نہیں!''

جواب میں مجذوب نے اپنا وہی رٹا ہوا جملہ دہرا دیا۔''کیا یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ یہ سب کچھ کر گزرے؟''

''اچھا تو بیٹھ یہاں۔ میں تیرے لیے کچھ کھانے کو لے آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر بوڑھا اپنی کُٹیا میں گیا اور مٹی کے ایک پیالے میں شوربا اور چند روٹیاں لے آیا۔ آج مجذوب نے سیر ہو کر کھایا۔ بوڑھے نے اسے پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ وہیں ڈھیر ہو گیا اور خرّاٹے لینے لگا۔

مسافر جواب تک دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، قریب آیا اور بوڑھے کو سلام کر کے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''بھائی تم کون ہو؟''

''میں مسافر ہوں اور دمشق کے ایک سرائے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟

''ہاں جانتا ہوں۔''

''یہ آدمی نہ کھاتا پیتا ہے، نہ سوتا ہے، نہ اسے اپنے تن من کا ہوش ہے۔ یہ دن رات دمشق کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا ہے اور ایک ہی جملہ کہتا رہتا ہے ''هَلْ صَحِيْحَة، اِنَّهُمْ فَعَلُوْهَا!؟'' کیا آپ بتا سکتے ہیں یہ کن لوگوں کی بات کر رہا ہے اور اس کی یہ حالت کیسے ہوئی؟''

بوڑھے نے گہری نظروں سے مسافر کو دیکھا اور کچھ سوچنے لگا، جیسے خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر یوں گویا ہوا۔''یہ شخص میرا پڑوسی تھا۔ اچھا بھلا محنت مزدوری کرنے والا انسان، میری اور تمہاری طرح ایک صحیح الدماغ آدمی۔۔۔! دس سال پہلے کی بات ہے۔ بوڑھا آسمان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ یہ شخص دمشق کے بازار کسی کام سے گیا تھا تو اس نے ایک قافلے کو گزرتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک بند دوکان کے دروازے سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا اور اس قافلے کو گزرتا دیکھتا رہا۔ اونٹ کی ننگی پیٹھ پر رسول زادیاں برہنہ سر بیٹھی آہ وزاری کر رہی تھیں۔ نواسۂ رسولؐ امام حسینؓ کا سر نیزے کی انی پر قافلے کے آگے آگے لے جایا جا رہا تھا۔ امام کے سرِ مبارک کے ساتھ ساتھ بیتِ نبویؐ کے اور بھی بہت سارے شہدا کے سر نیزے کی انیوں پر تھے۔ امام زین العابدینؒ کو زنجیروں میں باندھ کر اور ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر گھسیٹا جا رہا تھا۔ اگر ان کی رفتار کم ہو جاتی تو ان پر کوڑے برسائے جاتے۔ بی بی زینبؓ بار بار انہیں بچانے کے لیے دوڑ پڑتیں۔ چھوٹے بچے نقاہت اور غنودگی کی وجہ سے اونٹوں سے گر پڑتے۔ اونٹ رکوائے جاتے اور بی بی زینبؓ، امام زین العابدینؒ کے ساتھ انہیں اٹھانے جاتیں۔ کتنے معصوم ایسے حادثے میں وہیں دم توڑ جاتے۔''

بوڑھا خاموش ہو گیا اور سوئے ہوئے مجذوب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا''اس شخص نے وہ تمام مناظر دیکھے اور بی بی زینبؓ کی تقریر بھی سنی تھی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔۔۔ دس برس بیت گئے۔ اس کے منہ سے کوئی دوسرا جملہ نہیں نکلا۔ بس ایک ہی سوال کیے جاتا ہے۔۔۔''کیا واقعی وہ لوگ یہ سب کر گزرے؟''

اتنے میں مجذوب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور بوڑھے اور مسافر کی طرف دیکھ کر پوچھتا ہے''هَلْ صَحِيْحَة، اِنَّهُمْ فَعَلُوْهَا!؟''اور بھاگتا ہوا اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے۔

بقیہ :عزت دار

ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے جج صاحب کا فون نمبر اور ایڈریس بتا دیا۔ زلیخا نے جج صاحب سے ملاقات کا وقت طے کر لیا۔ البتہ اپنی غرض چھپالی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اپنی شامت کو آواز دے رہی ہے اور چھپانے والی چیز ماضی کے پردوں سے پوری سفاکی سے باہر آنے والی ہے۔ زلیخا ماں کے ساتھ جج صاحب کی کوٹھی پر پہنچی تو انہوں نے اس کا بڑی عزت سے استقبال کیا۔ جس وقت ماں بیٹی ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھا رہی تھیں ان کا ڈرائیور گاڑی سے مٹھائی کے ڈبّے اور پھلوں کی ٹوکریاں ملازم کی مدد سے اندر رکھوا رہا تھا۔ جج صاحب نے بڑے تپاک سے انہیں بٹھایا۔ نازنین بیگم اندر تھیں اور یہ سارا تام جھام بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ زلیخا سید سے وہ پہلے کبھی نہیں ملی تھیں لیکن اتنی مشہور گلوکارہ کی آمد بلا سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ جوان بیٹی کی ماں تھیں۔ اس لیے منوں کے حساب سے مٹھائی اور پھل دیکھ کر کچھ کچھ اندازہ ضرور تھا کہ آنے والے مہمان کسی خاص مقصد سے ہی آئے ہیں۔

جس وقت انہوں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا اصغری بیگم اپنا خاندانی شجرہ بڑے فخر سے جج صاحب کے گوش گزار کر رہی تھیں۔

''ہمارا تعلق لکھنؤ کے قریبی قصبے پینتے پور سے ہے۔ خدا بخشے سید ابوالحسن رئیس میرے بھائی تھے اور۔۔۔

اچانک نازنین بیگم نے چیخ ماری۔

''اصغر باندی۔ تم۔۔!!!''

اور نئی حویلی کے دالان میں گمکتی ہوئی ڈھولک ایک دھماکے سے پھٹ گئی۔ حویلی کا سارا ملبہ ان کی جان پر گر پڑا۔ ان دھماکوں نے اصغر باندی کے ساتھ زلیخا سید کے بھی پرخچے اڑا دیے تھے اور ماں بیٹی پھٹی پھٹی آنکھوں سے حویلی کی چھوٹی بٹیا کو دیکھ رہی تھیں۔

بے خبر قاتل

سید نصرت بخاری
(اٹک)

وہ کئی مہینوں سے بے ہوشی کی زد میں تھی۔ ہوا یوں کہ وہ اپنے ابو کے ساتھ بازار چلی آئی۔ کام کچھ نہ تھا۔ گھر میں بے کار بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی تھی۔ جب دیکھا کہ ابو بازار جا رہے ہیں تو ساتھ ہولی۔ بازار پہنچ کر ابو خریداری کے لیے بازار میں گم ہو گئے لیکن پہلے اس سے پوچھا تھا:

بیٹا! میرے ساتھ چلو گی یا یہیں گاڑی میں بیٹھی رہو گی"۔

"ابو! میں یہیں ٹھیک ہوں"۔

" کچھ کھانے کے لیے لا دوں؟"۔

"برگر اور کولڈ ڈرنک کہیں سے لا دیں تو اچھا ہے" بس یہ اسی برگر کی

ابو اس کو برگر اور کولڈ ڈرنک دے کر چلے گئے۔ ابو نے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی لیکن بازار کی گہما گہمی نے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی بچی بہت مہارت سے بھیک مانگ رہی ہے۔

"دے دے اللہ کے نام پر"۔ بھیک مانگتے ہوئے اس کی ننھی سی ہتھیلی خود بخود پھیل جاتی ہے۔ لیکن لوگ اس کی اداکاری سے متاثر نہیں ہوتے اس لیے اس کی ہتھیلی ناکام ہی لوٹتی ہے۔ اس نے ترس کھاتے ہوئے بچی کو پاس بلایا اور دس روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ دس روپے کے بوجھ سے ننھی سی ہتھیلی سرخ ہونے لگی تھی۔ اتنے میں اس کے ابو بھی آ گئے۔ ڈھیر ساری چیزیں اُن پر سوار تھیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ ایک شخص اُن کی طرف لپکا۔ اُس کے ہاتھ میں خون آلود چھری تھی۔ یہ بہروپیا تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں پر سرخ رنگ گرا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں چھری بھی لکڑی کی تھی اور اس پر بھی سرخ رنگ لگا رکھا تھا۔ لیکن ہر آنکھ اس حقیقت سے کہاں واقف تھی۔ بہروپیا جب یہ دیکھتا کہ کوئی سادہ لوح آدمی اس کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر گھبرانے لگتا تو یہ فوراً اس کو گھیر لیتا اور کہتا:

"نکال بیس روپے ورنہ چھری ماروں گا"۔ گھبراہٹ کی زیادتی جن حرکات کو جنم دیتی اس سے پورا ماحول شوخ ہو جاتا۔ ایک آدمی کی قربانی کچھ دیر کے لیے فضا سے افسردگی چوس لیتی۔ لیکن جو شخص بہروپیے کی حقیقت سے آشنا ہوتا، اس کی ڈانٹ بہروپیے کی چھری کو سرنگوں کر دیتی۔ اس کے ابو بہروپیے کی حقیقت سے آگاہ تھے اس لیے اس کو ڈانٹ دیا۔ جب وہ جا چکا تو مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے:

"آپ کی جیب سے پیسے نکالنا کوئی آسان تھوڑی ہے"۔ اُن کا ایک پرانا دوست جانے کہاں سے آ گیا تھا۔

''بھئی ساری زندگی تم جیسے بہروپیوں میں گزاری ہے؛ یہ تو کچھ بھی نہ تھا''۔ اس کے ابو نے جواب دیا۔ دو چار باتیں کرنے کے بعد اُن کا دوست چلا گیا۔

"بیٹا! تھک تو نہیں گئی ہو؟"۔ انھوں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھی بیٹی سے پوچھا۔ جب اس نے کوئی جواب نہ دیا تو انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ سیٹ پر اس کا بے ہوش وجود بکھرا پڑا تھا۔ وہ گھبرا گئے۔ فوراً پچھلی سیٹ پر آئے اور اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

"بیٹا! ہوش میں آؤ۔ بیٹا! ہوش میں آؤ"۔ ان کی چیخ پکار نے ہجوم اکٹھا کر لیا۔

"وہ سامنے کلینک ہے۔ ان کو فوراً ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔ ڈاکٹر صاحب کلینک میں موجود ہیں"۔ کسی آدمی نے مشورہ دیا تو ایک جوان دوڑتا ہوا کلینک میں گیا اور سٹریچر لے آیا۔ سٹریچر پر ڈال کر اسے کلینک پہنچا دیا گیا۔

"اس نے بازار میں کچھ کھایا پیا تو نہیں تھا" ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے اس کے ابو سے پوچھا

"ایک برگر ابھی کھایا ہے۔" اس کے ابو نے جواب دیا

وجہ سے ہوا ہے۔ بازار کی چیزیں کھانے کھلانے سے پرہیز کریں۔ آج کل بازار کا حال تو آپ کو معلوم ہے۔ ہوٹلوں میں گدھوں اور کتوں کا گوشت کھلایا جا رہا ہے۔ صفائی کا برا حال ہے۔ ہر چیز بازار میں کھلی پڑی ہے۔ گرد پڑ رہی ہے، کھیاں بیٹھ رہی ہیں لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ابھی ڈرپ لگا دیتا ہوں، اس کے بعد یہ دوائیاں کھلائیں۔ انشاءاللہ ٹھیک ہو گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں"۔

تب سے آج تک کئی ڈاکٹروں کی مسیحائی آزمائی جا چکی تھی۔ لیکن اصل بیماری ہنوز روپوش تھی۔

"اس کا نظام ہاضمہ درست نہیں"۔ ایک ڈاکٹر کی رائے تھی۔

"اس بیماری کا تعلق دل سے ہے"۔ ایک اور ڈاکٹر کی تشخیص بولنے لگی۔

" ذہنی دباؤ اس مرض کا سبب معلوم ہوتا ہے۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کیا کریں"۔

"ان دنوں بچوں کے امتحانات ہو رہے ہیں ممکن ہے اس نے وہ ٹینشن لے لی ہو"۔ بہتر ہے یہ اس سال امتحان نہ دے ورنہ بیماری زیادہ ہو کر پاگل پن کی صورت اختیار کر لے گی"۔ اس ڈاکٹر کی رائے دوسرے ڈاکٹروں سے مختلف تھی۔ اس ڈاکٹر کے مشورے نے اس سے امتحان چھین لیا۔

ہوتا یوں تھا کہ یہ بیٹھے بٹھائے کوئی خیال اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر کے اس کا اظہار بے جان کر دیتا اور جب بے ہوشی کے چنگل سے نکلتی تو اسے کچھ یاد نہ آتا اور نہ اسے اس بات کا پتا چلتا کہ وہ بے ہوش ہوئی تھی۔ پریشانی نے بالخصوص اس کے والدین کو بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔ گھر میں جوان بیٹی بیماری کا ہدف ہو تو والدین کا پریشان ہونا فطری عمل ہے۔ اس کی بیماری کی وجہ سے اس کے والدین اس کو تقریبات میں نہیں بھیجتے تھے کہ مبادا وہاں بیمار ہو کر کسی کی تقریب متاثر کرے یا

کسی حریص کی نظریں اس کے بے ہوش وجود کی توہین کریں۔ اِس وقت بھی اُس کی ایک سہیلی کی معصوم منت سماجت اِس کے والدین کے پیشِ نظر تھی کہ اسے اُس کی شادی میں ضرور بھیجیں۔ دیگر سہیلیوں کی تائید بھی اُسی کے پلڑے میں تھی۔

"بیٹا! مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ کو تو اس کی بیماری کا پتا ہے"۔ اِس کی امی اسے سمجھا رہی تھیں۔

"میں ہر طرح کی گارنٹی دیتی ہوں، اسے کچھ نہیں ہوگا۔ میری اور سہیلیاں بھی آرہی ہیں۔ ہم سب کی یہی خواہش ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر اِسی سے پوچھ لو۔ اگر وہ جانا چاہتی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے؛ مجھے تو خوشی ہوگی اگر یہ پہلے کی طرح دوڑے، بھاگے، اچھلے کودے۔ سہیلیاں اس گھر آئیں، یہ اُن کے گھر جائے"۔ اس کی امی کی آواز میں دکھ شامل ہوتا جاتا تھا۔

"میں خود تمھاری شادی میں شریک ہونا چاہتی ہوں لیکن کہیں میری وجہ سے آپ کی شادی کی تقریب خراب نہ ہو جائے۔ اس لیے بہتر ہے ضد نہ کرو"۔ اِس کی مجبور آواز میں بہت درد تھا۔

"بس بس۔ زیادہ بی اماں بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں ادھر ہی سے گزروں گی۔ تمھیں ساتھ لیتی جاؤں گی۔ اگر تو تیار نہ ہوئی ناہم نے یہاں آ کر تیری شادی کر دینی ہے"۔ منیرہ نے اس کا کان مروڑتے ہوئے کہا۔

" کس کے ساتھ؟" ہر زبان کی نوک پر یہی شرارتی سوال تھا۔

"میرے ساتھ"۔

'تو اس کا کیا بگاڑ لے گی وہ لڑکی بولی جس کی شادی ہونے والی تھی۔

"بس بس۔ بہت چہک رہی ہے۔ تجھ سے تو ہفتے بعد پوچھیں گے، جب بہت کچھ بگڑ چکا ہوگا"۔ اس بات پر لڑکیوں کا زوردار قہقہہ کمرے سے نکل کر پورے گھر میں پھیل گیا۔ اس خوش گوار فضا میں منیرہ ہی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر آئے۔ شادی والے دن وہ منیرہ کے ساتھ جانے کے لیے تیار تو ہو رہی تھی لیکن اس کے اندر کا خوف اسے بار بار جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی عالم میں تھی کہ دروازے کی گھنٹی نے کسی کی آمد کی اطلاع دی۔ اس کی امی دروازہ کھول رہی تھیں۔

"خالہ فضیلت کہاں ہے"۔

"بیٹا! اپنے کمرے میں ہوگی"۔

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی فضیلت کے کمرے میں آئی جہاں میک اَپ صورت سنوارنے میں مصروف تھا۔

"فضیلت! دیکھو! میں نے کتنی اچھی مہندی لگوائی ہے"۔ منیرہ نے اپنی ہتھیلیاں نچاتے ہوئے کہا۔

منیرہ کی سرخ ہتھیلیاں دیکھتے ہی اس کی آنکھوں نے دروازے بند دیے۔ اس پر بے ہوشی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اسے فوراً اس لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچایا گیا جس کی شہرت فضیلت کے گھر تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی امی نے اُسے موجودہ ساری صورتِ حال بتائی۔

"میری مانیں تو آپ بچی کی شادی کر دیں"۔ لیڈی ڈاکٹر نے الگ نوعیت کا علاج تجویز کیا۔

"دیکھیے نا! مہندی دیکھ کر بے ہوش ہونے کا مطلب تو یہی ہے کہ اس کے دل میں بھی اس بات کا ارمان موجود ہے اور میرے خیال میں یہی اس کا علاج بھی ہے"۔

پریشانی نے پہلے ہی اس کے والدین کو مضطرب کر رکھا تھا، اس نئی صورت حال نے انھیں اور بھی بے چین کر دیا۔ جب تک مکمل صحت یاب نہ ہو اس کی شادی کر دینا کہاں کی عقل مندی ہے اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ شادی کے بعد وہ تندرست ہو جائے گی؛ اور بیٹیوں کی شادی کرنا کون سا آسان کام ہے۔ فضیلت پر منگنی کا جوا تو کب کا رکھا جا چکا تھا۔ اس کی انگلی نے ماموں زاد کی طرف سے انگوٹھی بھی پہن رکھی تھی لیکن بیٹی کے والدین ہوتے ہوئے انھیں اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ انھیں شادی کا کہیں؛ لیکن فضیلت کے ابو کے اصرار پر اس کی امی نے اپنے بھائی کے سامنے یہ امتحان رکھ ہی دیا۔

"بھائی آپ فضیلت کا رشتہ اُٹھا لیں۔ ڈاکٹر کہتی ہے یہی اس کی بیماری کا علاج بھی ہے"۔

"باجی! آپ جانتی ہیں شبیر کو نئی نئی نوکری ملی ہے۔ ایک دم تو ناممکن ہے اور اگر اس کا یہی علاج ہے تو آپ بے شک کہیں اور اس کی شادی کر دیں؛ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ سب نصیب کی بات ہے"۔

فضیلت کی ماں نے اپنے بھائی کی گفتگو میں چھپا انکار صاف محسوس کر لیا تھا۔ یہی بھائی جو پہلے اس رشتے کے لیے اتنی منتیں کرتا تھا، آج اس نے کتنی آسانی سے راستہ بدل لیا تھا۔

جب بھائی بہن کا بوجھ نہ اُٹھا سکے تو کسی اور سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے؛ اس لیے وہ اللہ کے آسرے پر گھر میں ہی بیٹھ کر کسی معجزے کا انتظار کرنے لگی۔

ایک دن ایک جاننے والی آئی اور کہنے لگی:

"ہسپتال تو آپ نے سارے دیکھ لیے، کسی پیر فقیر کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا ہے"؟

"نہ بھئی نہ۔ میں پیروں فقیروں کے چکر میں نہیں پڑتی۔ میں نہیں مانتی ان کو۔ روز ٹی وی پر ان کے کرتوت دیکھتی ہوں۔ میری جوان بیٹی ہے۔ وہاں غنڈے بدمعاش ان کے مرید بن کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ مال پیسے، عزت آبرو، سب کچھ تو وہ ظالم لوٹ لیتے ہیں"۔

"توبہ توبہ کر۔ اللہ کا کلام پڑھتے ہیں۔ نیک لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ ان کی سنتا ہے۔ اب اگر کوئی نقلی پیر بن کر لوگوں کو لوٹنے لگے تو اس میں ان اللہ والوں کا کیا قصور۔ انسان کو خود بھی تو اصلی نقلی کی پہچان ہونی چاہیے"۔

"آج کل پیر فقیر کہاں ہیں، سب ڈاکو ہیں۔ پیروں ولیوں کی منکر نہیں ہوں لیکن اُن کا دور گزر گیا۔ جن کی بات میں اثر ہوتا تھا، جن کی دعا قبول ہوتی تھی؛ وہ دنیا سے اُٹھ گئے"۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ آخر کار فضیلت کی ماں کو بھی پیر صاحب کے پاس آنا پڑا۔ یہاں بہت بھیڑ تھی۔ اکثریت خواتین کی تھی۔ کوئی بیٹے کے روزگار کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ کسی کے ماتھے پر اولاد کی تمنا لکھی ہوئی تھی۔ کسی کا کوئی عزیز کھو گیا تھا، کسی کے گھر سے جھگڑا نہیں جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ ایک احساسِ محرومی ہر ایک چہرے پر درج تھا۔

"دیکھ اپنی آنکھوں سے دیکھ۔ جعلی پیروں کے ایسے آستانے ہوتے ہیں؟" اس عورت نے اپنے پیر کی فضیلت جتاتے ہوئے کہا۔

"پیر صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ اس کمرے میں بیٹھتے ہیں۔" عورت نے ایک نیم تاریک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں تو بہت رش ہے۔ شام ہو جائے گی"۔

"یہاں اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے"۔

"تُو تو یہاں آتی رہتی ہے، جان پہچان ہو گی، کچھ ہو نہیں سکتا؟"

"ہونے کو تو ہو سکتا ہے لیکن پیر صاحب کہتے ہیں کہ کسی کا حق مارنے سے برکت جاتی رہتی ہے۔ اس لیے انتظار تو کرنا پڑے گا"۔

کئی گھنٹے انتظار کا بوجھ سہنے کے بعد ان کا بلاوا آیا۔

"اسے کیا تکلیف ہے؟" پیر صاحب نے پوچھا۔

اس کی والدہ نے بیماری کی تفصیلات پیر صاحب کے سامنے پیش کر دیں۔ اس دوران میں ان کی نظریں چادر میں لپٹی فضیلت کے وجود کی تلاشی لے رہی تھیں۔

اس پر جن کا سایہ ہے جو کسی ویرانے میں رہتا تھا؛ اِس بچی نے اس کے بچے کو پاؤں سے کچل ڈالا تھا، جس کا یہ منحوس انتقام لے رہا ہے۔ اس پر کوئی عام دم درود اثر نہیں کرے گا کیونکہ یہ مسلمان نہیں ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک وظیفہ کرنے کے لیے تمام لوگوں کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا؛ جب کمرہ خالی ہو گیا تو انھوں نے ایک دائرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فضیلت کو حکم دیا:

"چادر اُتار کر اس دائرے میں کھڑی ہو جاؤ"۔ جب فضیلت کے ہاتھ یہ جرأت نہ کر سکے تو انھوں نے خود چادر اُتار کر پرے پھینک دی اور چار اطراف سے چھڑی کی مدد سے آہستہ آہستہ اس کے کپڑے جھاڑنے لگے۔ اس عمل کے اختتام پر وہ ایک تولیہ لے کر کچھ پڑھتے ہوئے اس کا بدن کو صاف کرنے لگے۔ اچانک تولیہ پھینک کر وہ اس کے گرد تیز تیز چکر لگانے لگے:

"کمینے! بھاگتا کہاں ہے۔ ابھی تجھے جلا کر خاک کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر انھوں نے سامنے آ کر فضیلت کو دبوچ لیا۔ ان کا ایک ہاتھ اس کی کمر دبوچ چکا تھا جب کہ دوسرا ہاتھ گریبان سے الجھ بیٹھا تھا۔ فضیلت کے لیے یہ صورتِ حال خلافِ توقع تھی اس لیے وہ گر کر بے ہوش ہو گئی کیونکہ گرتے گرتے اس نے سرخ رنگ کی چھت دیکھ لی تھی، لیکن بے ہوش ہونے سے پیشتر اس کی چیخ کمرے سے باہر بیٹھی اس کی ماں کی سماعت پر دستک دے گئی تھی جس کی وجہ سے وہ لوگوں کے منع کرنے کے باوجود دوڑتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ وہاں پیر صاحب کے ننگے پیروں میں اس کی بیٹی کی بے ہوش گٹھڑی پڑی تھی۔

"بہت طاقت ور ہے منحوس"۔ پیر صاحب بڑبڑاتے ہوئے اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"اس وقت اس کو لے جاؤ بی بی۔ ہفتے بعد پھر آنا لیکن اس طرح دوڑ کر کمرے میں گھسنا ٹھیک نہیں؛ تمھاری مداخلت سے وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا"۔

فضیلت کی ماں دو تین خواتین کی مدد سے اسے کمرے سے باہر کھینچ لائی اور اس کے پاس بیٹھ کر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگی۔

"کتنی خوب صورت بچی ہے، کسی کی نظر لگ گئی ہو گی"۔ ایک عورت نے رحم کھاتے ہوئے اس کا غم بانٹنے کی کوشش کی۔

"کچھ سمجھ نہیں آتا بہن۔ کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا لیکن مرض پکڑا ہی نہیں جا رہا۔"

دونوں خواتین کافی دیر وہاں بیٹھ کر بدصورت دنیا کی غیبت کرتی رہی۔ اسی دوران میں فضیلت کی بے ہوشی اس کا وجود چھوڑ کر جا چکی تھی۔ وہ اسے لے کر سڑک پر آ گئی۔ اچانک کہیں سے ایک بہروپیا نمودار ہوا۔ اس نے اپنے کپڑوں پر سرخ رنگ گرا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں چھری بھی لکڑی کی تھی اور اس پر بھی سرخ رنگ لگا رکھا تھا۔ لیکن ہر آنکھ اس حقیقت سے کہاں واقف تھی۔

"امی! امی! یہی ہے یہی ہے جس نے ابو کو چھری ماری تھی؛ اب یہ ہمیں بھی مار ڈالے گا" فضیلت نے چیختے ہوئے امی سے کہا اور زمین پر گر پڑی؛ اسی دوران میں اس کی سہمی ہوئی روح پرواز کر گئی۔

عجائب نامہ

فرعون دنیا کا واحد شخص ہے جس کی مرنے کے تین ہزار سال بعد پاسپورٹ بنا۔

فرعون کا پاسپورٹ 1974 میں بنایا گیا کیوں کہ فرعون کی نعش کو محفوظ رکھنے کے لیے کچھ مرمت فرانس میں ہونی تھی۔

اور فرانس میں بنا پاسپورٹ نعش بھی داخل نہیں ہو سکتی اس لیے فرعون کا پاسپورٹ بنایا گیا۔

''گھر کی بہار''

بشیر بدر
(بھوپال، بھارت)

یوں ہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر میں رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

ابھی راہ میں کئی موڑ ہیں کوئی آئے گا کوئی جائے گا
تمہیں جس نے دل سے بھلا دیا اسے بھولنے کی دعا کرو

مجھے اشتہار سی لگتی ہیں یہ محبتوں کی کہانیاں
جو کہا نہیں وہ سنا کرو جو سنا نہیں وہ کہا کرو

کبھی حسن پردہ نشیں بھی ہو ذرا عاشقانہ لباس میں
جو میں بن سنور کے کہیں چلوں مرے ساتھ تم بھی چلا کرو

نہیں بے حجاب وہ چاند سا کہ نظر کا کوئی اثر نہ ہو
اسے اتنی گرمیِ شوق سے بڑی دیر تک نہ تکا کرو

یہ خزاں کی زردسی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمہارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو

○

محمود الحسن
(راولپنڈی)

داغِ حسرت کے سوا کچھ اور بھی ہے دل میں کیا
ہے فریبِ آرزو ہی سعیِ لاحاصل میں کیا

یہ تو پرتو ہے، تری کوتاہیِ تدبیر کا
تُو نے دیکھا ہے کبھی کچھ اور بھی غزل میں کیا

یہ فقط اک مستقل آسودگی ہے مآل
خستگی ہی خستگی ہے اور ہے ساحل میں کیا

اہلِ ہمت کس طرح تسکین پائیں گے یہاں
جاں بلب جدوجہد ہے اور ہے غزل میں کیا

اب تو آ پہنچی ہے اے دل غزلِ آخرِ قریب
ہو رہا ہے مضمحل ذوقِ طلب بھی دل میں کیا

تُو نے دیکھا ہی نہیں اُس شوخ کا حسن و جمال
ورنہ اے چشمِ تحیّر ہے مہ کامل میں کیا

قیس آخر ڈھونڈتا پھرتا ہے محمل میں کسے
جھانک کر دیکھا نہیں ہے اُس نے اپنے دل میں کیا

حضرتِ محمود کتنے زندہ دل تھے اور اب
دل گرفتہ ہی رہے خلوت میں کیا محفل میں کیا

○

اختر شاہجہاں پوری
(بھارت)

میرا حالِ زبوں رقم کر دے
یا مجھے صاحبِ قلم کر دے

رنگ جو منتشر فضا میں ہیں
تو، جو چاہے انہیں بہم کر دے

یا نہ بڑھنے دے دردِ دل میرا
یا میری زندگی کو کم کر دے

یہ جو ہنستے ہیں غم رسیدوں پر
ان کو بھی واقفِ اَلم کر دے

باغیانہ مزاج ہے تیرا
اپنا سر اس طرح نہ خم کر دے

دھجّیاں ہیں جو میرے دامن کی
تو انہیں جوڑ کے بہم کر دے

ایک خط ایسا لکھ کے دیکھ اختؔر
اس کی آنکھوں کو بھی جو نم کر دے

○

غالب عرفان
(کراچی)

جہاں سر بہ سجدہ ہوئی جبیں ترا در نہیں تھا کچھ اور تھا!
مرے جسم سے جو قلم ہوا مرا سر نہیں تھا کچھ اور تھا

دمِ آخریں مری عمر کے سبھی روز و شب نظر آئے تو
وہ طویل و طول مسافتوں کا سفر نہیں تھا کچھ اور تھا

مری فکر نے ترے عکس کو کیا منتقل جو فضاؤں میں
تو مرے وجود پہ جو چھا گیا وہ اثر نہیں تھا کچھ اور تھا

بلا جدّ و جہد اُسے جو ملا وہ خیال سے بھی تھا ماورا
مجھے جو ملا میری کاوشوں کا ثمر نہیں تھا کچھ اور تھا

شبِ خونچکاں کے نصاب میں جو جگا رہا تھا ساعتیں
نئے آفتاب کی صبح کا وہ گجر نہیں تھا کچھ اور تھا

مری انگلیاں جسے لکھ گئیں مرے عشق کی وہ کتاب تھی
ترا حسن جو مجھے دے گیا وہ ہنر نہیں تھا کچھ اور تھا!

○

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

آپ سے میری ملاقات نہیں ہوتی ہے
اس مسافت میں یہاں رات نہیں ہوتی ہے

ہم یہ کہتے ہیں کہ طوفان بپا ہو جائے
دل یہ فرمائے کہ برسات نہیں ہوتی ہے

اس میں اک پھول کا امکان ہوا ہے پیدا
دل میں آلام کی بہتات نہیں ہوتی ہے

آنکھوں آنکھوں ہی میں کٹ جائے گی جیتے مرتے
رات اتنی بھی تو بدذات نہیں ہوتی ہے

بات اتنی سی ہے ہم بات بھلا بیٹھے ہیں
آپ سے بھول کے بھی بات نہیں ہوتی ہے

ایک شاعر نے کہا آپ پلٹ کر دیکھیں
اتنا بتلائیں یہ خیرات نہیں ہوتی ہے

آخری عمر کا یہ زہر ہے کھا لو ثاقبؔ
ایسی پھر تلخیٔ حالات نہیں ہوتی ہے

○

مہندر پرتاپ چاندؔ

(انبالہ، بھارت)

متاعِ درد کو پھر سے سجا رہا ہوں میں
پھر آج اپنے لہو میں نہا رہا ہوں میں

ستم تو یہ ہے کہ تُو بھی مجھے سمجھ نہ سکا
تمام عُمر ترا ہم نوا رَہا ہوں میں!

بلند تر ہوں فلک سے، جنوں ہے نام مرا
ہر ایک دور میں اپنا خدا رہا ہوں میں

تعلقات کی ڈوری ہی کٹ نہ جائے کہیں
اسی غرض سے اُسے پھر منا رہا ہوں میں

وہی ہے میری کہانی کا مرکزی کردار
اُسی کو اپنی کہانی سُنا رہا ہوں میں

جمودِ ذہن کی دیوار اب تو ٹوٹے گی
خیال و فکر کے پنچھی اُڑا رہا ہوں میں

کبھی تو اپنی مرادوں کے پھول مہکیں گے!
تمام عمر یہی سوچتا رہا ہوں میں

یہ ایک بات ہی کیا کم ہے وجہِ فخر مجھے!
ہمیشہ تیرا رہینِ وفا رہا ہوں میں

قریب تر تھا رگِ جاں سے جو مجھے اے چاندؔ!
کہاں کہاں نہ اُسے ڈھونڈتا رہا ہوں میں!

○

نسیمِ سحر
(راولپنڈی)

مُجھ کو بچا کے آپ جو گیلا درخت ہے
اللہ کے کرم کا وسیلہ درخت ہے

لہجوں میں کاش ذائقہ اُس کا بھی آ سکے
جو میٹھی چھاؤں دیتا رَسیلا درخت ہے

مَیں آدمی کے روپ میں ظاہر ہوا تو ہوں
لیکن در اصل میرا قبیلہ درخت ہے

اُس شاخِ گُل نے دیکھ کے بے ساختہ کہا
کیسا جوان، چھیل چھبیلا درخت ہے !

بے حد قریب رات کی رانی کِھلی ہوئی
خوشبو میں مست مست، نشیلا درخت ہے

اِتنا غُبار پھیلا ہوا تھا فضاؤں میں
کچھ یوں لگا، وُہ ریت کا ٹیلہ درخت ہے

میرے بدن کی کھال بھی اُس نے اُتار دی!
رندے سے جب کسی نے بھی چھیلا درخت ہے

کوئی وہاں پڑاؤ نہیں ڈالتا کبھی
موجود جس زمین پہ نیلا درخت ہے

چڑیوں کے بولنے کی صدائیں تھیں وہ نسیم
اور مَیں سمجھ رہا تھا، سُریلا درخت ہے!

○

واصف حسین واصف
(امریکہ)

آنکھیں نکالی ہیں تو منظر بھی مر گیا
میں کس سے پوچھتا، مرا رستہ کدھر گیا

وہ کیا گئی کہ روشنی چکھنے سے ہم گئے
خوشبو چھوئے بھی ایک زمانہ گزر گیا

اک فون پر ہی، لذتِ ہجراں تمام شد
پھر یہ ہوا کہ درد کا دریا اتر گیا

کیسی غزل سرائی، کہاں فکر وفن کی بات
چشمِ غزال اُٹھی تو زعمِ ہنر گیا

یہ معجزہ ہوا ہے، مرے اک سوال پر
دنیا سے اٹھا،اور خدا اپنے گھر گیا

کاجل سے اس نے آنکھوں میں تحریر کیا لکھی
ابیاتِ داغ سے بھی زباں کا اثر گیا

دامانِ گل، قبائے صبا خواب کیا ہوئے
کہ اجتہاد حسن کا سارا سفر گیا

لو! برف ریز ہو گئیں ہاتھوں کی انگلیاں
واصف حسین ہجر ملا، لمس مر گیا

○

شوق انصاری

(فیصل آباد)

دل کی نشوونما ضروری ہے
اس لیے دِل ربا ضروری ہے
کار ہائے نمود میں دائم
آگ پانی ہوا ضروری ہے
کیا بتائیں وفا شعاروں کو
کس قدر بے وفا ضروری ہے
وقت ہی کارساز ہوتا ہے
وقت پر اکتفا ضروری ہے
آدمی ہوں کہاں فرشتہ ہوں
میری خو میں خطا ضروری ہے
شوقؔ فن کے قیام کی خاطر
اہلِ فن کی بقا ضروری ہے

شاہین مفتی

(گجرات)

حکایتِ غم دل خوشگوار تھوڑی ہے
یہ کوئی قصۂ باغ و بہار تھوڑی ہے
ذرا سے ابرِ تلطف سے کیسے ڈھل جائے
دلوں کا میل ہے گرد و غبار تھوڑی ہے
ہم اس وفورِ محبت سے مر بھی جائیں تو کیا
ہر اک مزارِ وفا یادگار تھوڑی ہے
نہ صاحبانِ ضرورت نہ سائلانِ وفا
کسی قطار میں اپنا شمار تھوڑی ہے
بساطِ سود و زیاں سب لپیٹ کر رکھیئے
نشاطِ نغمہ گری کاروبار تھوڑی ہے
اُس ایک وعدہ شکن کے کلامِ شریں پر
یقیں تو خیر مگر اعتبار تھوڑی ہے

اشرف جاوید

(لاہور)

مکالمے سے کوئی راستہ نکالوں گا
اُسے دلیل سے یا پیار سے منالوں گا

کوئی ضروری ہے احسانِ کوزہ گر لینا؟
اُٹھا کے دستِ دعا ہی دیا بنا لوں گا

نکل رہے ہیں نئے بال و پَر ارادوں کے
قفس گمان کا اِس بار توڑ ڈالوں گا

کماں میں تیر کی صورت چڑھا لیا اُس نے
کسی بھی لمحے نشانِ ہدف کو جا لوں گا

ہوا چلی تو اُڑائے گی خاک چار طرف
شکستہ وعدوں کا ملبہ کہاں سنبھالوں گا

شجر کی آگ بدن سے لپٹ رہی ہے، مگر
میں غل مچاتے پرندے کا گھر بچا لوں گا

سفر تمام اکیلے ہی کاٹنا ہے مجھے
اِسی بہانے ذرا ہمّت آزما لوں گا

علاجِ زخمِ محبت کہاں ہوا ممکن!
تری تسلّی کی خاطر اُسے دکھا لوں گا

چلا تو آئے، وہ بے شک زباں سے کچھ نہ کہے
میں ساری باتیں بھلا کر گلے لگا لوں گا

○

فکرت

محمد بشیر مالیر کوٹلوی
(بھارت)

گلی بڑی تنگ تھی لوگوں کی آمدورفت کے پیشِ نظر اشفاق انصاری نے اپنی اے سی گاڑی باہر ہی ایک بند دوکان کے آگے کھڑی کر دی۔ گاڑی سے باہر نکل کر اُس نے اپنی شرٹ کا اوپر والا بٹن کھولا اور بڑبڑایا ''توبہ۔۔۔اس بار گرمی کا آغاز اس قدر تپتا ہوا ہے تو آگے چل کر کیا حال ہوگا؟؟'' گاڑی لاک کر کے وہ چابی کا چھلا انگلی میں گھماتا ہوا بین الاقوامی سطح کے افسانہ نگار جن کو لوگ اُن کے بلند کردار اور اخلاق کی وجہ سے رام جی کے نام سے ہی پکارتے تھے کا مکان پوچھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ گلی کے درمیان میں پہنچ کر ایک آدمی کی نشاندہی پر وہ رام جی کے گھر کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُن کے گھر کا دروازہ کھلا تھا اور برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے تپائی پر دونوں ایڑیاں رکھے کسی کتاب کے مطالعہ میں غرق تھے۔ آگے بڑھ کر انصاری نے چابی سے دروازہ ناک کیا تو رام جی نے نظریں اٹھا کر اُسے بغور دیکھا اور مسکرا کر بولے:

''چلے آیئے۔۔۔!اندر آ جایئے۔۔۔!!''

اُن کے قریب جا کر اُس نے بڑے ادب سے آداب کیا۔۔۔رام جی نے ایک خستہ حال چوبی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''اِدھر بیٹھیئے۔۔۔تشریف رکھیئے۔۔۔!''

وہ شکریہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے بولا:

''سر میں۔۔۔! اشفاق اللہ۔۔۔انصاری۔۔۔!''

رام جی مسکرا کر بولے ''ہاں بھئی۔۔۔ پہچان لیا میں نے آپ کو۔۔۔!!'' رام جی ہاتھ والی کتاب دکھاتے ہوئے بولے ''آپ ہی کے افسانے دیکھ رہا تھا میں۔۔۔!'' کچھ توقف کے بعد رام جی نے سوال کیا:

''کتنے مجموعے شائع ہو چکے۔۔۔آپ کے۔۔۔؟؟''

وہ آہستہ سے بولا ''سر یہ میرا دوسرا مجموعہ ہے تیسرا ابھی پریس میں ہے۔'' رام جی کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اُس نے سوال کیا۔

''سر۔۔۔کیسے لگے میرے افسانے۔۔۔؟''

انہوں نے کتاب بند کر کے قریب پڑی میز پر رکھ دی عینک اُتار کر کُرتے کے دامن سے شیشے صاف کرتے ہوئے بولے ''بیٹا کسی کے بارے میں سچی رائے دینے کا زمانہ نہیں رہا۔ آج کل دو افسانے لکھنے والا بھی خود کو صفِ اوّل کا افسانہ نگار تصور کرنے لگا ہے۔ بُرا نہ منانا۔۔۔مجموعے چھپوانے میں آپ نے عجلت سے کام لے لیا۔ تھوڑا اور پک جاتے۔ کتابیں زیادہ ہیں، ابھی ادبی قد چھوٹا ہے آپ کا!!''

وہ گاڑی کی چابی جیب میں رکھ کر بولا ''سر۔۔۔! اِسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔ یہ چھوٹا قد میرے لیے عذاب بنا ہوا ہے۔ آخر کیسے؟ کیسے بڑھے گا قد۔۔۔؟ کیسے بن پاؤں گا ایک مقبول افسانہ نگار۔۔۔؟''

رام جی اُس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے گردن گھما کر آواز لگائی ''پُشپا۔۔۔! بیٹے دو چائے لے آنا۔۔۔!!'' اندر سے کوئی جواب نہ ملا، انصاری بڑی خاموشی سے اُن کا چہرہ تکتا رہا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر رام جی بولے۔

''ادیب کا قد دو باتوں سے بڑا ہوتا ہے۔ ایک محنت اور دوسرا صبر۔۔۔''

خوب خوب مطالعہ کیجیے، موپاساں، سارترے، کافکا اور چیخوف کو پڑھیے۔ انگریزی کمزور ہو تو تراجم پڑھیے۔ پریم چند، غلام عباس، منٹو، بیدی، عصمت اور قاسمی کو پڑھ ڈالیے۔ بھرپور مطالعہ کرنے سے آپ کا ذہن کھلے گا۔ آپ کو پتہ چلے گا کہ کس نے کیا، کیسے اور کیوں۔۔۔؟ لکھا۔ افسانے کی تکنیک سے آپ کو واقفیت ہوگی۔ بہتر سے بہتر لکھیں گے تو آپ کا ادبی قد اپنے آپ بڑھ جائے گا۔۔۔!!''

وہ گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ برقی پنکھا اپنا کام بڑی سستی سے کر رہا تھا۔ صحن میں دھوپ کی تمازت گہری ہوا چاہتی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ لکھتا تو ہے، پڑھنے سے تو ویسے ہی اکتاہٹ ہوتی ہے اُسے۔ گھر پہ اردو رسائل کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ وہ صرف قارئین کے خطوط پڑھا کرتا ہے۔ افسانوں پر مضامین سے تو اسے چڑ ہے۔ گھما پھرا کر وہی باتیں، کبھی کوئی نئے افسانہ نگاروں کی آبیاری نہیں کرتا۔ تکنیک کے بارے میں کوئی بڑی معلومات سانجھی نہیں کرتا۔ ہر کوئی ترقی پسندی سے شروع ہو کر مابعد از جدیدیت کے جال میں آ کر پھنس جاتا ہے۔ عصری افسانہ نگاروں کی لسٹ میں ہر کوئی اپنے دوستوں کی لسٹ پیش کر دیتا ہے۔ اُس کی فکر کا سلسلہ تب ٹوٹا جب رام جی کی پانچ سالہ پوتی پُشپا نے دو پیالی چائے تپائی پر ٹکائی اور اپنی نیلی فراک لہراتی ہوئی اندر چلی گئی۔ رام جی نے جھک کر چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

''کہاں کھو گئے انصاری صاحب۔۔۔لیجئے چائے لیجئے۔۔۔!!''

وہ ایک لمبی سانس چھوڑ کر بولا ''ٹھیک ہے سر۔۔۔ میں آج ہی سنٹرل لائبریری سے کچھ کتابیں لاتا ہوں!''

رام جی خاموشی کے ساتھ چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ دو تین سپ چائے لے کر اُس نے برا سا منہ بنا لیا۔ چائے میں میٹھا بہت کم تھا۔ رام جی اُس کا چہرہ تکتے ہوئے بولے ''میں سمجھ گیا۔۔۔ چائے میں شکر کم ہے نا۔۔۔ میں چینی منگواتا ہوں۔۔۔!'' وہ فوراً بولا ''نہیں۔۔۔سر رہنے دیں میں بھی چینی کم ہی لیتا ہوں۔۔!''

''چہارسُو''

چائے پی کر خالی کپ تپائی پر رکھ کر اُس نے سوال کیا ''سر اس بیچ۔۔۔اگر کوئی افسانہ ہوتا ہے۔۔۔تو اصلاح کے لیے لے آؤں۔۔۔؟''

وہ کچھ سوچ کر بولے۔

''ہاں ہاں۔۔۔کیوں نہیں۔۔۔! بیٹے پہلے مطالعہ شروع کرو۔پھر قلم سنبھالنا۔یہ میرا مشورہ ہے۔۔۔تمہارے اندر اظہار کا ٹیلنٹ ہے۔اسلوب کمزور ہے یہ کمزوری مطالعہ اور محنت سے ہی دور ہوگی۔۔۔!!''

ادھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد اُس نے اجازت لی اور گلی میں آ نکلا۔رام پرشاد جی اُسے دروازے تک چھوڑنے آئے۔

کچھ دنوں بعد اُس کا شاعر دوست اشرف آزاد جو اُس کے بے حد قریب تھا ملنے آیا۔میز پر دو تین موٹی موٹی کتابیں رکھے وہ سر پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اشرف نے اُسے مزاحیہ انداز میں پوچھا ''ارے۔۔۔ہمارے مہان افسانہ نگار کو کیا ہوا،بھئی کیا کسی افسانے کا موضوع ذہن میں اٹک کر رہ گیا جو یہ اِتّی اِتّی موٹی کتابیں لیے بیٹھے ہیں۔۔۔!؟''

وہ بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے تھکے ہوئے انداز میں بولا۔

''کیا پوچھتے ہو یار۔۔۔تخلیقی کام تو بند ہے۔ڈھیر ساری کتابوں کا مطالعہ کرنا ہے۔۔۔!!''

اشرف نے تیکھا سا سوال کیا۔

''مطالعہ۔۔۔!؟ اور تم کرو گے۔۔۔!؟ تمہاری تو فطرت میں مطالعہ شامل نہیں۔۔۔!''

وہ جھٹ سے بولا ''وہی تو۔۔۔کتابیں ایک ہفتہ سے میز پر پڑی ہیں مگر پڑھنے کا موڈ نہیں بنتا۔۔۔!''

صوفے پر بیٹھتے ہوئے اشرف نے سوال کیا ''مطالعہ کے بعد کسی ایگزام میں بیٹھو گے کیا؟''

وہ ایک لمبی سانس لے کر بولا ''دراصل میں پچھلے ہفتے رام جی سے ملا تھا۔۔۔!''

''رام جی سے۔۔۔!؟ رام جی،ایودھیا والے۔۔۔!؟'' اشرف نے مسکرا کر سوال کیا۔

وہ خفا ہو کر بولا ''سالے کبھی تو سیریس ہوا کر۔۔۔رام جی سے میری مراد رام پرشاد جی۔۔۔!!''

اشرف ایک آنکھ بند کر کے بولا ''اچھا اچھا۔۔۔ووو۔۔۔ہہ۔۔۔! بزرگ افسانہ نگار۔۔۔!!''

انصاری ذرا نرم ہو کر بولا ''ہاں۔۔۔وہی۔۔۔جتنے بڑے فنکار ہیں اُتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔۔۔!'' میں نے اُن سے بڑا اور کامیاب افسانہ نگار بننے کا طریقہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ''میں مغرب اور مشرق کے کامیاب افسانہ نگاروں کا مطالعہ کروں۔اُن کو سمجھوں۔پھر لکھوں۔۔۔اس سے ادب کے ایوانوں میں میرا نام بھی گونجے گا اور میرا قد بھی بڑھے گا۔اب کیا کروں اتنا مطالعہ کرنا تو اپنے بس کی بات نہیں۔یہاں تو اپنی تازہ اشاعت کا بھی مطالعہ نہیں ہو پاتا۔۔۔!''

اشرف ہنس کر بولا ''وہی تو میں کہوں۔۔۔تو کہاں اتنا مطالعہ کر پائے گا۔۔۔!''

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا ''کیا کروں یار دو بیچ نہیں پڑھے جاتے، یہ پرانے لوگ بڑے طویل افسانے لکھتے تھے۔''

اشرف نے شرٹ کی پاکٹ پہ ہاتھ مارا سگریٹ کی ڈبیا نکال کر ایک سگریٹ لے کر ڈبیا پر اُس کا تمبا کو ٹھوکا۔اُس کو ہونٹوں میں دبا کر آگ دکھا دی۔ لائٹر اور ڈبیا میز پر رکھ کر دھواں چھوڑتے ہوئے بولا ''ہوں۔۔۔تو یہ معاملہ ہے۔۔۔! مسئلہ قد کا ہے۔۔۔اچھا یہ بتاؤ اپنے اس خواب کو سچ کرنے کے لیے پچاس ساٹھ ہزار خرچ کر سکتے ہو۔۔۔!؟''

وہ اشرف کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولا ''خرچ کی پرواہ نہیں۔ اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہوں۔۔۔بس میرا نام ہو۔۔۔اور قد بڑا ہو جائے۔۔۔!''

وہ ایک لمبا کش کھینچ کر بولا ''تو نام اور قد کی فکر چھوڑ۔۔۔رقم تیار رکھ۔۔۔جہاں جہاں کہتا رہوں خرچ کرتا جا۔۔۔کوئی سوال نہیں کرنا۔۔۔!''

تھوڑے دنوں بعد اشرف نے اُسے ایک اکاؤنٹ نمبر دیا اور کہا ''اس نمبر میں بیس ہزار روپے جمع کروا دو۔۔۔'' سال ختم ہوتے ہوتے ملک کے ایک بڑے ادبی پرچے نے اُس کا گوشہ شائع کر دیا۔رسالے کے سرِ ورق پر اُس کی بڑی تصویر شائع ہوئی۔سوالات کے جوابات بھی بہت معقول تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے، دو تین پرچوں نے اُس پر گوشے شائع کر دیے۔پرچوں کی اجراء کی تقریبات ہوتی رہیں۔دعوتیں اُڑتی رہیں۔انصاری کے فن پر پرچے پڑھے جانے لگے۔ادبی ایوانوں میں بھی اُس کے نام کے چرچے ہونے لگے۔

اشرف شاعر تو ہلکا سا تھا مگر تھا بہت زمانہ ساز۔سارے ادیبوں اور نقادوں کی نبضیں اُس کی انگلیوں کے نیچے تھیں۔ملک کے بڑے ادیبوں اور نقادوں سے انصاری کے افسانوں پر تعریفی مضامین لکھوانے لگا۔وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کون کس طرح راضی ہوتا ہے۔کچھ تاجر ذہن کے نقاد تھے اُن کے ہاتھوں میں نقدی تھما دی،کچھ محض تحائف سے خوش ہو گئے،کچھ شریف دانشوروں نے بار بار فون کرنے پر ہی مضامین لکھ دیئے۔جو راست گوئی اور بے باکی کے مریض تھے اُن کو اشرف نے رجوع ہی نہیں کیا۔انصاری آرام سے دولت لٹاتا رہا۔دیکھتے ہی دیکھتے مضامین کا ڈھیر لگ گیا۔ایک بہت ہی سینئر ادیب،شاعر، افسانہ نگار،نقاد جو سو سے اوپر کتابوں کے خالق تھے سے پیش لفظ لکھوا کر 935 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب چھپوا دی جس کا نام رکھا ''فکرت'' مضامین کی

باقی صفحہ ۸۱ پر ملاحظہ کیجیے

یادوں کی لڑی

ڈاکٹر عبدالباری
(کراچی)

پچھلے دنوں اچانک کانوں میں آواز آئی یہ مہینہ ستمبر نہیں ستمگر ہے۔ یہ ایک ریٹائرڈ بنک آفیسر تھے جو ہماری کلینک کے سامنے رہتے ہیں۔اب نجانے اس مہینے میں ان کے ساتھ کونسا ستم برپا ہوا تھا کہ وہ ستمبر کو ستمگر سے تعبیر کر رہے تھے۔ مہینے تو سب ہی برابر ہوتے ہیں البتہ کچھ مہینوں کو دوسرے مہینوں پر فضیلت ضرور حاصل ہے جیسے ماہِ رمضان ! اچانک یاد آیا کہ یہی مہینہ تو تھا جب دستِ اجل نے تمہیں ہم سب سے دور کر دیا تھا اور مجھ حرماں نصیب کو تنہائیوں کے تپتے صحرا میں جھلسنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ۱۳ ستمبر کو تمہاری تیسری برسی ہے۔ یہ حقیقت کتنی اذیت ناک ہے کہ ہزار سے زیادہ دن اور ہزار سے زیادہ راتیں گزر گئی ہیں کہ تمہارا محبت بھرا وجود ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ میرے آس پاس اس گھر میں اور ہر جگہ تمہاری یادوں کے سائے لرزتے ہیں، تمہارے لباس کی سرسراہٹیں تو محسوس ہوتی ہیں، تمہاری مسکراہٹوں کی روشنی تو جھلملاتی ہے، تمہارے قہقہے تو گونجتے ہیں اور تمہاری چوڑیوں کی کھنک تو سنائی دیتی ہے۔ پر تم اور تمہارا مرمریں وجود نگاہوں سے اوجھل ہے۔ تمہاری پاکیزہ ادائیں مفقود ہیں اور تمہارا زندگی دینے والا لمس غائب ہے۔۔۔ تنہائیوں کا مارا میرا وجود نجانے کیسے زندگی سے ناتا جوڑے ہوئے ہے، لمحے صدیوں پر محیط لگتے ہیں۔۔۔ لگتا ہے کچھ کرنے کو نہیں رہ گیا۔۔۔ کیا کروں؟ کس سے کہوں؟ کہاں جاؤں؟ زندگی ایک سناٹے کی نذر ہو گئی ہے۔ ایک خلا ہے جس میں میں معلق ہو کر رہ گیا ہوں۔ یہ ایک ایسی رات ہے جس کی سحر ممکن ہی نہیں ہے۔ تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟ کسی طرح اپنے مخملیں ہونٹوں سے میرے بہتے آنسوؤں کو جذب کر ڈالو۔ میرے لرزتے کانپتے وجود کو اپنا پھولوں سا نرم، کومل و معطر سا سہارا دے دو اور اپنی ابریشمی زلفوں کو میرے زخم خوردہ اور جھلستے وجود پر پھیلا دو کہ میرے تن مردہ میں دوبارہ زندگی لوٹ آئے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ میرا ذہنی سراب ہے جس کے پیچھے میں بھاگ رہا ہوں۔ ایسا سوچنا بھی سعیِ لاحاصل ہے۔ پر کیا کروں مجبور ہوں۔۔۔ کسی کو مجھ پر کیوں رحم آئے گا۔ تم بھی قبر کی تاریکیوں سے اور خلا کی وسعتوں سے شاید میرے تڑپنے کا منظر دیکھ رہی ہو۔۔۔ ہم دونوں ہی کتنے مجبور ہیں تمہارے سامنے عالم برزخ کے طویل ماہ و سال ہیں اور میری سانس کی ڈوری ابھی تک قائم ہے اور یوں تنہا زندہ رہنا و تڑپنا میرا مقدر ہے۔

اُس روز نماز کے لیے جاتے ہوئے میں نے بائیک پر ایک جوڑے کو دیکھا۔۔۔ سجی، بنی سنوری، عبا میں ملبوس ایک دوشیزہ بڑی محبت سے اپنے ساتھی سے جڑی بیٹھی تھی۔ اس کی ریشمی بانہوں کے حصار میں محفوظ، لڑکے کے چہرے پر فخر و محبت کے ان گنت پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک عالمِ بے خودی میں وہ بائیک دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ فضائیں عطر بیز تھیں اور سرشاری کے عالم میں دونوں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے میں نے فوراً ہی اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھا دیں کہ انہیں اور ان کی خوشیوں کو کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔ تاروں بھرا آسمان تمہاری اوڑھنی کی طرح سایہ فگن تھا کہ یکا یک ایک تارا ٹوٹ کر ایک چمکتی لکیر بناتا خلاء کی وسعتوں میں بکھر گیا۔ مجھے لگا اس کا حال بھی میری طرح ہوا ہے۔۔۔ اب نجانے کب تک وہ خلا کی لامحدود وسعتوں میں بھٹکتا پھرے گا یا پھر اپنے وجود کی خوبصورتی کو کھو کے کسی گمنام قطعۂ ارض میں دھنس کر دفن ہو جائے گا۔ ہمارے مقدر کی طرح ایک عرصے تک اک دوجے کی محبت میں سرشار ایک ہی محور میں ہم ساتھ ساتھ دوڑتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک نجانے کیوں تم اپنے مدار سے ہٹ کر مجھ سے جدا ہو گئیں اور قبر کے گڑھے کو اپنا مسکن بنا ڈالا۔ تاروں بھرا آسمان تو اب بھی جھلملاتا ہے، مسکراتا ستاروں اور سیاروں سے بھرا پڑا ہے۔ اتنی دور سے تو ہمیں ہمیشہ کی طرح نیلا آسمان، چاند، ستاروں کی خوش فصیلوں سے روشن نظر آتا ہے۔ قریب جائیں تو اس کی توڑ پھوڑ کا اندازہ ہو۔۔۔ میری زندگی کی طرح۔۔۔ جہاں اب بھی سب کچھ ویسا ہی ہے۔ شب و روز کے وہی معمولات ہیں۔ وقت کا دھارا ہے کہ بہے جا رہا ہے۔۔۔ بس ایک میں ہوں جو خس و خاشاک کے مانند وقت کی بے رحم لہروں پر بہے چلا جا رہا ہوں جس کا کوئی ٹھکانہ ہے نہ منزل بلکہ ایک تلاطم کے رحم و کرم پر زندگی کا دارومدار ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کے بنائے ہوئے جوڑے ایک جتنی عمر لے کر آتے، ساتھ جیتے اور ایک دوسرے کی معیت میں زندگی کے دن پورے کر کے ساتھ ہی واپس چلے جاتے۔۔۔ اس طرح تنہائی کا یہ پیکراں سمندر تو درمیان میں حائل نہ ہوتا لیکن اس دنیا کے خالق و مالک کے مطابق یہ سب کھیل تماشا نہیں ہے۔ سوچا جائے تو بغیر نشیب و فراز کے یہ زندگی کیا رہتی؟ اس نے اپنی کتاب میں وضاحت سے کہا ہے کہ اگر وہ چاہتا تو یہ دنیا صرف مطیع و فرماں بردار انسانوں سے بھری ہوتی اور کافروں اور منکروں کا وجود تک نہ ہوتا۔۔۔ پھر شاید یہ مختصر العمر چھوٹی سی دنیا اپنا حسن کھو دیتی۔۔۔ دنیا یوں بھی مجموعۂ اضداد ہے۔ روشنی کے ساتھ تاریکی، دن کے ساتھ رات، بہار کے ساتھ خزاں، بارانی کے ساتھ خشک سالی، گرمی کے ساتھ سردی، افراط کے ساتھ کمی و بیشی، خوشی کے ساتھ غمی، بپھرتے سمندروں کے ساتھ تپتے صحرا، پھول کے ساتھ کانٹے، سرسبز اور دلکش جنگلات اور ان میں آزاد پھرتے درندے اور رینگتے زہریلے حشرات الارض۔۔۔ غرضیکہ یہ جملہ مظاہر اپنے بنانے والی کی صناعی کا شاہکار ہیں اور اس کی پہچان کا ذریعہ بھی۔ اس سے دنیا میں رونق ہے اور یہی امتحانات کا سبب بھی ہیں۔ پر ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی اور جنت یکساں ہونے کے باعث بے رنگ ہو گی اور اس دائم الوجود زندگی کی یکسانیت سے کبھی دل بھر بھی جائے گا۔ نجانے

وہاں کے عجائبات اپنے اندر کیسی کشش رکھتے ہوں گے کہ وہ اس دنیا کی پر معصیت زندگی سے دامن بچائے، مصائب پر صبر کرنے اور درپیش امتحانات پر صبر وشکر کا انعام ہوں گے۔ انعامات اور وہ بھی اس مالک حقیقی کے عطا کردہ انعامات جنکی نوعیت اور قدر و قیمت کا اندازہ بھی ممکن نہیں ہے۔ ہمیں اپنی یہ تمام سوچیں بھی فضول لگتی ہیں۔۔۔اس کے بنائے ہوئے کتنے ہی جوڑے اپنے انفرادی اور شیطانی وسوسوں میں آ کر جدا بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دشمن بھی ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک دوسرے کے درپۓ آزار بھی ہو جاتے ہیں، سو یہ ساتھ ہی دنیا میں آنے جانے والی خواہش بھی فضول سی لگتی ہے بس صبر وشکر کے موتیوں سے اپنا دامن بھرتے رہنا چاہیے۔ خواہ راہ میں آنے والے مصائب کتنے ہی جان لیوا کیوں نہ ہوں، ہنس کر جھیلنا چاہیے۔۔۔کاش ایسا ممکن ہو سکے!

گزشتہ جمعے امام صاحب تلقین فرما رہے تھے کہ دنیا خواہشات کرنے اور ان کو پالنے کی جگہ نہیں ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ نہ تو یہ دل میں گھر کر سکیں اور نہ ہی زبان تک آ سکیں۔ اس سے انکاری ہوتے ہوئے ہم سوچ سکتے ہیں کہ ہماری کتنی ہی خواہشیں بآسانی پوری ہو جاتی ہیں پھر ان سے مفر کیوں؟ ان کا فرمانا تھا کہ پوری ہونے والی خواہشات اُس کی نظرِ کرم کا نتیجہ ہوتی ہیں۔۔۔وہ نہ چاہے تو زندگی خواہشات سے بھرا جنگل ہو جائے جہاں تڑپتی، مچلتی، سسکتی خواہشات کے ہجوم میں سانس لینا بھی دوبھر ہو جائے۔۔۔ یقیناً اس دنیا میں بہتیرے ایسے لوگ ہوں گے جو اس پر عمل پیرا بھی ہوں گے۔۔۔ ہمارا خاکی وجود تو شاید ایسی مٹی سے گندھا ہے جس میں خواہشات خودرو پودوں کی مانند سر اُٹھاتی ہیں، لہلہاتی ہیں اور تڑپاتی ہیں۔۔۔نجانے کس شے سے ان کا وجود بنا ہوتا ہے کہ کبھی مرجھاتی بھی نہیں۔۔۔اپنی خوش ادا رنگین اور سرسحر معیت میں ہم سے کمزور، مجبور انسانوں کو دوڑائے پھرتی ہے۔ لاکھ سانس پھولے اور کم ہمتی و لاغری دامن پکڑے، ساتھ نہیں چھوڑتیں حتیٰ کہ اس آبلہ پائی میں آنکھیں پتھرا جاتی ہیں، سانس رُک جاتی ہے اور زندگی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ ہمیں تو لگتا ہے وہ دوسری قسم کے انسان ہوتے ہیں جنہیں خود پر اتنا اختیار ہوتا ہے۔۔۔شاید وہ کسی دوسری مٹی یا فولاد کی آمیزش سے تیار ہوتے ہیں جس سے ان کے دل و دماغ میں ایک ناقابل تسخیر دیوار سی بن جاتی ہے جس سے ٹکرا ٹکرا کر خواہشات دم توڑ دیتی ہیں اور ان خواہشات کے ہجوم میں گھرا وہ انسان سر اٹھا کر اپنا سفر طے کر لیتا ہے۔ ہمیں دل و جان سے تسلیم کہ خواہشات کے جنم لیتے ہی پوری ہو جانے والی جگہ صرف اور صرف جنت ہی ہے۔ مگر ہم اپنی مجبوری سے نالاں ہیں اگر ہمارا پتلا غلط مٹی سے اٹھایا گیا ہے تو ہمارا قصور؟ پر یقیناً یہ بھی ہماری شیطانی سوچ کا فتور ہے۔۔۔ہم سب ایک ہی مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔۔۔یہ قیاس بھی گناہ ہے کہ اس نے ہم خاکی پتلوں کے بنانے میں کوئی تفریق کی ہے۔۔۔صحیح نظریات، احکامات اور ان کے ماننے و عمل پیرا ہونے سے وہ دیوار اُٹھ سکتی ہے کہ خواہشات کا بے کراں سمندر لاکھ سر پٹکے پر اس میں شگاف تو کیا رخنہ ڈالنا بھی ناممکن ہے۔ اس کے لیے صحیح تعلیم و تربیت اور درست سمت کی رہنمائی و عمل ہی وہ راستے ہیں جن پر چل کر یہ گوہر مقصود ہاتھ آ سکتا ہے۔ عمر عزیز کے اس حصے میں ہمارا اور ہم جیسے کمزور انسانوں کا دامن تو ایسی تشنہ فضول اور ناجائز خواہشات سے بھرا نظر آتا ہے۔ مُڑ کر دیکھیں تو گزشتہ زندگی بے معنی نظر آتی ہے۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں کر پائے۔ اس شیطان مردود نے کبھی اپنا احتساب بھی تو نہیں کرنے دیا۔ ہمیشہ ان شرمناک اعمالوں پر خوش رنگ پردے ڈالے رکھے کہ زندگی کامیاب، کامران اور پُر بہار نظر آتی رہی۔۔۔اب جب حوصلے پست ہو گئے ہیں، جسم ساتھ دینے سے معذور ہے اور مایوسیوں کی آہنی گرفت میں بمشکل سانس لے پاتے ہیں، تو کیا کریں؟ بس واہی ایک آسرا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ستر ماؤں سے زیادہ چاہنے والا ہمارا رب ہمارے تمام عیوب پر پردہ ڈالے رکھے گا کہ وہ ستار العیوب ہے، معاف کر دے گا کہ وہ غفور الرحیم ہے۔۔۔ زندگی کی اس نہ ختم ہونے والی دوڑ میں ہم تھک گئے ہیں، شکستہ حال ہیں اور اپنے پر معصیت ماضی پر شرمسار بھی ہیں مگر اس شرمساری میں دبی ایک چنگاری بھی ہے جو نہ صرف ہر روز بلکہ ہر گھڑی بلخصوص ماہ ستمبر میں جوالہ مکھی بن کر مجھ خاکی انسان کو اپنے رب سے شکوہ کناں ہونے پر اُکساتی ہے اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے کانوں میں ایک صدا گونجنے لگتی ہے:

ان اللہ علیٰ کل شئی قدیر

یکا یک دل و دماغ میں ممونیت کے احساس و جذبات اُمڈنے لگتے ہیں اور یادوں کی لڑی بن کر پھر سے میرا حالہ کر لیتے ہیں۔

۔ جہدِ زندگی ۔

عقاب کی عمر 70 سال کے قریب ہوتی ہے۔ اس عمر تک پہنچنے کے لیے اسے سخت مشکلات سے گزرنا ہوتا ہے۔ جب اسکی عمر چالیس سال ہوتی ہے تو پنجے کند ہو جاتے ہیں جس سے وہ شکار نہیں کر پاتا۔ مضبوط چونچ بھی عمر کے بڑھنے سے شدید ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ پَر بھاری ہو کر سینے کے ساتھ چپک جاتے ہیں، اڑان بھرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مشکلات میں اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ موت کو تسلیم کر لے یا 150 دن کی سخت مشقت کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ پہاڑوں میں جاتا ہے، چونچ کو پتھروں پہ مارتا ہے، یہاں تک کہ وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ کچھ دن بعد نئی چونچ نکلتی ہے تو اس سے اپنے ناخن جڑ سے کاٹ پھینکتا ہے۔ نئے ناخن نکل آتے ہیں وہ چونچ اور ناخن سے اپنا ایک ایک بال اکھاڑ دیتا ہے۔ اس عمل میں اسے پانچ ماہ کی طویل تکلیف اور مشقت سے گزرنا ہوتا ہے۔ پانچ ماہ بعد اڑان بھرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے نیا جنم لیا ہو۔ اس طرح وہ تیس سال مزید زندہ رہ پاتا ہے۔

ڈوبتی نسلیں

رینو بہل
(چندی گڑھ، بھارت)

سولہ سال کی عمر میں چار کہاروں والی پھُلکاری سے سجی ڈولی میں بیٹھ کر جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو بابا کی بات پلّے باندھ کر آئی تھی کہ ڈولی میں جا رہی ہے اور ارتھی پر ہی اس گھر سے نکلنا۔ اسے کیا پتا تھا کہ چونتیس سال بعد وہ کھنڈر نما گھر چھوڑ کر در در بھٹکنے کو مجبور ہو جائے گی۔ دُھندلی آنکھوں سے آخری بار خستہ دیواروں پر گزرے لمحوں کے عکس تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ دیواریں راز دار ہیں اس کے دھڑکتے دل کی، وصل کی سرشاری کی، برہ کے درد کی۔ ان دیواروں نے اُسے ہواؤں کی طرح مچلتے، پھولوں کی طرح مہکتے، پتّوں کی طرح بکھرتے دیکھا۔ یہ دیواریں ساتھی ہیں اُس کے سُکھ دکھ کی اور آج انہیں دیواروں سے بچھڑنے کا وقت آ گیا۔ دیواروں کی حالت اُس سے بہتر تو نہیں؟ بے رنگ دیواروں سے پپڑی جگہ جگہ سے اکھڑ رہی ہے۔ کمرے کی کھڑکیاں جس پر گہرے رنگ کے پردے سجے رہتے تھے، وہ بیوہ کی سونی مانگ کی طرح ویران پڑی ہیں۔ کھڑکی کی سلاخیں گم، پردے غائب، کھڑکی صرف نام کی رہ گئی جسے آسانی سے پھاند کر دروازے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ منظر صرف اُس کے کمرے کا نہیں پورے گھر کا ہے۔

کتنے شوق سے اُس نے اپنا چھوٹا سا آشیانہ سجایا تھا۔ کھیتوں کے بیچ و بیچ اُس کا یہ دومنزلہ گھر، اُس کے خوابوں کی جنت تھی۔ لہلہاتی فصلوں کے بیچ اُس کا گھر شاہانہ عظمت کے ساتھ اپنا وجود قائم کئے کھڑا تھا۔ کرم چند نے بڑے چاؤ سے یہ گھر بنوایا تھا۔ اسی گھر میں اُس کی تین بیٹیاں اور اُن سب سے چھوٹا بیٹا تاری کھیل کر جوان ہوئے۔ بیٹیاں بیاہ کر بدا کیں تو گھر سُونا سُونا لگنے لگا۔ بیٹے کے سر پر سہرا باندھنے کی خواہش زور پکڑنے لگی تو پاس کے گاؤں کی نورا کو ڈولی میں بٹھا کر گھر کی رونق دوچند کر لی۔ کچی عمر کی لڑکیاں کچی مٹی کی طرح ہوتی ہیں، اُنہیں جس سانچے میں ڈھالو ڈھل جاتی ہیں۔ نورا بھی بے بے کے رنگ میں جلد ہی رنگ گئی۔ شوہر کی محبت، باپو کی شفقت اور بے بے کے لاڈ نے اُس کے وجود کو ایسے پگھلا کر گھر میں رچا بسا دیا جیسے گھی میں شکر، دودھ میں پانی۔

پہلے پوتے کی پیدائش پر بے بے نے پورے گاؤں میں لڈو بانٹے۔ چھنیدا ابھی چار سال کا تھا کہ دوسرے پوتے نے ان کی خوشیوں کو چار چاند لگا دئے۔ لاڈ سے اُس کا نام نِکا کیا پڑا پھر وہ جوان ہو کر بھی نِکا ہی رہا۔ بچوں کی شرارتیں، باپو جی کے ملنے والوں سے گھر بھر میں سارا دن رونق رہتی۔ بے بے صبح سویرے اندھیرے منہ اُٹھ کر دودھ دوہنے کا کام کر لیتی اور خود لسی رڑک کر آنے جانے والوں کے لیے تیار رکھتی۔ مکھن نکال کر الگ سے چھندے اور نِکے کے لیے رکھ لیتی۔ تاری اگر بے بے سے مکھن کی فرمائش کرتا تو اس کا منہ بند کرنے کے لیے اُسے تھوڑا سا مکھن دیتے ہوئے کہہ دیتی:

''نظر نہ رکھا کر میرے بچوں کی چیز پر''

''بے بے میں تیرا بچہ نہیں کیا؟''

''تو وی ہے پر اوہ پہلے'' بے بے کا پیار دیکھ کر وہ مُسکرا دیتا۔

فصلیں اُگتی رہیں کٹتی رہیں، موسم آتے رہے بدلتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں لڑکوں کے قد باپ سے بھی اونچے ہو گئے جسے دیکھ باپو کو سینہ خوشی سے پھیل جاتا اور بے بے گھبرو جوان پوتوں کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے سو سو حیلے کرتی۔ گھر سے باہر جاتے تو اُس کی نظریں دروازے پر لگی رہتیں۔

پھر پنجاب میں ایسی زہریلی ہوا چلی کہ اپنے اپنوں سے خوف کھانے لگے۔ بٹوارے کے بعد ایک بار پھر پنجاب کی زمین لہو کی پیاسی ہو گئی۔ خالصتان کے نعرے گونجے لگے، دہشتگری نے سر اُٹھایا۔ ہندو سکھ جو کل تک شیر و شکر تھے اب اک دوسرے سے نظریں چرانے لگے۔ رشتے سرد پڑ گئے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے بے بے کی ہدایتیں سُن کر ہی لڑکے باہر قدم رکھتے۔ جب تک وہ گھر نہ لوٹ آتے بے بے بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتی رہتی۔

باپو اُن کی بے چینی دیکھ کر انہیں شرارت سے کہتے:

''میں تو تجھے شیرنی سمجھ کر ساری عمر ڈرتا رہا مگر تُو تو۔۔۔''

''تاری کے باپو میرا منہ مت کھُلانا۔ اچھی طرح جانتی ہوں آپ کے ڈر کو بھی اور حوصلے کو بھی۔''

باپو حقہ گُڑگُڑاتے بیوی کی بات سن مسکرا دیتے۔ اُسے تنگ کرنے میں انہیں بڑا مزا آتا تھا۔ اُن دونوں کی صبح شام کی نوک جھوک سُن کر نورا مزے لیتی تھی۔

پھر ایک روز یہ نوک جھوک ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ پہلی بار اُس نے اس گھر میں موت دیکھی تھی۔ موت کے بجائے قتل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ صبح شہر کسی کام کے لیے تاری گھر سے نکلنے لگا تو بے بے نے کہا:

''میری داہنی آنکھ بہت پھڑک رہی ہے تو آج نہ جا''

''بے بے اب تیری آنکھ کے پیچھے میں کام روک دوں۔ واہموں میں مت پڑا کر۔ دنیا کے کاروبار بند نہیں ہوں گے۔ سب چل رہے ہیں۔ گھر میں بیٹھی پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ گھر سے نکل گیا۔

آدھے گھنٹے بعد ہی خبر آ گئی کہ دہشت گردوں نے راستے میں بس رکوا لی اور بنا دستار کی سواریوں کو نیچے اُتار کر ایک قطار میں کھڑا کر کے پانچ منٹ میں آٹھ لوگوں کی روحوں کو اُن کے جسم سے آزاد کر دیا۔ تاری بھی اُن میں سے ایک تھا۔ اس شام گھر سے ایک نہیں دو جنازے ایک ساتھ اُٹھے تھے۔ دو سہاگنیں ایک ساتھ بیوہ ہوئیں تھیں۔ بیٹے کی موت کی خبر باپو برداشت نہیں کر پائے تھے۔

اس حادثے کے بعد گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ نہ کہیں قہقہے گونجتے، نہ ہنسی

''چہارسُو''

مذاق نہ نوک جھوک۔ خاموشی کا گھُن لگ گیا تھا۔ جوان خون اُبال کھا رہا تھا نفرت کی آندھی اُن کے وجود کو بکھیر رہی تھی۔ نورا نے پل پل ٹوٹتی بے بے کو سہارا دینے کے لیے اپنے دُکھ اپنی تکلیف طاق پر رکھ کر خود کو مضبوط کرتے ہوئے بوڑھی ماں کو سنبھالا۔ جوان لڑکوں کو انتقام کی تاریک راہوں پر بھٹکنے سے روک لیا۔ سرکار کی کوششوں سے بہت جلد دہشت گردی کے اس دور کا خاتمہ ہو گیا۔ امن کی ہوائیں پھر سے دلوں میں پیار بھرنے لگیں۔ دھیرے دھیرے زندگی معمول پر آنے لگی۔ بھائی چارے کا وہی دور پھر سے لوٹ آیا مگر اس گھر کی فضا میں ایک عجیب سی بے سکونی، بے چینی، بوسیدگی آ کر کبھی نہیں لوٹی۔ اُن کی زندگیوں میں جو خلا پیدا ہوا تھا وہ وقت کے ساتھ بڑھتا ہی گیا۔

سرد آہ بھرتی نورا کمرے سے نکل باہر چھت پر آئی تو آسمان کی دنیا چاند ستاروں سے روشن تھی۔ پو پھٹنے میں ابھی وقت تھا۔ ایک طائرانہ نظر گاؤں کی طرف ڈالی تو سینے سے ہُوک اٹھی۔ کئی گھر اُس کی نظروں کے سامنے تھے جدھر اداسیوں کا مستقل ڈیرا جم چکا تھا۔ دُور سے آتی بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی آوازوں نے احساس دلایا کہ پو پھٹنے میں دیر نہیں۔ دن کے اجالے سے پہلے ہی وہ گاؤں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ جانے سے پہلے نہ کسی سے ملنا چاہتی تھی نہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ منزل کا پتا تو اسے بھی نہیں تھا بس یہ جانتی تھی کہ ادھر سے اُس کا دانا پانی اُٹھ چکا ہے۔

پلٹ کر کمرے میں گئی چھوٹی سی کپڑوں کی گٹھڑی اُٹھائی آخری نظر کمرے پر ڈالی اور تیز قدموں سے زینہ اُتر آئی۔ اُس کے دل نے چاہا کہ ایک بار یا شاید آخری بار نِکے کو دیکھ لے مگر اُس کے کمرے کی طرف جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کی کوکھ میں بھانبڑ بل رہے تھے جو نِکے کو دیکھ کر اور دہک اُٹھتے یہ ہی سوچ کر وہ تیز قدموں سے باہر دالان میں آ گئی۔ نیم تاریکی میں اُسے محسوس ہوا جیسے آم کے درخت کے نیچے باپو تخت پوش گاؤ تکیے پر کوہنی ٹکائے اپنے مخصوص انداز میں بیٹھے حقّہ پی رہے ہیں۔ گھبرا کر اُس نے نظریں باڑے کی طرف پھیر لیں۔ تاری گائے کو چارا ڈال کر اُس کی پیٹھ تھپتھپا رہا تھا تو بے بے دھیمی آواز میں گیت گاتی ہوئی لسی رڑک رہی تھی۔ اُس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ چھندا مونچھوں کو تاؤ دیتا بے بے کے پاس آ کر جھکا اور مٹکی میں ہاتھ ڈال کر مکھن کا گولا نکال سیدھے منہ میں ڈال کر مسکرانے لگا۔ بے بے مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے ''ٹھہر تو'' کہہ کر اُٹھی۔ نورا کی دُھندلی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اُسے تخیل سے حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔ دالان ویران تھا، اندھیرے میں ڈوبا ہوا۔ اُسے لگا وہ تن تنہا کسی ویران کھنڈر میں کھڑی ہے یہ اس کا گھر نہیں ہو سکتا۔ بے بسی سے نظر بھر کر دالان کے چاروں طرف دیکھا پھر بوجھل قدموں سے دہلیز پھلانگ آئی۔ اس گھر سے اُسے ارتھی میں رخصت ہونا تھا اور وہ خود اپنا مردا جسم ڈھوتی کھیتوں کے بیچ بنی پگڈنڈی پر نکل آئی۔

چاروں طرف سناٹا۔ خاموشی کی چادر میں لپٹا گاؤں تاروں کی چھاؤں میں وہ پیچھے چھوڑ آئی۔ گاؤں کی سرحد پار کرتے ہی بس سٹاپ پر پہنچ تو گئی مگر یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ اُسے کدھر جانا ہے۔ میکہ تو ماں باپ کے ساتھ ہوتا ہے جو کب کا چھوٹ چکا تھا۔ بھائی کے گھر جانا مناسب نہیں بھابی کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اکلوتی چھوٹی بہن نمو خود بیوہ ہے اور دو جوان بیٹوں کی ذمہ داری سر پر لیے نہ جانے کیسے گزر بسر کر رہی ہو گی۔ شہر میں وہ کسی کو جانتی نہیں۔ سر چھپانے کے لیے محفوظ چھت چاہیے اور پیٹ بھرنے کے لیے کام۔ انجان شہر میں اجنبی لوگوں میں رہ کر عزت کی روٹی کمانا آسان بھی نہیں۔ بے شک وہ پچاس کی ہو گئی دو جوان بیٹوں کی ماں بن گئی مگر ہے تو عورت ذات۔ اُنہیں بے باک نگاہوں کو اپنے جسم کا سکین کرتے محسوس کیا جن کی آنکھیں احترام سے اُس کے سامنے اُٹھتی نہیں تھیں اور زبان بھابی بھابی کہتے تھکتی نہیں تھی۔ سرکا سائیں کیا گیا اُسے لنگر کا مال سمجھ لیا۔ آج بھی وہ بنا دروازے دریچے کے مکان میں صرف چھت کے سہارے زندگی کاٹ لیتی اگر پچھلی صبح اپنے کمرے میں اپنی ہی چارپائی کے قریب زمین پر سکھ جیت سنگھ کو بے سدھ پڑے نہ دیکھا ہوتا۔ جوان بیٹا دوسرے کمرے میں بے سدھ پڑا جسے یہ بھی ہوش نہیں کہ کون اُس کی ماں کے کمرے میں رات کے کس پہر پہنچ گیا۔ بھلا اُس سے وہ کیا توقع کر سکتی ہے۔ یہ بات وہ جان چکی تھی کہ اب اپنی حفاظت اُسے خود ہی کرنی ہو گی تبھی تو اُس نے لاٹھی سے سکھ جیت سنگھ کی ایسی دُھنائی کی کہ اُس کا سارا نشہ کافور ہو گیا۔ مار مار کر اسے ادھ موا کر دیا۔ گالیاں بکتا جا ن بچا کر وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگا۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ دوبارہ ادھر نہیں آئے گا؟ جب گھر کے دریچے دروازے نہ ہوں تو لوگ اُسے راہ داری سمجھ لیتے ہیں۔ کوئی بھی بنا روک ٹوک کبھی بھی آ جا سکتا ہے۔ اتنا ہنگامہ ہوا صبح صبح مگر نِکا بے سدھ پڑا رہا۔ نشے میں دھت آدمی اور مُردے میں کیا فرق ہوتا ہے؟

دن چڑھتے ہی سڑک پر گھما گہمی شروع ہو گئی۔ دُور سے آتی بس کو دیکھ اُس نے طے کر لیا کہ بس جس طرف جائے گی وہ اُدھر ہی جائے گی۔ بس امرتسر کی تھی۔ ہاتھ کے اشارے سے بس رکوائی اور اُس میں سوار ہو گئی۔ ٹکٹ لے کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ بس اُسے نمو کی طرف لے جا رہی تھی۔ کچھ دن اُس کے پاس رک کر شہر میں کام ڈھونڈنا آسان ہو جائے گا۔ ماں کی ممتا نے دھیرے سے سرگوشی کی:

''شاید نِکا مجھے تلاش کرتا نمو کے گھر آ جائے۔ شاید اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ وہ جانتا ہے کہ نمو کے علاوہ میرا اور کوئی نہیں ہے۔ اگر سیدھے شہر چلی گئی تو وہ کہاں تلاش کرے گا۔''

دوڑتی بس کے ساتھ سڑک کنارے لگے پیڑ، کھیت کھلیان بھی دوڑنے لگے۔ دوسرے صوبے سے آئے مزدوروں کو کھیتوں پر کام کرتے دیکھ کر اُسے وہ زمانہ یاد آ گیا جب کسان اپنے کھیتوں پر کام کرنے پر فخر محسوس کرتا تھا۔ مٹی سے مٹی ہو کر لہلہاتی فصلوں کو دیکھ خوشی سے جھوم اُٹھتا تھا اور اب جوان لڑکوں کو اپنے کھیتوں میں کام کرنے میں شرم آتی ہے۔ چار کتابیں پڑھ کر نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ مٹی میں ہاتھ ڈال نہیں سکتے روزگار ملتا نہیں۔ ماں باپ کو مجبور کر دیتے ہیں زمین بیچ کر بیرون ملک بھیجنے کو اور جو نہیں جا سکتے وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے نشے کا سہارا لیتے ہیں۔ فراغت کا بہانہ تلاش کرتے ہیں۔ مسئلے کا حل بے خودی کی انتہا تک پہنچ کر سب کچھ

''چہارسُو''

فراموش کرنے میں تلاش کرتے ہیں۔ دہشت گردی پر تو سرکار نے قابو پالیا مگر یہ نشے کی دہشت گردی نے پورے پنجاب کو اپنی چپیٹ میں لے لیا۔ یہ وبا اتنی تیزی سے پھیل رہی ہے کہ گھروں کے گھر تباہ ہو رہے ہیں۔ نئی نسل تباہ ہو رہی ہے۔ تباہ نسل کے ساتھ پنجاب کی تہذیب بھی ختم ہو جائے گی۔ بارود کے ڈھیر پر بیٹھا ہے پنجاب۔ ایک زمانہ تھا جب پنجاب سب سے امیر ترقی یافتہ صوبہ ہوا کرتا تھا۔ سبز انقلاب (Green Revolution) کے لیے مشہور تھا اور آج نمو کا گاؤں مقبول پورا ''بیواؤں کے گاؤں'' کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ شاید ہی اُس گاؤں میں کوئی ایسا گھر ہو جس میں کوئی بیوہ نہ ہو۔ ہر گھر سے کسی نہ کسی مرد نے نشے کی چپیٹ میں آ کر اپنے جیون کی آہوتی دی ہے۔ مردوں کو افیم، چرس، گانجھا نگل گیا۔ نمو کے مرد کو بھی تو ''چٹے'' نے چاٹ لیا۔ پیچھے رہ گئیں دو جوان بیٹیاں اور ایک بیوہ۔ دس سال کی عمر سے لے کر چالیس سال کے مرد اس وبا سے نہیں بچ پائے۔ اس کا خود کا گھر بھی کہاں بچ پایا اس بیماری سے۔ جوان گیرو چھندے کو تل تل کرتے بکھرتے دیکھا ہے۔ باپ اور دادا کی وفات کے بعد وہ خود کو سنبھال نہیں پایا۔ کالج کے دوستوں کے ساتھ نشے کی لت کا شکار ہوا۔ گھر پر پتا ہی نہیں چلا کہ بات اتنی آگے پہنچ گئی ہے۔ حالانکہ بے بے اور وہ اس کے بدلتے رویے سے پریشان ضرور تھے۔ زیادہ تر وقت وہ گھر سے باہر گزارتا اور جب گھر پر ہوتا تو سب سے کٹ کر کمرے میں تنہا پڑا رہتا۔ ڈھنگ سے کھانا پینا چھوٹ گیا۔ نہ سلیقے سے تیار ہوتا۔ آنکھوں کے پپوٹے ایسے اُبھرے رہتے جیسے رات رات بھر جاگا ہو۔ بے بے یا ماں اس سے بات کرنا چاہتے تو غصّے سے جواب دیتا۔ بات بات پر چڑ جاتا۔ دونوں خاموش ہو جاتیں۔ اندر ہی اندر فکر انہیں کھائے جا رہی تھی حقیقت تو اس وقت کھُلی جب دو روز سے چھندا گھر نہ آیا تو نورا نِکے کو ساتھ لے کر اُسے ڈھونڈنے نکل پڑی۔ پوچھتے پچھاتے شمشان گھاٹ کے پاس ویران عمارت تک پہنچ گئی۔ ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا تو تیز پیشاب کی بھبھک نے ناک کو دوپٹے سے بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ کمرے میں گندگی کے بیچ خالی دوائی کی شیشیاں اور سرنجیں بکھری پڑی تھیں اور کونے میں کم سن لڑکے کش پر کش لگا رہے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی ایک دو تو بھاگ کھڑے ہوئے اور دو مجرم شکل وصورت والے خونخوار نظروں سے انہیں دیکھنے لگے جیسے شکار پر ابھی جھپٹ پڑیں گے۔ نِکے کا ہاتھ پکڑ کر جھٹ سے وہ باہر کی جانب بڑھ گئی۔ گندگی اور بُو سے اُسے اُبکائی آنے لگی تو دوسری جانب بھاگی۔ وہاں گندگی کے ڈھیر پر اُس کا چھندا مدہوش خود سے بے خبر پڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ اُسے وہاں سے لانا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ سیدھی سرپنچ کے پاس مدد کے لیے پہنچی اور اُسے اپنا دُکھڑا سنا دیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سارے شہر کو جو خبر ہوتی ہے وہ گھر والوں تک آخر میں پہنچتی ہے۔ گاؤں کے لوگ اُس کی عادت سے واقف تھے۔ کئی لوگوں سے اُدھار لے چکا تھا اپنی قیمتی چیزیں بھی بیچ چکا تھا۔ گھر پر تب پتا چلا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے، در در کی ٹھوکریں کھائیں، غصہ بھی کیا، ممتا کا واسطہ بھی دیا، علاج کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہا دیا۔ پرائیویٹ نشہ چھوڑو سینٹر میں بھرتی بھی کرایا۔ زمین کا کچھ حصہ فروخت کر ڈالا مگر ہاتھ پلے کچھ نہ پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی آنکھوں کے سامنے ریت کی طرح مُٹھی سے پھسل گیا۔

جوان پوتے کی میت اُٹھتے دیکھ کر بے پاگلوں کی طرح روتی رہی چلاتی رہی۔ نشے کے دلالوں کو، سیاست دانوں کو کوستی رہی۔ ایک مہینے بعد گھر میں پھر صفِ ماتم بچھ گئی۔ بے بے بھی چھندے کے پیچھے ہو لی۔ گھر کے در و دیوار، گھر کا آنگن سُونا ہو گیا۔ تنہائی، اداسی اور مایوسی نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا۔ بیٹیاں بھی اپنی گھر گرہستی چھوڑ کر کتنے دن رُک سکتی تھیں؟ پورا گھر ایسے بکھر گیا جیسے مالا کا دھاگا ٹوٹنے سے موتی بکھر جاتے ہیں۔

بس جھٹکے سے رُکی تو اُس کے خیالوں کا تانا بانا بھی ٹوٹ گیا۔ بس اپنی منزل پر پہنچ کر رُک چکی تھی۔ بس سے اُترتے ہی اُسے مقبول پورے کے لیے سواری مل گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ نمو کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔

نمو نے دونوں باہیں پھیلا کر بڑی بہن کا استقبال کیا۔ دیر تک گلے لگ کر دونوں بہنیں روتی رہیں۔ برستی آنکھوں میں خوشی اور غم دونوں شامل تھے۔ گھر میں اُسے اکیلے دیکھ کر نورا نے پوچھا:

''لڑکیاں نظر نہیں آ رہیں؟'' چارپائی پر بیٹھتے ہی نظریں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔

''رتی تو کالج کے لیے ابھی گھر سے نکلی ہے۔ وہ تو شام کو ہی لوٹے گی اور چنی صبح سے کھیتوں پر گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں لوٹ آئے گی۔''

''کھیتوں پر؟''

''اپنے پاپا کے گزر جانے کے بعد اب وہ ہی کھیت سنبھالتی ہے۔ سچ کہوں تو پورے گاؤں کے لیے مثال ہے میری بیٹی۔ بیٹا بن کر سہارا دیا ہے۔ نہیں تو ہم دانے دانے کو محتاج ہو جاتے۔'' فخر سے اُس کا سر تن گیا تھا۔

''قسمت والی ہے تو تجھے رب نے ایسی اولاد دی۔'' بے ساختہ سرد آہ نکل گئی۔

''نِکا کیسا ہے؟''

نمو نے تو سرسری پوچھا تھا مگر نورا کے دل پر تیر کی طرح لگی۔

''میرا حال دیکھ کر تجھے پتا چل جانا چاہیے کہ وہ کیسا ہے۔''

''سچ پوچھو تو اچانک اس وقت تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی تو ہوئی ساتھ میں حیرانی اور۔۔۔'' وہ خاموش ہو گئی۔

''اور۔۔۔؟''

''اور پریشانی بھی۔ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔''

''ٹھیک کہتی ہے۔ کچھ بھی ٹھیک نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے نورا چارپائی پر آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔

''میں ناشتہ لے کر آتی ہوں پھر آرام سے باتیں کریں گے۔''

نمو اٹھ کر اندر چلی گئی اور وہ آنکھیں موندے سوچنے لگی کہ اُسے گھر پر نہ دیکھ کر نِکے کو فرق پڑے گا یا نہیں؟ وہ ڈھونڈتا ہوا اِدھر آئے گا یا نہیں؟ معلوم نہیں مکان

بچ پائے گا یا وہ بھی نشے کے عوض فروخت کر دے گا؟ پتا نہیں وہ دوبارہ ننکے کو دیکھ پائے گی یا وہ بھی مٹی میں مل جائے گا؟ انہیں سوالوں میں الجھی ہوئی تھی کہ نمو ناشتہ لے آئی۔

پراٹھوں کی خوشبو سے اُسے خیال آیا کہ دو دن سے ایک نوالہ بھی اُس کے اندر نہیں گیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر دونوں بہنوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ نمو اُسے چنی اور رتی کی باتیں سناتی رہی۔ بیٹیوں سے کتنی رونق ہوتی ہے گھر میں۔ بابل کے آنگن کی چڑیا جیسی ہوتی ہیں چہکتی پھدکتی اپنے ہونے کا احساس دلاتی۔

ناشتہ کر کے نمو اُسے آرام کرنے کا کہہ کر گھر کا کام نپٹانے میں لگ گئی اور وہ آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔

اگر تاری بے موت نہ مرا ہوتا تو باپو بھی زندہ ہوتے۔ دونوں موجود ہوتے تو چھندا کبھی بھٹکنے کی ہمت نہ کرتا۔ اُس کے گھر آنگن میں بہو کی پائل اور کھنکتی چوڑیوں کا سنگیت ہوتا۔ بچے کلکاریاں لگاتے۔ بے بے دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی۔ گھر میں بہار کا موسم ہوتا۔

وہ سوچنے لگی نہ جانے کون لوگ ہیں جو اپنے منافع کے لیے ماؤں کی کوکھ اُجاڑ دیتے ہیں، گھروں کو کھنڈر بنا دیتے ہیں، نوجوانوں کو بنجر بنا دیتے ہیں۔ چھندے کے علاج کے دوران ڈاکٹر سنگھ نے بتایا تھا کہ افغانستان سے ایک لاکھ روپے فی کلو میں ملنے والی منشیات پڑوسی ملک کے بارڈر سے ہندوستان پہنچتی ہے تو تیس لاکھ روپے فی کلو ہو جاتی ہے۔ کم وقت میں زیادہ پیسہ کمانے کا آسان طریقہ ہے۔ انڈو پاک کا 553 کلومیٹر لمبا باڈر جن کے ہاتھوں میں حفاظت کے لیے دیا ہے وہ بھی لشکروں کے ساتھ ملے ہیں۔ پولیس سے لے کر سیاسی لیڈر تک اس میں شامل ہیں۔ سب کے ضمیر مر چکے ہیں۔ کوئلے کی دلالی میں سب کا منہ کالا ہے۔ کس سے فریاد کریں کس سے انصاف مانگیں؟ جس ملک میں ہر روز دو ہزار کروڑ کی ڈرگز سمگل ہوگی اس کی نوجوان نسل کا کیا مستقبل ہوگا، خدا جانے۔ دشمنوں کی سوچی سمجھی سازش ہے، نئی نسل کو ایسے تباہ کر دو کہ مقابلہ کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اچھے بھلے انسان کو شکار بنا کر اُسے نشے کا ایسے عادی بنا دیتے ہیں کہ دھیرے دھیرے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے وہ جرم کی دنیا میں قدم رکھ لیتے ہیں۔

اُس کے ساتھ بھی تو یہ ہی ہوا۔ چھندے نے چوری چھپے اپنا قیمتی سامان بیچا اور ننکے نے ایک ایک کر کے گھر کا سامان چوری سے بیچنا شروع کر دیا۔ اُس کی ناک کے نیچے سب کچھ ہوتا رہا اور وہ کچھ کر ہی نہیں پائی۔ کپڑے لتے، چادر، بستر، برتن تو چھوڑو دروازے کھڑکیاں بھی بیچ ڈالیں۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ وہ گھر چھوڑنے کو مجبور ہو گئی۔ گھر سے بے گھر ہونے کا خیال آتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں لرزنے لگیں۔ نمو نے اُسے اُٹھ کر بیٹھتے دیکھا تو دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''اب سُنا کیا ہوا؟''

''سُنانے کو کچھ بچا ہی نہیں۔ دھیرے دھیرے سب ختم ہو گیا۔''

''ننکے کو کیا ہوا؟''

''وہی جو چنی کے پاپا کو ہوا، چھندے کو ہوا وہی ننکے کو ہوا۔''

''اتنا سب دیکھ کر بھی سبق نہیں سیکھا؟''

''ہماری بدقسمتی ہے اپنی آنکھوں کے سامنے بے بسی سے اپنی کوکھ اُجڑتے دیکھ رہے ہیں۔ اپنی اولاد کے وجود کو دیمک لگتے اُسے تنکا تنکا جھڑتے دیکھ رہے ہیں۔ ہم لوگ زندہ لاشوں سے کم نہیں۔ لاچار، مجبور، بے بس سب کچھ ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔'' کہتے کہتے اُس کا گلہ رُندھ گیا، آنکھیں برسنے لگیں۔ نمو نے بھی چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ اُس کی آنکھیں بھی تو بہن کا ساتھ دے رہی تھیں۔ دل کا درد آنکھوں کے ذریعے جتنا بہہ جائے اچھا ہے۔

''کاش اوپر والے نے دل کی جگہ پتھر رکھ دیا ہوتا تو اتنا درد نہ سہنا پڑتا۔'' آنکھیں صاف کرتے نورا نے کہا۔

دونوں خاموشی کی چادر میں لپٹی رہیں۔ درد باتیں کر رہا تھا زبان خاموش تھی۔ پھر نورا ہی چُپ کی چادر سے باہر نکلی:

''تجھے کوئی شہر میں جانتا ہے؟''

''کس لئے؟''

''کام چاہیے''

''کیسے؟''

''مجھے اور کیسے؟''

''اس عمر میں کام کرو گی؟''

''عمر کو کیا ہوا ہے؟ کماؤں گی نہیں تو کھاؤں گی کہاں سے؟''

''کھیت ہیں۔ اتنا بڑا مکان ہے۔ تمہیں کمانے کی کیا ضرورت ہے؟'' نورا سُن کر طنزیہ انداز میں گویا ہوئی۔

''کھیت؟ مکان؟ سب ختم ہو گیا۔ سب کچھ بک گیا۔ مکان کھنڈر ہو گیا۔ گھر کی ایک ایک چیز یہاں تک کہ پردے، کھڑکیاں، دروازے سب بیچ دئے اُس جنم جلے نے۔''

''مگر تمہیں اپنا گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ کم سے کم اپنی چھت تو ہے سر پر۔ اب تو وہ آسانی سے اُسے بھی بیچ دے گا۔''

''جانتی ہوں''

''پھر بھی اُس کے حوالے کر آئی؟''

''ہاں۔''

''مگر کیوں؟''

''میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ کیا کرتی اگر گھر چھوڑ کر نہ آتی۔ مکان کے ساتھ ساتھ وہ میرا سودا بھی کر رہا تھا۔ ماں کو بیچنے سے کچھ دن اور نشے کا انتظام ہو جاتا۔ یہ دیمک میرے گھر کو چاٹ گئی۔ تو ہی بتا نمو میں کیا کروں؟ میری کوکھ جل رہی ہے میری روح سلگ رہی ہے اور میں ناچاہتے ہوئے بھی جینے پر مجبور ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ پھپھک پھپھک کر رو پڑی۔

شہر کا آخری اجنبی شخص

محمد جمیل اختر
(راولپنڈی)

نیچے میرے پاس کوئی کام نہیں تھا سو میں چھت پہ آ گیا، میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک لگاتار گھومتا رہا لیکن میرے پاس کوئی بھی کام نہیں تھا سو میں اُکتا گیا اِس شہر میں، میں بالکل ہی اجنبی تھا اتنا اجنبی کہ مجھے یہاں کی زبان بھی نہیں آتی تھی میں نے گلی سے باہر دیکھا کچھ بچے کھیل رہے تھے میں نے سوچا میں زور سے چیخوں اتنی زور سے کہ آواز سارے شہر میں پھیل جائے لیکن میں نہیں چیخا، بھلا ان لوگوں کو میری بات کیسے سمجھ آسکتی ہے یہ کیا سمجھیں گے کہ میں کون ہوں اور کیوں چیخ رہا ہوں، میں تو اِس شہر میں اجنبی ہوں جس کی زبان یہاں کوئی بھی نہیں جانتا۔

میں نے پھر گلی میں جھانک کر دیکھا تو مجھے کچھ لوگ نظر آئے جو بہت تیزی سے گُزر رہے تھے اُن کی شکل، بال، اور ان کا سُرخ لباس بالکل میرے جیسا تھا یہ تو میرے ہی قبیلے کے لوگ ہیں، یہ ضرور میری بات سمجھیں گے، میں دوڑ کر گلی میں آیا لیکن وہ اتنی دور نکل گئے تھے کہ میں اُنہیں پکارتا بھی تو اُن تک میری آواز نہ پہنچتی لیکن میں نے پھر بھی اُنہیں بہت پکارا۔

''رکو میری بات سنو، مجھے کچھ کہنا ہے، اگر جانا ہی ہے تو مجھے بھی ساتھ لے کر جاؤ میں یہاں خاموش رہ رہ کر اُکتا گیا ہوں، کوئی بھی میری بات نہیں سمجھتا''

لیکن وہ لوگ آگے نکل گئے انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

میں وہیں گلی کے درمیان گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور زاروقطار رونے لگا۔

ایک گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی اور معلوم نہیں کونسی زبان میں مجھے وہ گاڑی والا برا بھلا کہنے لگا، وہ شاید راستے سے ہٹ جانے کا کہہ رہا تھا۔

میں نے آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا کہ شاید وہ میرے آنسو دیکھ کر میری پریشانی سمجھ پائے لیکن اُس نے میرے آنسوؤں کی ذرا پرواہ نہ کی کہ جیسے یہ آنسو فقط پانی ہوں اور لگاتار مجھے برا بھلا کہتا رہا۔

آہ، یہ کتنا عجیب شہر تھا کہ یہاں محبت اور ہمدردی کا شدید قحط تھا، لوگ آنسوؤں کو یکسر نظرانداز کر دیتے تھے اور جہاں آنسو نظرانداز کر دیئے جائیں وہاں قہقہے کھوکھلے ہو جاتے ہیں اور محبت کبھی بھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔

میں اُسی طرح روتے روتے سڑک پر آ گیا اور سڑک کنارے فٹ پاتھ پر چلنے لگا میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا وہ سارے کے سارے لوگ اجنبی تھے ان میں سے کوئی بھی میری جانب متوجہ نہ تھا۔

میں اُسی طرح روتا رہا جیسے میں گلی میں رو رہا تھا کبھی میری آواز تیز ہو جاتی تو کبھی میں سسکیاں لیکر روتا لیکن پاس گزرتے کسی شخص نے بھی مجھ سے نہ پوچھا کہ میں کیوں رو رہا ہوں شاید اِس شہر میں کسی کو کسی کی پرواہ نہیں تھی سب اپنی دھن میں دوڑے جا رہے تھے اور آپس میں اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے لیکن اُن کی باتیں جذبوں سے خالی تھیں۔ اردگرد کھانے پینے کی دکانیں تھیں کہ جن میں فاحتائیں لٹک رہی تھیں۔ دکاندار فاحتاؤں کو ذبح کرتے تو لوگ تالیاں بجا کر اُنہیں داد دیتے۔

''یہ کیا کر رہے ہو اِن فاحتاؤں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟'' میں زور سے چیخا لیکن تالیاں بدستور جاری رہیں سو میں آگے بڑھ گیا۔

سڑک کنارے ایک ہسپتال تھا کہ جس کے شیشوں سے اندر کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا کچھ مریض کہ جن کے سروں پر سونے کا تاج تھا، آرام دہ بستروں پر لیٹے ہوئے تھے اور ان کے گرد ڈاکٹروں کا ہجوم تھا خدمت گزار انہیں قیمتی برتنوں میں خوراک پیش کر رہے تھے۔ وہیں ایک کونے میں فرش پر کچھ لاغر مریضوں کا ڈھیر لگا تھا کہ جن پر کھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور وہاں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا پاس گزرنے والے منہ پر رومال رکھ کر گزرتے تھے۔

اتنے میں شور بلند ہوا۔

کچھ سپاہی کوئی اعلان کرتے ہوئے گزرے وہ لوگوں کو سڑک کے ایک اطراف میں کھڑا کرنے لگے تھوڑی دیر بعد ملک کے حکمران اور اُن کے قریبی ساتھیوں کی بگھیاں گزرنے لگیں۔

سب ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے اور حکمران کے حق میں نعرے لگانے لگے، میں نے دیکھا کہ لوگ اندھا دھند آنکھیں بند کیے حکمران کے حق میں نعرے لگائے جا رہے تھے۔

سپاہی سڑک کنارے نعرے لگاتے لوگوں پر تھوک پھینکتے ہوئے گزر رہے تھے اِس کے باوجود وہ آنکھیں بند کیے نعرے لگا رہے تھے۔

نعرے۔ بغیر جذبے کے خوشی کے نعرے۔

میں حیران تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں یہ اس ظلم اور رسوائی پر احتجاج کیوں نہیں کرتے۔

جب گاڑیاں میرے پاس سے گُزریں تو ان لوگوں نے کچھ تھوک میرے اوپر بھی پھینک دیا۔

میں چیخنے چلانے لگا اور میں نے انہیں بہت برا بھلا کہا

اُس ہجوم میں میں اکیلا شور مچانے والا تھا اردگرد کھڑے لوگوں نے مجھے حیرت سے دیکھا یہ پہلی صدا تھی جو اُس ہجوم میں بلند ہوئی تھی۔ سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا اور مجھے اُس شہر کے قاضی کے پاس لے گئے۔

قاضی کو میری اور مجھے اُس کی کوئی بات سمجھ نہ آ سکی میں لگاتار کہتا رہا کہ میرے ساتھ ظلم ہوا ہے لیکن قاضی مجھے غصے سے دیکھتا رہا وہ ساتھ میں چائے بھی پی رہا تھا اُس کپ میں کہ جس پر حکمران کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

ہم دونوں کی زبانیں مختلف تھیں میں نے قاضی کو اشاروں کی مدد

باقی صفحہ ۹۴ پر ملاحظہ کیجیے

منکہ مسمی فیروزدین

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

منکہ مسمی فیروزدین، پسر مائی اللہ وسائی سکنہ کچی آبادی، چک نمبر ۷۸۶ ق ب، اسلام نگر۔ بعد دعا اور سلام کے عرض یہ ہے کہ میں یہاں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ یہاں کی بابت میرے دل میں جو ڈر، خوف اور وسوسے تھے وہ قطعی بے بنیاد نکلے۔ یہاں کا ماحول، موسم اور رکھ رکھاؤ بہت ہی موافق ہے۔ سب سے بڑی بات شور شرابہ، چھینا جھپٹی، آپا دھاپی کا یہاں دُور دُور تک کوئی نام ونشان نہیں۔ بظاہر تو اس آبادی کا نام سُن کر انسان کے دل میں کسی دُور افتادہ اور لاقانون آبادی کا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے مگر یہاں آنے کے بعد مجھ پر ایک نیا جہاں روشن ہوگیا ہے۔

کچی آبادی چک نمبر ۷۸۶ ق ب کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہاں ہر آنے والے کا حساب کتاب نہایت ترتیب سے رکھا جاتا ہے۔ کئی مہذب ومؤدب اہلکار سلام و دعا کے بعد عزت و احترام سے آنے والے کی خیریت دریافت کرتے اور اُس کے حسب نسب کے علاوہ آنے والے کی بابت وہ تمام سوالات نہایت دھیمے اور شیریں لہجے میں دریافت کرتے ہیں جو نئے آنے والے کی گزری زندگی سے تعبیر ہوتے ہیں۔

چک نمبر ۷۸۶ ق ب کے بہت سے مکینوں کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اکثر آنے والے اپنی بابت کیے گئے سوالات کے درست جواب نہیں دے پاتے تو مہذب اور مؤدب ہرکارے کسی قدر پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور جب وہ اپنی ذہانت اور تجربے کو کام میں لاتے ہوئے نئے آنے والے کی زندگی کی کھوج سے کچھ غلط نتیجہ اخذ کرتے ہیں تو مہمان کے لیے بہت سی دشواریاں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جن کے بارے میں تفصیل سے بتانا ابھی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

آپ کے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ یہاں آنے کے بعد جب مجھے میری قیام گاہ پہنچا کر آپ لوگ گھر کو لوٹ گئے تھے تو چک نمبر ۷۸۶ ق ب کے با اخلاق ہرکاروں کے ہر ہر سوال کا میں نے صحیح جواب دینے کی پوری کوشش کی۔ آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ میں نے کڑی سے کڑی مشکل میں بھی کبھی جھوٹ نہیں بولا جس کا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ چک نمبر ۷۸۶ ق ب کے مہذب اہلکاروں نے میری ہر ہر بات کو درست مان کر میرے قیام وطعام میں بہت آسانیاں مہیا کر دی ہیں۔

ایک بات اہم جو آپ کو بتلانے والی ہے وہ یہ کہ چک نمبر ۷۸۶ ق ب میں دن ڈھلتے ہی چراغاں ہو جاتا ہے اور ایک ایک کر کے چک نمبر ۷۸۶ ق ب کے مکین نماز گاہ میں باجماعت نماز ادا کر کے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ چک نمبر ۷۸۶ ق ب کے پرانے مکین گفتگو سے پرہیز کرتے ہوئے نئے آنے والے مہمان کو بولنے کا پورا موقع فراہم کرتے اور تفصیل سے اُس کی خیر خیریت دریافت کرتے ہیں۔

جماعت کا طریقہ بھی ان کا بہت منفرد ہے۔ جونہی صف بندی ہوتی ہے تو کوئی بھی شخص آگے بڑھ کر امامت کراتا ہے اور نماز کی ادائیگی کے بعد نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کراتا ہے۔ ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی کہ چک نمبر ۷۸۶ ق ب کے مکین دعا کے دوران مانگنے کے بجائے اپنے میزبان کی نوازشات کا شکر کر کے بہت اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ یہاں ایک ضروری بات بتانے والی ہے کہ چک نمبر ۷۸۶ ق ب کے مکین نماز کے بعد ایک مجلس برپا کرتے ہیں یہ مجلس ایک طرح سے نئے مہمان کے اعزاز میں مقرر کی جاتی ہے۔ جس کی صدارت وہی شخص کرتا ہے جس نے نماز کی امامت کرائی ہوتی ہے۔ مجھ سے جب امام صاحب نے گفتگو کا آغاز کرنے کے لیے کہا تو میں نے اپنی عقل کے مطابق اُن کا تعارف دریافت کر لیا۔ امام صاحب کا تعارف سنتے ہی میرے حلق سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ ہم کتنے ہی گئے گزرے کیوں نہ ہوں ہیں تو سیّدوں کی اولاد ۔ بھلا ہم کیونکر ایک ادنیٰ موچی کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ میرے اعتراض پر چک نمبر ۷۸۶ ق ب کے سارے مکینوں کے چہروں پر تشویش دوڑ گئی اور سب لوگ منہ ہی منہ میں ورد کرنے لگے جس کو سمجھنے کی میں نے بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ شاید اس میں قصور میری سماعت کا ہے جو ایک مدت سے کمزور ہوگئی ہے۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ایک باریش بزرگ اپنی جگہ سے اٹھے اور اُنہوں نے میرِ مجلس میرا مطلب ہے امام صاحب کے ہاتھ چُومتے ہوئے میری جانب رُخ کر کے کہا ''حضرت یہ آپ نے کیا فرما دیا، نائی، دھوبی، موچی یا ترکھان ہونا تو قابلِ فخر ہے بشرطیکہ وہ شخص رزق حلال کماتا ہو۔ آپ کو علم ہے کہ امیرِ محترم نے اپنی زندگی میں کئی کئی روز کا فاقہ کاٹنے کے باوجود حرام کے رزق کا ایک لقمہ بھی کھانا گوارا نہیں کیا۔ اسی نیک عمل کے باعث آپ کو ہم نے اپنا امیر چُنا ہے۔'' مجلس کے باریش شرکاء نے اپنی داڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بلند آواز میں ''بیشک بیشک'' کی صدا بلند کی۔ جو لوگ باریش نہ تھے انہوں نے اپنے سینے پر دایاں ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں اس امر کی گواہی دی۔

میرِ مجلس کا سوال بہت سادہ اور عام فہم ہونے کے باوجود فوری طور پر مجھ سے جواب نہ بن پڑا۔ میری پریشانی کو بھانپ کر مجلس میں شامل دیگر بزرگوں نے ''ارشاد، ارشاد'' کہہ کر میری ہمت بندھائی تو میں نے دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا ''میرا نام فیروزدین پسر مائی اللہ وسائی ساکن ۔۔۔ کا رہنے والا ہوں۔ میرِ مجلس نے شفقت سے فرمایا یہ ہمارے علم میں ہے آپ وہ کچھ بتلائیے جس سے

''چہارسُو''

ہم لوگ لاعلم ہیں۔ میرِ مجلس کے شفیق لہجے نے میری ہمت بندھائی تو میں نے بات کو اپنے لفظوں میں آگے بڑھایا۔ ہمارا آبائی پیشہ زراعت ہے۔ ایک زمانے میں بزرگوں کے پاس اتنی زمین موجود تھی جس کی کاشت سے خاندان کا گزارا خوش اسلوبی سے ہو جاتا اور گردوپیش کے غریب غرباء کی سفید پوشی بھی قائم رہتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ نسلیں بڑھتی گئی اور زمین گھٹتی گئی۔

میرے جوان ہونے تک ہم لوگ کسان سے مزدور بن گئے تھے۔ میں نے گاؤں کے ترکھان قادر بخش کی شاگردی اختیار کر لی اور جب میں خود کاریگر بن گیا تو شہر میں جا کر بڑے ترکھانوں کے ساتھ چھوٹے ترکھان کے طور پر کام کرنے لگا۔ جونہی میں نے پہلی کمائی بے جی کے ہاتھ پہ رکھی اُن کے پیروں کو پہیے لگ گئے یعنی انہوں نے میری شادی کے لیے لڑکی تلاش کرنا شروع کر دی۔

شادی کے بعد کچھ دنوں تک تو میں اکیلا شہر میں نوکری کرتا مہینہ دو مہینہ بعد گھر لوٹتا تو ساری کمائی بے جی کو دے کر بے فکر ہو جاتا۔ مجھے نہیں معلوم میرے تین بچے دو بیٹے اور ایک بیٹی کب پیدا ہوئے اور کس طرح بے جی نے اُن کی پرورش کی، پتہ اُس وقت چلا جب بے جی ہمیں تنہا چھوڑ کر سفرِ آخرت پر چلی گئیں۔

گھر کی آبادی کے ساتھ آمدن بھی بڑھ رہی تھی اب میں اپنی شریکِ حیات کے ہاتھ پر اُس سے زیادہ کمائی لا کر رکھتا جتنا بے جی کے ہاتھ پر رکھتا تھا مگر ہر پھیرے پر بیوی کی شکایت کے دفتر کھُل جاتے۔ جب میں بیوی کو یاد کراتا کہ بے جی نے تو کبھی اس سے کم کمائی میں بھی گلہ نہیں کیا۔ گھر بھی خوش اسلوبی سے چلتا تھا اور چار پیسے بچ بھی جاتے تھے۔ میری بات کے جواب میں کچھ دیر تو اللہ کی بندی خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی جب میں نے اپنا سوال دہرایا تو آہستہ سے بولی ''جب بھی گھر میں کسی چیز کی تھوڑ ہوتی تھی تو بے جی چپکے سے اپنا بکسہ پھرولتیں اور خاموشی سے باہر نکل جاتیں۔ واپسی پر بے جی کے ہاتھ میں گھر کی ضرورت کی چیزیں بھی ہوتیں اور کچھ پیسے بھی ہوتے۔

دونوں میاں بیوی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھے تو ایک ہی حل نظر آیا۔ جو کام بے جی نے سالوں تک قسطوں میں کیا نیک بخت نے وہی کام ایک جھٹکے میں کر ڈالا۔ فرق یہ تھا کہ میں دبے قدموں سے جانے کے بجائے پُر جوش انداز میں بازار گیا اور رقم لانے کے بجائے اس شخص کے سپرد کر آیا جس نے کچھ عرصے بعد مجھے کام کی غرض سے سمندر پار بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

پہلی بار لمبی مدت کے لیے گھر سے باہر رہا تو مجھے گھر کی اہمیت کا شدت سے احساس ہوا مگر بچوں کی بہتری کا سوچ کر پورے تین سال گھر کا رُخ نہ کیا۔ ان تین سالوں کی کہانی بیان کرنے کے لیے نجانے کتنے تین سال درکار ہوں گے۔ بس اتنا جان لیجیے کہ جو گھر میں چھوڑ کر گیا تھا واپسی پر وہ مجھے قطعی انجان لگا۔ بچوں کے قد کاٹھ کے ساتھ زبانیں بھی نکل آئی تھیں۔ چوبیس گھنٹے گھر میں مقید رہنے والی نیک بخت کے پیروں میں چکر آ گیا تھا۔ اب وہ سفید رنگ کا ٹوپی والا برقعہ لینے کے بجائے سفید رنگ کی چادر لینے لگی تھی۔ گھر سے نکلنے سے قبل گنگھی پٹی اور کاجل درست کرنا نہ بھولتی۔ دالان میں لگے چرخی والے پنکھے کی جگہ بجلی کے پنکھے نے لے لی تھی۔ پانی کے مٹکے کی جگہ فریج آن پہنچا تھا، کپڑے دھونے کی ہودی میں واشنگ مشین میرا منہ چڑا رہی تھی۔ غرض اس مصنوعی زندگی میں وقت برباد کرنے سے بہتر چار پیسے کمانا ضروری سمجھا۔

بیوی کے اسرار پر میں نے تین کے بجائے دو سال میں گھر کا چکر لگانا شروع کر دیا تھا۔ مگر تبدیلی کی رفتار اُس سے بھی زیادہ تیز تھی۔ ذمہ داریوں کے بوجھ نے مجھے وقت سے پہلے بردبار کر دیا تھا سو میں نے دو سال کے چکر کو ایک سال میں بدل دیا۔ مگر حالات کا منہ زور گھوڑا کسی طور میرے قابو میں نہ آ رہا تھا۔ صرف میں ہی نہیں اب تو خاتونِ خانہ بھی بڑھتے ہوئے اخراجات اور بچوں کے پھیلتے ہوئے ہاتھوں سے کافی حد تک زچ ہو چکی تھی۔ وہ اکثر مجھے مکمل طور پر واپس آنے کا زور دیتی۔ میں بے کاری کا جواز پیش کرتا تو وہ چھوٹے موٹے کاروبار کی ترغیب دیتی۔

اس بار جاتے وقت میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ سال نہیں تو دو سال تک میں پکا گھر لوٹ آؤں گا مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میں سال کے بجائے ڈیڑھ ماہ بعد ہی گھر کی راہ لوں گا۔ اس مرتبہ گھر واپس آنے میں میرے ارادے یا منصوبے کو کوئی دخل نہ تھا۔ عمارت کی تیئسویں منزل پر کام کے دوران پیر پھسلنے سے میں زمین پر آ رہا جس سے میری دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئیں۔ قریب چھ ماہ میں زیرِ علاج رہا اور جب بیساکھیوں کے سہارے چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو میں نے نیک بخت سے کہا کہ جو جمع پونجی بچی ہے وہ میرے حوالے کرو تا کہ میں چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر سکوں۔ میرے مطالبے پر نیک بخت ہونقوں کی طرح میری شکل دیکھنے لگی۔ میں نے پیار سے کاندھا تھپتھپاتے ہوئے پوچھا ''خیریت تو ہے'' اس سوال پر نیک بخت دائیں پیر کے انگوٹھے سے زمین کھرچنے لگی تو میری تشویش میں اضافہ ہوا۔ میں نے آواز میں مٹھاس بھرتے ہوئے کہا ''کیا بات ہے تم مجھے پریشان لگ رہی ہو'' نیک بخت کی آواز بہت دُور سے آتی معلوم ہوئی۔ ''آپ جمع پونجی کی بات کرتے ہو، دو ماہ سے گھر کا سودا بلّے کی ہٹی سے ادھار آ رہا ہے'' جواب میں میرے منہ سے صرف اتنا نکل سکا ''ہیں۔۔۔''

معافی چاہتا ہوں میں آپ کو یہ بتلانا بھول گیا کہ ہر تین سال آمد پر بیوی ایک رشتہ ڈھونڈ رکھتی اور میری آمد پر ایک اولاد کی شادی کر دیتی۔ اس طرح بیٹی اپنے گھر کی تھی اور دونوں بیٹے بھی شادی شدہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ باپ کی معذوری انہیں متحرک کر دے گی اور وہ گھر کی باگ دوڑ سنبھال لیں گے۔ نتیجہ ڈھاک کے تین پات رہا۔ جی چاہا تو کام پر چلے گئے نہ جی چاہا تو چارپائی توڑتے رہے۔ چارپائی سے جی بھر گیا تو چرسی بھنگیوں کی ٹولی میں جا بیٹھے۔

ایک دو بار تو میرے سمجھانے پر بیٹوں نے خاموشی اختیار کی۔ آہستہ آہستہ اُن کے رویے میں خودسری آنے لگی۔ ایک دن میرے سمجھانے پر بڑا بیٹا

کہتا ہے ''ابا جی! اگر تسی وقت سر اپنے ساتھ ہمیں بھی کام پر لگوا دیتے تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ پَر آپ کیوں لگواتے، آپ کو تو نوٹوں کا چسکا پڑ گیا تھا۔'' ابھی میں بڑے کے نشتر کی چبھن سے جانبر نہ ہو سکا تھا کہ چھوٹے کی آواز کا تیر دل کے آر پار ہو گیا۔ ''اوئے رہن دے، میں نے تے سُنا ہے ابّے نے وہاں کسی جنانی سے نکاح کیا ہوا تھا۔ اسی لیے ابّا نہ خود آتا تھا نہ ہمیں لے کے جاتا تھا۔''

اوّل تو گھر میں کھانا پکنا مشکل ہوتا، پکتا تو ہماری باری اُس وقت آتی جب سب کھا چکے ہوتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ بڑی یا چھوٹی بہو نے ساس سے یہ کہہ کر جان چھڑا لی کہ کھانا ہانڈی میں پڑا ہے نکال کر کھا لینا اور جب نیک بخت کھانا لینے گئی تو دیکچی خالی نظر آئی۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ ہانڈی میں سالن نہ ہونے پر نیک بخت لسی، گڑ یا اچار یہ کہہ کر لے آتی کہ میرا سالن کھانے کو دل نہیں ہے۔ وہ عورت تھی برداشت زیادہ تھی مگر جب مجھے اس طرح کی باتوں کا علم ہوتا تو میں بولنے سے باز نہ آتا۔ اور اس قدر اونچی آواز میں ضرور بولتا کہ سب کے کانوں تک آواز پہنچ جاتی۔

بک بک، جھک جھک روز کا معمول بن گیا تھا۔ ایک دن میں نے گھر والی سے کہا کہ میرے پیر ضائع ہوئے ہیں ہاتھ تو ضائع نہیں ہوئے۔ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر گھر والی رونے لگی تو میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ''مرا نہیں ہوں میں، اور بڈھا بھی نہیں ہوا ہوں، ستو نجا سال کا بندہ بڈھا ہوتا بھی نہیں ہے، میں تو ویسے بھی ہٹا کٹا ہوں۔'' بازوؤں کی مچھلیاں ابھارتے ہوئے۔

دوسرے دن گھر والی کے منع کرنے کے باوجود میں بیساکھیوں کے سہارے کام کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ گھر سے کچھ فاصلے کے بعد کئی لوگوں سے کام کی بابت دریافت کیا تو کسی نے میری ٹانگوں کی طرف دیکھ کر کسی نے ہاتھ سے، کسی نے ہوں ہاں سے اشارہ کر کے جان چھڑا لی۔ میں نے ہمت ہارنے کے بجائے سفر جاری رکھا۔ کافی دُور جا کر ایک عمارت پر نظر پڑی اُس عمارت کے ایک دفتر کے سامنے بہت سے لوگ لائن لگا کر کھڑے تھے۔ میں سمجھا، ضرور یہ لوگ کام کاج کی تلاش میں کھڑے ہیں۔

لائن میں کھڑے آخری آدمی کے پیچھے جا کر میں بھی کھڑا ہو گیا۔ اگلے والے اور اُس سے اگلے والے کئی لوگوں نے میری طرف استہزایہ نظروں سے دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارہ کیا مگر میں انجان بن کر کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد دفتر کا باوردی چوکیدار آیا تو میرے پیچھے بھی کئی لوگ لائن میں کھڑے ہو چکے تھے۔ چوکیدار نے سب لوگوں کو لائن سیدھی کرنے اور شناختی کارڈ نکالنے کی تاکید کی۔ میں نے بھی جیب سے شناختی کارڈ اور بیرونِ ملک کے کاغذات کی نقول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیں کہ شاید میرا تجربہ کام آ جائے۔ میرے آگے کھڑے لوگوں کے نمبر وار نام لکھ کر اور اُن سے شناختی کارڈ لے کر جب وہ شخص میری طرف آیا تو حقارت سے بولا ''بابا تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟'' جواب میں میں نے اُس سے بھی کڑک آواز میں کہا ''میں تمہیں بابا نظر آتا ہوں، ہاتھ ملا کے دیکھو، نانی یاد نہ کرا دی تو میرا نام نہیں۔'' اب وہ آدمی طیش میں آ چکا تھا اور مجھے گھسیٹ کر لائن سے الگ کرنا چاہتا تھا مگر میری طاقت کے آگے اُس کا زور نہ چلتا تھا کہ اچانک دفتر کی اوپری منزل میں کھڑے بارعب شخص نے اونچی آواز میں شخص مذکور کو پکارا۔ ''ذوالفقار کیا کر رہے ہو'' شخص مذکور سٹپٹا کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اوپر سے پھر آواز آئی ''اس شخص کو مت نکالو۔''

ہم لوگوں کو عمارت کی نچلی منزل کے برآمدے میں لگی کرسیوں پر بٹھا دیا گیا اور سب کے ہاتھ میں ایک ایک بسکٹ کا پیکٹ اور ایک ایک جوس کا ڈبہ تھما دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک بڑی وین ہمارے سامنے آ کر رُکی جس میں ہم لوگوں کو بیٹھنے کا کہا گیا۔ قریب پندرہ منٹ کے بعد یہ ائیر کنڈیشن وین ایک بڑے ہسپتال کے آگے جا کر رُکی جہاں ہم سب کو قطار میں کھڑا کر کے اندر لے جایا گیا۔ پہلی منزل سے دوسری اور تیسری منزل لفٹ کے ذریعے چند منٹ میں آ گئی۔ وہاں بھی بہت ساری خالی کرسیاں لگی تھیں جن پر ہمیں بٹھا دیا گیا۔ ابھی ہم لوگ ڈھنگ سے سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ وہی بارعب شخصیت جس نے دفتر کی اوپری منزل سے مجھے لائن سے نکالنے پر منع کیا تھا آن پہنچی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی دائیں ہاتھ کے کونے والے کمرے کے اندر چلی گئی۔

جس نمبر سے ہم لوگ لائن میں کھڑے تھے اُسی نمبر سے ہمیں اندر بلایا جاتا رہا اور واپس آنے والوں سے یہ علم ہوتا رہا کہ اندر خون لیا جا رہا ہے ٹیسٹنگ کے لیے۔ قریب دو گھنٹوں کے بعد نام لے کر دو تہائی لوگوں کو پکارا گیا اور انہیں ایک ایک بند لفافہ تھماتے ہوئے شکریہ کے ساتھ یہ کہہ کر رخصت کیا گیا کہ وین آپ کو منزل مقصود پر پہنچا دے گی۔

شام ہونے کو آ رہی تھی اور ہم نو آدمی امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا تھے کہ نجانے اندر سے کیا خبر آتی ہے، کس کو لفافہ دے کر رخصت کر دیا جاتا ہے اور کس کو ٹھہرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ قریب سات بجے وہی بارعب شخصیت کمرے سے نمودار ہوئی، اپنائیت سے ہماری خیریت دریافت کرتے ہوئے ''آپ لوگوں کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی'' ہماری جانب سے زبان اور سر کی جنبش سے نہیں سُن کر اُن کے منہ سے ''گڈ'' نکلا۔ اُس کے بعد ہاتھ اٹھاتے ہوئے ''بات یہ ہے کہ آپ، آپ، اور آپ کو کل بھی تشریف لانا ہو گی۔'' ان تین آپ میں ایک میں بھی تھا۔ گھر آ کر میں نے بیوی کو کچھ نہیں بتلایا صرف یہ کہہ کر تسلی دی کہ کل بلایا ہے۔ بیگم نے آسمان کی جانب دوپٹہ پھیلا کر لمبی دعا مانگی اور بھاگ بھاگ کر میرے لیے کھانا لگانے لگی۔ آج اُس کے چہرے کی رنگت کئی دنوں بعد لوٹ آئی تھی اور چال کی پھرتی بھی بتلا رہی تھی کہ جیسے اُس کی دعا قبول ہو گئی ہو۔

بیگم کی خوشنودی کے لیے میں نے بھوک نہ ہونے کے باوجود آہستہ آہستہ کھانا شروع کر دیا مگر ہر نوالے کے بعد میرا ذہن بڑے صاحب اور ہسپتال

کی جانب مڑ جاتا، کل کیا ہوگا؟ خواہشات اور ضروریات اپنی جگہ مگر حقیقت کا دارومدار خون کے اُس ٹیسٹ پر تھا جس کی رپورٹ کل صبح ملنے والی تھی۔ جس طرح کھانا زہر مار کیا تھا اُسی طرح نیند سے بھی دوبدو ہو گیا۔ نیند جیت گئی اور میں ہار گیا۔ لیکن یہ ایسی ہار تھی جس کا مجھے دُکھ نہیں بلکہ خوشی تھی کہ دن نکل آیا اور اُمید کی لَو جاگ اٹھی۔ اُسی لَو نے، رات بھر کے رت جگے کے باوجود میرے جسم میں اتنی توانائی بھر دی تھی کہ مذکورہ دفتر کا جو فاصلہ میں نے گذشتہ روز چالیس منٹ میں طے کیا تھا آج پچیس منٹ میں طے ہو گیا تھا۔ تینوں میں پہنچنے والا میں پہلا شخص تھا مگر نہیں مجھ سے پہلے بڑے صاحب اپنے سیکرٹری کے ہمراہ مضطرب کیفیت میں ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ آگے بڑھ کر بڑے صاحب نے میرا اس طرح استقبال کیا جس طرح کسی مہمان کا کیا جاتا ہے۔ ابھی وہ بقیہ دونوں آدمیوں کی بابت دریافت کر ہی رہے تھے کہ وہ دونوں بھی پہنچ گئے۔ بڑے صاحب نے تیزی سے اپنی قیمتی گاڑی کا پچھلا دروازہ ہم تینوں کے لیے کھولتے ہوئے بیٹھنے کے لیے کہا اور سیکرٹری کو ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ کی جانب اشارہ کر کے جھٹ سے گاڑی چلا دی۔ ہسپتال پہنچ کر ہم تینوں خاموش بیٹھ کر دل ہی دل میں خدا سے اپنی کامیابی کی دعا کر رہے تھے۔ ایک ایسی کامیابی کی دعا کہ جس میں جان کی بازی ہماری منتظر تھی۔

بڑے صاحب کا سیکرٹری باری باری ہمیں چائے، پانی اور جوس پلاتا رہا اور ہم سے کھانے کے بارے میں دریافت کرتا رہا مگر ہماری بے چینی دیکھ کر اُس کے لہجے اور برتاؤ میں بھی کافی مروّت آ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد بڑے صاحب ڈاکٹر کے کمرے سے برآمد ہوئے تو ہم تینوں اُن کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ اُن کے دائیں ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جسے وہ خوشی سے ہوا میں لہراتے ہوئے میرے قریب آئے اور میرا ماتھا چوم کر مجھے مبارک دینے لگے ''مبارک ہو فیروز بھائی آپ کا

general test
complete blood count
urine test
comprehensive metabolic pannel
A B AB O
24 hour urine for protein and clearance
HLA
Ultrasound

سب میچ ہو گیا ہے۔ بس اب

kidney arteries angiogram

کرانا باقی ہے۔

یہاں پہنچ کر میرے حساب سے کہانی ختم ہو چکی تھی مگر میر مجلس نے مجھے یہ کہہ کر چونکا دیا ''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پلٹ کر کہا ''چھوڑیں جی رات بہت ہو گئی ہے پھر کبھی سہی۔'' میر مجلس نے میری بات کو سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا ''چک نمبر ۷۸۶ ق ب میں دن رات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں زندگی انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔ ہمارا دکھ سکھ سب سانجھا ہے۔ آپ بیان جاری رکھیں سب لوگ اشتیاق سے سُن رہے ہیں۔''

میر مجلس کی حوصلہ افزائی پر میں نے سر گھما کر مجلس پر نظر دوڑائی تو سبھی لوگ تازہ دم تھے اور پُر اشتیاق نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

بڑے صاحب نے معاملات طے کرتے وقت مجھ سے لین دین کی بات کی تو میں نے یہ معاملہ اُن کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ کچھ دیر تردد میں رہنے کے بعد اُنہوں نے آہستہ سے ایک رقم کا ہندسہ میری جانب لڑھکایا تو میں نے جواب میں سر ہلا کر حامی بھر لی۔ میرے خیال میں یہ رقم اتنی تھی کہ ہم میاں بیوی دو وقت کی روکھی سوکھی کئی سالوں تک کھا سکتے تھے۔

آپریشن کے تیسرے روز بہت سارے پھل، مٹھائی، کیک، پھول اور رقم کے موٹے لفافے کے ساتھ بڑے صاحب کی گاڑی مجھے گھر چھوڑنے آئی تو دونوں بیٹے گاڑی کی آواز سن کر باہر نکلے۔ دونوں کے چہرے پر ناگوار کیفیت اور بے زاری کو بڑی گاڑی نے دُور کر دیا تھا۔ اب ناگواری اور بے زاری کی جگہ اشتیاق نمایاں ہو گیا تھا۔ جوں ہی ڈرائیور نے گاڑی سے اُتر کر میری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے سامان اٹھانے سے مجھے منع کیا اور خود سامان اٹھا کر میرے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوا تو دونوں لڑکے بیک آواز اپنی اپنی بیگمات کو پکارنے لگے۔ بہوؤں کے ساتھ پوتا پوتی بھی تھے جو مجھے دادا دادا کہہ کر چمٹ گئے۔ میں نے ڈرائیور سے سارا سامان بڑے بیٹے کو دینے کا کہا جو وہ خوشی خوشی اپنی بیگم کی طرف لے کر بڑھنے لگا مگر برآمدے میں کھڑی ماں کو دیکھ کر اُس نے راستہ بدل لیا۔

میری خاموشی کے جواب میں میر مجلس نے پھر سے بات آگے بڑھانے کی دعوت دی تو میں گویا ہوا۔ بس جی رقم کا آنا تھا پھر سے اللّے تللّے شروع ہو گئے۔ میں نے گھر والی سے کہا ''بھلی مانس کم از کم آدھی رقم بکسے میں ڈال کے منہ بند کر لے۔'' بھلی مانس نے میری بات کو پلے باندھ کر آدھی رقم بکسے میں ڈال دی اور باقی پیسے اپنی اولاد اور اُن کے بچوں پر فیاضی سے خرچ کرنے لگی۔ بیگم کی فضول خرچی دیکھ کر میرا دل ہول رہا تھا مگر اُسے روکنا بھی مشکل تھا۔ سالوں بعد اُس نے پیسہ دیکھا تھا جلد سے جلد دل کے ارمان نکالنا چاہتی تھی۔ اب ابّا اور امّاں، ابّا جی اور امّاں جی ہو گئے تھے۔ کھانا پکانے سے پہلے ہماری فرمائش پوچھی جاتی اور کھانا پکنے کے بعد کھلایا بھی پہلے ہمیں جاتا۔ اس خاطر تواضع سے میرا دل یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا کہ جس رفتار سے پیسے خرچ ہو رہے ہیں یہی رفتار جاری رہی تو تھوڑے عرصے بعد پھر سے گھر میں ابّا، امّاں کی آوازیں سنائی دیں گی اور پھر سے روٹی ٹکڑ کو ترسنا ہوگا۔

چند دن بعد مہینے کی پہلی تاریخ تھی کہ گھر کے دروازے کے آگے گاڑی کا ہارن بجا جسے سن کر بچے دوڑے دوڑے باہر گئے اور مجھے آ کر بتلایا کہ وہی گاڑی پھر آئی ہے۔ابھی میں باہر جانے کے لیے بیساکھیاں تلاش کر رہا تھا کہ وہی ڈرائیور مٹھائی ، کیک، پھل، پھول اور ایک لفافہ لیے نمودار ہوا۔ میں نے حیرت سے دریافت کیا ''یہ سب کیا ہے؟'' ڈرائیور نے بڑی لجاجت سے کہا ''صاحب نے بھیجا ہے'' میں نے گومگوں کی کیفیت میں وہ چیزیں چار پائی پر رکھنے کا کہا اور نیک بخت کو چائے لانے کی آواز لگائی۔ ڈرائیور نے معذرت کرتے ہوئے جلد جانے کا کہا اور آناً فاناً گاڑی میں بیٹھ کے چلا گیا۔اتنے میں بھلی مانس میرے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی اور بچے کیک، مٹھائی سے جی بہلا رہے تھے۔لفافہ کھولا تو اُس میں اُتنی کی رقم تھی جتنی آپریشن کے بعد دی گئی تھی۔ مجھے اُٹھتا دیکھ کر بھلی مانس بولی ''کہاں چلے؟'' میں نے بیساکھیوں پر اپنا وزن ڈالتے ہوئے کہا ''رقم واپس کرنے'' بھلی مانس نے میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا ''صغیر کے ابّا کبھی کبھی تم بالکل سادہ ہو جاتے ہو، بڑے صاحب نے اپنی مرضی سے بھیجی ہے،تم نے مانگی تھوڑی ہے،اسے اللہ کی دین سمجھ کر رکھ لو بچوں کے کام آئے گی۔''

اس سے قبل کے وقفے میں میرِ مجلس مجھے بات مکمل کرنے کا کہیں میں نے بیان جاری رکھا۔بس صاحب! اس کے بعد ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو اسی گاڑی میں ڈرائیور آتا اور اتنی رقم دے جاتا۔ایک دن بھلی مانس سے نظر بچا کر میں ٹیکسی میں بیٹھ کر بڑے صاحب کے دفتر چلا گیا۔ سب سے پہلے تو بچے کی خیریت دریافت کی ۔ صاحب نے ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے جب یہ بتلایا کہ بچہ بالکل ٹھیک ہے اسکول بھی جاتا ہے اور کھیل کود میں بھی حصہ لیتا ہے تو میری زبان سے بے ساختہ دعائیں نکلنے لگیں۔ جب میں نے بڑے صاحب سے رقم بھیجنے کا گلہ کیا تو وہ بولے ''کم ہے؟'' مجھ پر رقت طاری ہو گئی، آنسو ضبط کرتے ہوئے میں نے کہا ''میں تو اپنا حق پہلے دن ہی لے گیا تھا!'' میرے جواب پر صاحب نے ہنستے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور بولے ''فیروز بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہو، یہ رقم تو آپ کو ہر ماہ ملنی ہے اور باقاعدگی سے ملنی ہے'' قبل اس کے میں جھک کر بڑے صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاؤں انہوں نے اُٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور میرے ماتھے کو بوسہ دیتے ہوئے بولے ''میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔''

اب اس کے بعد کی کہانی تو جی وہی ہے جو دنیا کا دستور ہے پہلے کس کی باری۔ بس جی ہوا تو نزلہ زکام ہی تھا مگر وہ بڑے بخار میں تبدیل ہو گیا اور نیک بخت خاموشی سے خدا حافظ کہہ گئی۔ میری کاٹھی مضبوط تھی یا یوں کہہ لیں کہ میں وقت زیادہ لے کر آیا تھا اس لیے اُس کے بعد بھی سالوں زندہ رہا۔ لونڈے لپاڑے کام جھام پہلے ہی نہیں کرتے تھے ماہانہ رقم نے اُنہیں بالکل نکما بنا دیا۔ کچھ عرصے تو میں نے ڈانٹ ڈپٹ اور نصیحت کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ تو بالکل چکنے گھڑے ہو گئے ہیں تو میں نے چپ کی چادر میں بُکل مار لی۔

فساد تو جی کچھ روز نیک بخت کے جانے کے بعد بھی گھر میں رہا۔ اُڑتی اُڑتی کانوں میں پڑی کہ بڈھا قبر کے نزدیک ہو گیا مگر پیسے سے پیار نہیں گیا۔ جونہی گڈی آتی ہے کھیسے میں لگا کر یوں گُم ہو جاتا ہے جیسے کچھ آیا نہ ہو۔ پائی پائی کو محتاج بنا کر رکھ دیا ہے۔نجانے کہاں لے کر جائے گا یہ دولت؟

ایک دن میں نے سوچا کہ رقم تو میں ساری ان پر خرچ دیتا ہوں پھر میں پاس رکھ کر مفت میں باتیں کیوں سُنتا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگلی بار جب رقم آئے گی تو میں خود سے بڑے بیٹے کے ہاتھ میں دے دیا کروں گا۔ یہ بات میرے دل میں پکی طرح گھر کر گئی مگر اچانک مجھے احساس ہوا کہ اگر میں بڑے کے ہاتھ میں دوں گا تو وہ باہر یاروں میں اُڑا دے گا۔ چھوٹے والے کے ہاتھ میں دوں تو وہ کونسا سادھ ہے۔ وہ اُس کا بھی باپ ہے۔ پھر کیا کیا جائے؟ کئی دن کے غور وفکر کے بعد بڑی بہو کو بلا کر سمجھایا کہ دیکھ تیرے بچے ہیں اور مرد تیرا کام دھام کرتا نہیں، لہٰذا میں اگلی پہلی سے پیسے تجھے دیا کروں گا۔ بس جی اتنا کہنا تھا کہ بڑی کی تو باچھیں کِھل گئیں۔ دوڑی دوڑی گئی اور میرے لیے دودھ پتی بنا کر لے آئی۔

اب میری حالت مکھی مار کی ہو گئی تھی ۔ بڑھاپے نے جسم کی ساری جان نچوڑ لی تھی۔ کبھی کبھی تو مکھیاں میرے گالوں پہ اس طرح سیر سپاٹا کرتیں جیسے گاؤں کی پکی سڑک پر گاڑیاں چلتی ہیں۔ ڈاکٹر کو دکھلاتے، وہ کونسا کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر بنا تھا۔ اٹکل پچو کبھی ایک دوائی تھما دیتا کبھی دوسری۔ پوچھو کیا بیماری ہے تو ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا ''بڑھاپا''

میرے خیال میں کہتا وہ بھی سچ تھا کیونکہ نیند اکثر غنودگی میں بدل جاتی تھی مگر کان کھلے رہتے تھے۔ ایک دن اسی طرح کی نیند میں غنودگی طاری ہوئی بڑے بیٹے کی آواز پر میں نے کوئی ہل جل نہ کی اُس نے جلدی سے چھوٹے کو آواز دے کر بلا لیا۔ ''لگتا ہے ابّا نکل لیا'' میرے کانوں میں یہ آواز پڑی تو مجھے سمجھ نہیں آئی کہ میں کہاں آ گیا ہوں البتہ چھوٹے بیٹے کی آواز کان میں پڑی ''اوئے اُتا وِلے چنگی طرح ہلاں کے دیکھ لے اتنی جلدی مرنے والا نہیں ساڈا پیو''

بس جی اُس دن کے بعد میں سچ مچ مر ہی گیا تھا۔ روٹی گھنٹوں پڑی رہتی کھانے کو دل نہ کرتا۔ بھوک پیاس دونوں مر چکی تھیں۔ دوائی کھانا بھی چھوڑ دی تھی۔ کبھی دو گھونٹ چائے کے حلق سے اتار لیتا تو کبھی چھوٹی بہو کبھی بڑی بہو پانی کے دو گھونٹ میرے حلق میں انڈیل دیتی۔ گاڑی اسی طرح چلتی رہی کتنے دن یہ میں نہیں جانتا۔ نیند گھٹتی رہی غنودگی بڑھتی رہی۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ غنودگی نے نیند کو مار بھگایا۔

اب میری آنکھوں نے دیکھنا، کانوں نے سُننا چھوڑ دیا تھا البتہ میری حِسیں اب بھی کام کر رہی تھیں۔ پہلے کی طرح چھوٹے بیٹے نے بڑے کو آواز دی تو بڑا دوڑا آیا ''لاٹری نکل آئی کیا'' چھوٹے نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''آپ دیکھ لے'' بڑے نے مجھے زور زور سے ''ابّا، ابّا، ابّا'' کہہ کر بلایا اور ڈھیلے ہاتھ سے مجھے چھوڑ کر ''ہرّے۔۔۔ لاٹری نکل آئی۔۔۔

لاٹری نکل آئی۔۔۔'' بڑے کو پیچھے کر کے چھوٹے نے مجھے ہلا کر تسلی کی تو میرا دل بھر آیا۔ میں نے سوچا مجھ نکمی جان کے لیے بے وجہ ان لوگوں کو رونا پیٹنا پڑے گا۔۔۔مگر۔۔۔اُس وقت میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب چھوٹے نے مجھے چھوڑ کر میرے کھیسے سے چابیاں تلاش کیں ۔ ایک بھائی دوسرے بھائی پر جھپٹا۔۔۔ایک نے بیٹھک کا ٹرنک کھولا۔۔۔دوسرے نے بھڑولی کے ساتھ رکھے ٹرنک کو پھرولنا شروع کیا۔۔۔دونوں بہوؤں نے بڑے کمرے میں رکھے ٹرنک کے سامان کو ایک ایک کر کے باہر پھینک مارا۔۔۔!

☆

''ارے یہ کیا۔۔۔تم رو رہے ہو۔۔۔؟''

''رو تو نہیں رہا۔۔۔آنسو خود بخود نکل آئے ہیں۔۔۔یہ آنسو دکھ کے نہیں شرمساری کے ہیں۔۔۔''

''شرمساری۔۔۔کیسی شرمساری۔۔۔؟''

''رہ رہ ۔۔۔ کے ایک ہی ملال۔۔۔ دل کو تڑپاتا ہے۔۔۔ کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ اچھے وقتوں میں ۔۔۔میں نے کچھ پس انداز کر لیا ہوتا۔۔۔تو میرے بچوں کو مایوسی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔۔۔کیا سوچتے ہوں گے ۔۔۔میرے بارے۔۔۔ یہی نا۔۔۔ بڈھے کو پیسے سے پیار تھا۔۔۔مرتا مر گیا۔۔۔مگر ایک کوڑی چھوڑ کر نہ گیا۔۔۔کاش۔۔۔ میں اپنی اولاد کے لیے ۔۔۔کچھ کر سکتا۔۔۔!!

☆

''کیسے ہو فیروز بھائی۔۔۔؟''

''شکر ہے۔۔۔شکر ہے۔۔۔''

''آپ کے لیے خوشخبری ہے۔۔۔''

''میرے لیے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔آپ کے لیے۔۔۔''

''اچھا۔۔۔''

''مہربانِ کُل نے آپ کی دعا قبول فرمائی۔۔۔ اور۔۔۔فرمان جاری کر دیا۔۔۔کہ۔۔۔آج کے بعد۔۔۔آپ کی آل اولاد۔۔۔گھر کے جس کونے کو ہاتھ لگائے گی۔۔۔جس بکسے۔۔۔الماری۔۔۔یا۔۔۔بھڑولی۔۔۔کو پھرولے گی۔۔۔اُن کے من کی مراد۔۔۔ بَر آئے گی۔۔۔آپ کی نسل سے غربت۔۔۔ افلاس۔۔۔ اور۔۔۔ تنگ دستی کا۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔خاتمہ کر دیا گیا۔۔۔

☆

منکہ مسمی فیروز دین پسر مائی اللہ وسائی سکنہ کچی آبادی، چک نمبر ۷۸۶ ق ب، اسلام نگر بہت آرام سے ہوں۔۔۔اور آپ کی خیریت۔۔۔!!!

- بقیہ -

فکرت

خوب خوب چرچا کروائی گئی ہر چھوٹے بڑے پرچوں نے اشتہاروں کے لالچ میں اس پر تبصرے شائع کیے۔فکرت کی رسمِ اجراء کے موقع پر ملک کے مختلف حصوں سے قلم کار تشریف لائے ۔سب کو بذریعہ ہوائی جہاز بلایا گیا۔ شہر کے دو بڑے ہوٹل بُک کروا لیے گئے۔مہمانوں کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ رہی۔ کتاب کی رسمِ اجراء ایک منتری کے ہاتھوں سے ہوئی۔ ہر طرف اشفاق انصاری، اشفاق انصاری ہو رہی تھی۔تقریب میں فکرت کی تعریف میں پانچ ادبی دانشوروں نے مضامین پڑھے۔ بڑے ادیبوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔رات کے دو بجے تقریب کا اختتام ہوا۔

تقریریں کرنے والے ادیبوں نے اشفاق انصاری کو اردو افسانے کا تابناک مستقبل بتایا۔تعریفوں اور تالیوں کی گونج کے نشہ میں چُور جب وہ گھر لوٹنے لگا تو گاڑی روک کر اشرف نے اُسے کچھ کاغذات تھماتے ہوئے کہا۔انصاری یہ وہ پانچ مضامین ہیں جو فکرت پر پڑھے گئے۔فکرت پر اور مضامین بھی اکٹھے کریں گے اور ایک کتاب شائع ہو جائے گی۔ اُس نے ہونٹ انصاری کے کان کے قریب لا کر سرگوشی کی۔

سیکرٹری اردو اکادمی سے میری بات ہو گئی ہے۔وہ ''فکرت'' پر پچیس ہزار کا ایوارڈ دے دیں گے۔ایوارڈ پہ کتنا ہی خرچ ہو جائے ،خوب پبلسٹی کریں گے۔اب تم چلو کچھ مہمانوں کو مجھے پے منٹ کرنا ہے۔ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ سوچ رہا تھا واقعی اشرف نے دوستی نبھا دی۔تقریباً ایک لاکھ تو خرچ ہو گئے مگر اُس کا نام بلندیوں پر پہنچ گیا۔یہی وہ چاہتا تھا بڑی بات یہ کہ اُسے کچھ کرنا بھی نہ پڑا۔نہ مطالعہ کی مشقت اُٹھانی پڑی نہ لمبے عرصے تک صبر کرنا پڑا۔ شہرت کے نشہ میں چُور ہواؤں کے دوش پر اُڑتا ہوا وہ گھر پہنچا۔

صبح اُٹھ کر اُس نے بیڈ ٹی لی۔رات کی تقریب کی کامیابی کے بارے میں مبارک باد کے فون آنے لگے۔چائے سے فارغ ہو کر موبائل فون کان کو لگاتے وہ اپنے پارک میں چہل قدمی کرتا ہوا نکل گیا۔بادل نخواستہ وہ پارک کے ساتھ لگتے اپنے چھوٹے قد سے جم میں داخل ہوا۔ اُس نے اپنا قد ناپا تو اُس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔۔۔اُس کا قد پہلے سے دو انچ کم ہو چکا تھا۔اُسے محسوس ہوا جیسے فضا میں رام جی کے قہقہے گونج رہے ہوں۔

''محبوب کی سنّت''

عارف شفیق

(کراچی)

سجدے میں جب روئیں گے تو آنکھ کھلے گی
داغ دلوں کے دھوئیں گے تو آنکھ کھلے گی

بند آنکھوں سے دیکھ رہے تھے دنیا کو
گہری نیند جو سوئیں گے تو آنکھ کھلے گی

اپنے دکھوں پر ہردم روتے رہتے ہیں ہم
دکھ پہ کسی کے روئیں گے تو آنکھ کھلے گی

جب اس کے محبوب کی سنّت اپنا کر ہم
پیار دلوں میں بوئیں گے تو آنکھ کھلے گی

کھو کر اس دنیا میں رب کو بھول گئے ہیں
یاد میں اس کی کھوئیں گے تو آنکھ کھلے گی

کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا جس دن
بوجھ خود اپنا ڈھوئیں گے تو آنکھ کھلے گی

اک قطرے کی صورت ہیں غفلت میں ہم
جب دریا میں کھوئیں گے تو آنکھ کھلے گی

دھرتی کی آغوش میں گہری نیند میں ہیں ہم
چاند اور سورج سوئیں گے تو آنکھ کھلے گی

ان کا روضہ سامنے ہو گا جس پل عارفؔ
اندر اندر روئیں گے تو آنکھ کھلے گی

○

فرح طوبا

(جرمنی)

دل کی لغزش نہ خطا ہے کوئی
بس یونہی روٹھ گیا ہے کوئی

میں نے رُک رُک کے تجھے یاد کیا
دل میں جب درد اُٹھا ہے کوئی

یا ہوا خاک اُڑاتی ہو گی
یا مجھے ڈھونڈ رہا ہے کوئی

موت آتی ہے نہ تُو آتا ہے
یہ بھی جینے کی سزا ہے کوئی

اب وہ ملتا ہے تو یوں لگتا ہے
سلسلہ ٹوٹ گیا ہے کوئی

○

رئیس صدیقی

(دہلی، بھارت)

کھونے کی کوئی بات، نہ پانے کی بات ہے
بس زندگی کا ساتھ نبھانے کی بات ہے

ہر خوف اپنے دل سے بھلانے کی بات ہے
طوفان میں چراغ جلانے کی بات ہے

نفرت کی آندھیوں سے نہ حل ہو گا مسئلہ
جو آگ لگ چکی ہے، بجھانے کی بات ہے

اس کا حقیقتوں سے نہیں کوئی واسطہ
سچائی اب تو صرف فسانے کی بات ہے

تم مسکرا بھی نہیں سکتے کیا میرے لیے؟
یہ تو کسی کے کام نہ آنے کی بات ہے!

ہم نے کبھی گمان میں رکھی نہیں رئیسؔ
وہ بات جو کسی کو ستانے کی بات ہے

○

سیفی سرونجی

(بھارت)

ہر شخص کی نظروں میں تری دھاک بہت ہے
شاید کہ تجھے وقت کا ادراک بہت ہے

یوں تو کسی بھی بات میں سچا نہیں لیکن
الفاظ میں جادو ہے وہ چالاک بہت ہے

لیتا ہے مزے خون کی ہولی کے شب و روز
اس عہد کا انسان بھی سفاک بہت ہے

دو دن کی ملاقات میں گھل مل گیا تجھ سے
محسوس یہ ہوتا ہے کہ بیباک بہت ہے

دریا ہو سمندر ہو یا ہو کوئی طوفان
بے خوف گزر جاتا ہے تیراک بہت ہے

○

شریف شیوہ

(لاہور)

کاغذی ناؤ کی صورت زندگی پانی میں ہے
ہر قدم تیرا مسافر، جادۂ فانی میں ہے

نام ہے جس کا قیامت اُن کے ماتھے کا ہے بل
خُلد کہتے ہیں جسے، اُن کی مہربانی میں ہے!

بے خبر سوئے ہیں وہ، گیسو ہیں ان کے ہوشیار
حُسن کا سارا خزانہ جنکی نگرانی میں ہے

جھیل میں دھوئے تھے اُس نے، پاؤں اپنے ایک بار
آج تک مسحور کُن مہکار اُس پانی میں ہے

اس سرائے سے تجھے جانا پڑے گا ایک دن
یاد رکھ کہ تو یہاں دو دن کی مہمانی میں ہے

ٹوٹنے کے بعد ہی بنتا ہے یہ دل لاجواب
یعنی اس کی قدر و قیمت خستہ سامانی میں ہے

آپؐ کے جیسا جہاں میں دوسرا کوئی نہیں!
کرنے والی جستجو ہر آنکھ حیرانی میں ہے

عشق ہے وہ راز جس کا کچھ پتہ چلتا نہیں
پانی ہے اس آگ میں اور آگ اس پانی میں ہے

جام بھر کر، شیوہؔ اُن کام مجھ کو تکنا بار بار
ضبط ہے لرزاں مرا، توبہ پریشانی میں ہے

○

نوید سروش

(میرپورخاص)

دل گرفتہ سہی جان باقی رہے
زندہ رہنے کا امکان باقی رہے

ٹھوکریں کھا کے اک دن سنبھل جائے گا
اس کے اندر کا انسان باقی رہے

میرؔ و دردؔ اور مومنؔ سب اپنی جگہ
مرزا غالب کا دیوان باقی رہے

کچھ مداوا تو ہو میری تنہائی کا
گھر میں ایک آدھ مہمان باقی ہے

فلسفہ زندگی کا سمجھ جاؤ گے
اپنی ہستی کا عرفان باقی رہے

زندگی میں کرو کوئی ایسا عمل
جس سے دنیا میں سحان باقی رہے

یاد آؤں گا اُس کو سروشؔ ایک دن
میری جانب اگر دھیان باقی رہے

○

ابراہیم عدیل
(جھنگ)

حسیں دیسوں کی رانی رو رہی تھی — سرِ شب اک کہانی رو رہی تھی
اداسی یوں برستی تھی جبیں سے — گلابوں کی جوانی رو رہی تھی
اک ایسا لفظ صدیاں کھو چکیں تھیں — جیسے تازہ بیانی رو رہی تھی
کسی دریا سے وہ بچھڑا تھا شاید — کہ پتھر میں روانی رو رہی تھی
وہ اپنی ذات میں سمٹا کچھ ایسے — اسے اب بے کرانی رو رہی تھی
زمیں کی آنکھ میں ایسا سماں تھا — فضائے آسمانی رو رہی تھی
نظر کی تشنگی بجھتی نہیں تھی — گھٹا ایسی سہانی رو رہی تھی
عدیلؔ اس کے تبسم کے گلوں میں — خزاں کی حکمرانی رو رہی تھی

○

ایم۔ کے۔ بھان تمنا
(جموں، کشمیر)

نظر کا اُس نظر سے چار ہونا — اسے کہتے ہیں شاید پیار ہونا
نہیں گفتار سے کچھ بات بنتی — اگر جینا ہے باکردار ہونا
کٹے کی زندگی یہ بے نشاں پھر — نہ ہرگز سایۂ دیوار ہونا
ہر اک غم بانٹنا سنجیدگی سے — کسی کا ہے اگر غم خوار ہونا
کبھی کرنا نہیں تم جھوٹے وعدے — زمانے میں نہ ہرگز خوار ہونا
نظر انداز کر دیں اہلِ دنیا — کبھی ایسا نہ بادہ خوار ہونا
تمہیں حاصل نہ ہوگا کچھ خاص اُس سے — نہ ہرگز مائل تکرار ہونا
نہیں کوئی بھی فن کی قدر و قیمت — یہاں بے کار ہے فنکار ہونا
تمنّا لازمی ہے زندگی میں — غموں سے برسرِ پیکار ہونا

○

سائرہ بھارتی
(دہلی، بھارت)

تیرگی میں یاد کی شمعیں جلا کر دیکھئے — روشنی میں ہجر کی اک بار آ کر دیکھئے
نفرتوں کی فصل سے تو کچھ نہ حاصل ہو سکا — اب محبت کا کوئی پودا لگا کر دیکھئے
بھوک کہتے ہیں کسے یہ بھی عیاں ہو جائیگا — مفلسوں کی بستیوں کے بیچ جا کر دیکھئے
دیکھنا ہی چاہتے ہیں درد کی گہرائیاں — غم کسی کا اپنے سینے میں بسا کر دیکھئے
گل بدن ہوں نازکی فطرت میں شامل ہے مری — میری جانب دیکھئے تو مسکرا کر دیکھئے
دردِ دل حد سے سوا ہونے لگا ہے سائرہ — میر کی کوئی غزل اب گنگنا کر دیکھئے

○

ارشد جمال

(ممبئی، بھارت)

فضول شرط لگا دی نہ آہ بھرنے کی
یہ نارسائی کی بارش کہاں ٹھہرنے کی

وفا کے نام پہ لب سی لئے مگر نہ تو
ہماری عمر تھی کیا قسط وار مرنے کی

ہماری ناؤ میں سوراخ کرنے والے ہی
دعا بھی دیتے ہیں دریا کے پار اُترنے کی

یہ کہہ کے ٹال گئے ہم شکستہ دل کی بات
صدا تو آتی کوئی ٹوٹنے بکھرنے کی

جمالؔ آنسو نکلتے ہیں اب ہنسی کے ساتھ
اُمید ختم ہوئی اب ترے سُدھرنے کی

○

عطاء الرحمٰن قاضی

(عارف والا)

آنکھوں میں لیے دولتِ بیدار دنوں سے
پھرتے ہیں یونہی شہر میں بیکار دنوں سے

کیا آؤں ترے ہاتھ بھلا موجِ ہوا، تمہیں
خود کو بھی میسر نہیں دو چار دنوں سے

اک آس کہ لوٹ آئیں گے اک روز پرندے
خاموش کھڑے ہیں یونہی اشجار دنوں سے

اس عالمِ نیرنگ میں جاتا ہوں جدھر بھی
پھیلا ہے وہی سامنے اخبار دنوں سے

اے چشمِ رواں! خاک کو گلزار بنا دے
جاری ہے کسی ہجر کا تہوار دنوں سے

کھو جاؤں گا اک روز میں خود میں کہیں جا کر
چھن جائے گا اک روز سب اسرار، دنوں سے

اجڑا ترے جانے سے یہ بازارِ تمنّا
نے خوب ہے کوئی نہ خریدار دنوں سے

کس کام میں الجھا ہوں فراغت نہیں ملتی
کس یاد میں ہوں میں بھی گرفتار دنوں سے

پھرتے ہیں کسی شہرِ ستم گر میں عطاؔ ہم
ہونٹوں پہ سجائے ہوئے انکار دنوں سے

○

سبیلہ انعام صدیقی

(کراچی)

ہیرے کو کیا سنگ جو دنیا کے ستم نے
یہ دل کا تقاضا ہے کہ اپنا لیا ہم نے

برسات میں دو پل وہ مرے پاس تو بیٹھے
احسان بہت مجھ پہ کیا ابرِ کرم نے

وہ بنتے گئے رات کے آنچل پہ ستارے
موتی جو گرائے شبِ غم دیدہ ءِ نم نے

خود کو ہی بُھلا بیٹھے تری یاد میں جاناں
کیا حال کیا دیکھ ترے ہجر و الم نے

مدت سے لگا رکھا ہے سینے میں سجا کر
''پالا ہے ترے غم کو بڑے لاڈ سے ہم نے''

ہر فکر سے آزاد ہوئے بیٹھے ہیں ایسے
جس طرح صدا دی ہو ابھی ملکِ عدم نے

تقلید میں مغرب کی ہے گمراہ زمانہ
برباد کیا سب کو اسی نقشِ قدم نے

اخلاص و محبت کی ہے الفاظ میں خوشبو
برسائے ہیں یہ پھول سبیلہؔ کے قلم نے

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یوایس اے)

قسط.....۱۷

اس کے باوجود کہ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھے کہاں چلنے کو کہہ رہے ہیں اور تلک رام کا کاہے کا سمے آ گیا ہے، میں نے کوئی سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور کہا، چلیں پنچ جی میں تیار ہوں۔ ان میں سے ایک نے اپنے قریب پڑے ہوئے پٹ سن کے بنے ہوئے تھیلے سے ایک کالے رنگ کی چادر اور رسی کے بنے ہوئے جوتوں کا ایک جوڑا مجھے دیتے ہوئے کہا، یہ پہن کر اس دھرتی کا سب کچھ یہیں چھوڑ کر جائیں سرکار۔ ان سے چادر اور جوتے لے کر اپنے کمرے میں آیا۔ اپنے کپڑے اتار کر کالی چادر اوڑھی اور چپل پہن کر کمرے سے باہر نکلنے والا تھا کہ روپا آ پہنچی۔ اس نے اس حالت میں میری جانب حیرت سے دیکھا تو میں نے اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا مجھے کچھ لوگ لینے آئے ہیں۔ میں اپنا سب کچھ اسی کمرے میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری واپسی کب ہوگی۔ پھر اس کا جواب سنے بنا چل پڑا۔ اپنے اس طرح چلے جانے سے اس کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ باہر نکل کر دیکھا تو مجھے لینے والی ٹولی صدر دروازے کے پاس میری منتظر کھڑی تھی۔ میرے آتے ہی وہ لوگ مجھے ساتھ لے کر ایک جانب پیدل چل پڑے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو روپا صدر دروازے سے اداسی کے عالم میں مجھے جوگیوں کے ساتھ جاتا دیکھ رہی تھی۔

رمیش لاج سے مڑ کر ہمارا رخ مندر کی جانب تھا۔ مندر میں ہم پچھلے دروازے سے داخل ہو کر اسی جگہ پہنچے جہاں پر آج صبح تلک رام سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں سے ہال کے بائیں جانب ایک راہداری سے ہوتے ہوئے ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے جہاں اس وقت بیٹھے ہوئے چار سفید پوش رشیوں کی ٹولی ہمیں اندر آتا دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ ان کے بیچ تلک رام ارتھی پر لیٹا بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ میں نے تلک رام کو اس حالت میں دیکھ کر بے تابی سے اس کی ارتھی کے پاس بیٹھ کر اس سے پوچھا، یہ تمہیں کیا ہوا ہے تلک رام جی۔ تمہارے ہاتھاں سے گجر (گزر) جانا چاہتا ہاں سرکاراں، تلک رام نے مجھے دیکھ کر اکھڑی اکھڑی سانس لے کر کہا۔ میں نے بے چینی سے پوچھا، تمہیں جانے کی اتنی جلدی کاہے کی ہے تلک رام جی؟ اگلے جنم میں اس کو دیکھن کی جلدی ہے اور کاہے کی جلدی ہے، تلک رام نے ایسے برجستہ جواب دیا جیسے وہ مجھ سے اس قسم کے بیوقوفانہ سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

تلک رام کی بات میری سمجھ میں اب آئی تھی۔ اس کا پچھلا جنم مناسہ کی آرزو میں گزرا تھا۔ اس جنم میں اس نے مناسہ کی خوشبو سونگھی تھی اور اگلے جنم میں اس نے مناسہ کے درشن کرنے تھے۔ وہ جتنی جلدی اس جنم سے نجات پاتا اس کا اگلا جنم اتنی جلدی شروع ہوتا۔ وہ جنم جس میں اس نے اپنی محبوب مناسہ کے درشن کرنے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ تلک رام کے سینے پر رکھا تو اس نے اپنے قریب پڑی ہوئی ایک گٹھڑی مجھے دیتے ہوئے کہا، تم ہی میری چتا کو آگ دکھانا سرکاراں اور تلک رام کا یہ اثاثہ بھی تلک رام کے ساتھ ہی بھسم کر دینا۔ اور ہاں میری راکھاں کو ناگ بھون میں لے جا کر اڑا دینا۔ پھر اس نے اپنی گٹھڑی سے بین نکال کر مجھے دے کر بجانے کو کہا، تیرے قدماں میں سر رکھ کر اور تیری بین کی تان سنتے ہوئے مرنا چاہتا ہاں سرکاراں۔ وہیں بیٹھ کر میں نے بین بجانا شروع کی تو تلک رام نے اپنا سر میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ میں نے اس کا سر پاؤں سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ کر اس کا ماتھا چوما اور بین کی آواز میں اپنا آپ کھو بیٹھا۔ میں اس وقت تک بین بجاتا رہا جب تک بین ایک جھٹکے سے میرے منہ سے نہیں نکلی اور ماحول مناسہ کی مانوس خوشبو سے معطر نہیں ہوگیا۔ اپنی آنکھیں کھولیں تو تلک رام پر لوک سدھار چکا تھا۔ بین کی آواز کے بند ہوتے ہی سب جوگیوں نے تلک رام کے مردہ جسم کے گرد بالکل ایسے رقص کرنا شروع کر دیا جیسے سیتا رام کے ساتھیوں نے سیتا رام کی لاش اٹھانے کے بعد کیا تھا۔ کافی دیر تک محوِ رقص رہنے کے بعد ساتھی تلک رام کی ارتھی اٹھائے کمرے سے باہر نکلے۔ اس کی چتا پہلے سے تیار کر دی گئی تھی۔ ارتھی کو چتا پر رکھ کر میں نے اس کی گٹھڑی اور بین چتا پر رکھ دی اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ دکھا دی۔

تلک رام کی جلتی ہوئی چتا دیکھ کر مجھے پچھلے دو ہفتوں کے دوران تین دیوانوں کی اموات یاد آئیں۔ ان میں سب سے پہلا عاشق مناسہ کی دید کا پیاسا سیتا رام تھا۔ دوسری موت میری قربت کی شیدائی رمپا کی واقع ہوئی تھی اور تیسری موت مناسہ کی خوشبو کے دیوانے تلک رام کی ہوئی تھی۔ ان میں ہر ایک اپنی لگن کا پکا اور اپنے جنون کا کھرا تھا۔ سیتا رام اور تلک رام کی آشائیں میرے کارن پوری ہوئی تھیں اور اس کے بعد جیسے انہیں اپنے جانے کا علم ہوگیا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ سیتا رام اگلا جنم کس کی دید کے سہارے گزارے گا۔ مجھے رمپا کے بارے میں بھی علم نہیں تھا کہ وہ اگلے جنم میں کس روپ میں آئے گی۔ اگر میں بھگوان ہوتا تو رمپا کو اگلے جنم میں کالی کا روپ دے کر اس دھرتی پر بھیجتا۔ تلک رام کو اپنے اگلے جنم کا شدت سے انتظار تھا۔ اگلے جنم میں اسے مناسہ کی ایک لمحے کی جھلک کی قیمت کئی دہائیوں کی تپسیا کر کے دینا ہوگی۔ سچ کہتے ہیں کہ عاشق کر گزرتے ہیں اور عاقل حیران کھڑے کرنے یا نہ کرنے کی تاویلیں سوچتے رہتے ہیں۔ میرا شمار نہ دیوانوں میں کیا جا سکتا ہے اور نہ عاقلوں میں۔ میں ہمہ وقت کسی کو اپنانے یا چھوڑنے کے فیصلے کے نشیب و فراز پر غور کرتا رہتا ہوں۔ کبھی اپنے پلڑے میں ایک تصویر رکھتا ہوں اور کبھی دوسری۔ میرے چرن دھو کر پینے والوں کو شاید یہ علم نہیں کہ ان کے چرن دھو کر پیے جانے کے لائق ہیں۔

تینوں اموات کا کسی نہ کسی طرح مجھ سے تعلق بنتا تھا۔ کیا تعلق؟ آخر میرے توسط سے یہ سب کچھ کیوں کرایا جارہا ہے؟ میری حقیقت اور میری حیثیت کیا ہے؟ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک پیغام رساں ہوں جس کی اپنی کوئی پہچان نہیں ہے۔ میرا کام مناسہ اور اس کے چاہنے والوں کے درمیان رابطہ قائم رکھنے کا ہے۔ میں وہ ڈاکیا ہوں جس کو محبّ اور محبوب اپنی جدائی کے دنوں میں کچھ وقت کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ملاپ کے بعد اسے بھول جاتے ہیں۔ ہاں بالکل ایسا ہی ہے۔ سیتا رام نے مناسہ کو میرے ہاتھوں سندیسہ بھجوایا تھا۔ پھر تلک رام نے بھی یہی کیا تھا۔ اتنے مہمانوں کو اپنے پاؤں کی دھودھن پیتے دیکھ کر نہ جانے میں نے خود کو کیا سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ حقیقت میں میں ایک ایسا بچہ ہوں جس کے ہاتھوں محبوب کو پیغام بھجوانے والا عاشق اس کے پاؤں تک پکڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اس بچے کو کوئی شے سمجھتا ہے۔ وہ تو بس اس سے اپنا کام نکلواتا ہے۔ جیسے کسی منی آرڈر لانے والے ڈاکیے کو اگلی بار کے منی آرڈر جلد پہنچانے کی آرزو میں ایک دو روپے بطور ٹپ دی جاتی ہے۔ ویسے ہی یہ دیوی، دیوتا اور مہمان لوگ مجھے استعمال کر رہے ہیں اور میں ہوں کہ نہ جانے خود کو کیا سمجھ بیٹھا ہوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میں مناسہ سے کہہ سکتا ہوں میں کوئی کٹھ پتلی نہیں ہوں گوشت پوست کا ایک انسان ہوں جس کے اپنے جذبات ہیں، اپنے احساسات ہیں اور اپنے خیالات ہیں۔ تم جوگیوں اور بھکشوں کو سندیسے بھجوانے کا کوئی اور انتظام کرو۔ مجھ سے تمہاری دلالی نہیں ہوتی؟ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا۔ اور کیا میں منتریوں سے کہہ سکتا ہوں کہ بڑے میاں تم مناسہ کے سندیسے بھجوانے کا اپنا کوئی اور بندوبست کرو؟ نہ میں کسی سے اپنے چرن چھووانا چاہتا ہوں اور نہ کسی کو اپنے پاؤں کی دھودھن پلانا چاہتا ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے ایک عام سے آدمی کی طرح زندہ رہنے دو۔ ایک جھونپڑی میں پل بڑھ کر میں نے جنگلی پھل اور سبزیاں کھا کر کبھی محلوں میں رہنے کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ نہ مجھے اپنی غربت کا کوئی ملال تھا اور نہ ہی کبھی میں نے خود کو ایک سپیرے کے علاوہ کچھ اور سمجھا تھا۔ میں نے تو سکول جانے کا خواب تک نہیں دیکھا تھا۔ پھر یہ سب کیا ہے اور مجھ سے کیوں کروایا جارہا ہے؟ میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ میرا سر چکرانے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری حقیقت اور حیثیت کیا ہے اور میں کون ہوں؟ میں نے آخر دیوتاؤں کا کیا بگاڑا ہے کہ انہوں نے مجھ سے ایک عام انسان کا جیون چھین کر ایک ایسے جیون میں دھکیل دیا ہے جہاں کا اونٹ ہر لحہ کسی نئی کروٹ بیٹھا ہے۔ جہاں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوتا اور جہاں سانس تک دوسروں کی اجازت سے لی جاتی ہے۔ آج مجھے احساس ہوا تھا کہ فطرت نے انسان کو ازل سے بے بسی کا لباس پہنا کر پیدا کیا ہے اور ہم فطرت کی ایسی کٹھ پتلیاں ہیں جو خود کو آزاد سمجھتے ہوئے بھی آزادی سے محروم ہیں۔ ہمیں اپنی مرضی سے کچھ کہنے، کچھ سننے اور کچھ سہنے کی کوئی آزادی نہیں۔ ہم جو مانگتے ہیں نہیں ملتا، جو کہتے ہیں نہیں سنا جاتا اور جو کرنا چاہتے ہیں نہیں ہوتا۔ اور ہوتا وہی ہے جو فطرت ہم سے کرواتی ہے۔ ہم فطرت کا کہلوایا کہتے ہیں اور فطرت کا شنوایا سنتے ہیں۔ باقیوں کی طرح میں بھی دیوی دیوتاؤں کی ان دیکھی رسیوں سے کچھ یوں جکڑا ہوں کہ کسی کروٹ خلاصی نہیں دِکھتی۔ میں کہ ایک تنکا ہوں، ایک ایسا تنکا جسے دریا کے تندریلے کسی انجانی سمت بہائے جارہا ہیں۔

تلک رام کی راکھ سرد ہو چکی ہے بڑی سرکاراں؟ مجھے پنکج کی آواز نے خیالات کی دنیا سے واپس لا کر مندر میں تلک رام کی سرد ہوتی ہوئی چتا کے سامنے پٹخ دیا تھا۔ سوچ کے دھارے میں بہہ کر میں یہ تک بھول گیا تھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ اندر کا اٹھتا ہوا طوفان اپنے اندر دبا کر میں کھڑا ہو گیا اور تلک رام کی راکھ سے کچھ اپنے ساتھ ناگ بھون پہنچانے کے لیے ایک چھوٹی سی بوتل میں ڈال کر میں نے باقی راکھ کو سمیٹنے کے لیے کہا تو راکھ میں مجھے چنبیلی کے پھولوں کی ویسی ہی مالا ملی جیسی مجھے مناسہ نے پرکاش بھون میں دی تھی۔ جو اس بات کی دلیل تھی کہ مناسہ نے تلک رام کو اگلے جنم میں اپنی دید کی نوید دی تھی۔ میں نے مالا اٹھا کر پنکج کو دیتے ہوئے کہا۔ اس مالا کے پھول یہاں پر موجود لوگوں میں ایک ایک کر کے بانٹ دو۔ اس نے ویسا ہی کیا۔ ایسے میں میں نے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ سورج کی پو مشرق سے پھٹ کر نئی صبح کا اعلان کر رہی تھی۔ یعنی میں تمام رات سوچوں کے گنجان سمندر میں اتنا ڈوبا رہا کہ مجھے سورج نکلنے کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔

ایسے میں پنکج نے کہا، بڑی سرکاراں، چلیں ہم آپ کو رمیش لاج چھوڑ آتے ہیں اور میں ان کے ساتھ ایک بار پھر چل پڑا۔ چلتے وقت میرا راکھ زدہ چہرہ کسی کٹھ پتلی کی طرح بے جان اور جذبات سے عاری تھا۔ میری حالت فلم کے اس ہیرو کی سی تھی جو کہانی کے شروع ہوتے ہی خود کو واقعی ہیرو سمجھ بیٹھا تھا۔ فلم کی کہانی ختم ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو صرف کہانی کا ایک کردار تھا اور حقیقی دنیا میں اس کی حیثیت ایک عام سے انسان کی سی تھی۔ ہم چلتے ہوئے ایک بار پھر رمیش لاج پہنچے۔ مجھے یہاں چھوڑ کر پنکج میرے ہاتھ پر مناسہ کی مہر کو بوسہ دینے کے بعد اپنے چیلوں کے ساتھ واپس چلا گیا اور میں نے اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دھڑام سے خود کو گرا دیا۔ میری آنکھ دوپہر کے وقت روپا کی آمد سے کھلی۔ میں ابھی تک پنکج کی دی ہوئی کالی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے میری حالت دیکھی تو پریشانی سے بولی، میں تمہاری وجہ سے پریشانی کے باعث رات بھر نہیں سو سکی۔ صبح تمہیں سوتا دیکھا تو کچھ ڈھاس بندھی۔ صبح سے اب تک تمہارے کمرے کے کئی پھیرے لگا چکی ہوں۔ یہ تمہیں کیا ہوا ہے رامو جی، اور یہ لوگ تمہیں کہاں لے گئے تھے؟ تمہاری آنکھیں کیوں سوجھی ہوئی ہیں؟ تمہارا چہرہ اور تمہارا جسم راکھ سے کیوں اٹا ہے؟ روپا نے اتنے سارے سوال ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔

میں نے اداسی سے جواب دیا، تلک رام چلا گیا ہے۔ وہ لوگ مجھے مندر میں اس کی چتا کو آگ دکھانے لے گئے تھے۔ اچھا تم پہلے نہا کر کچھ کھالو اور پھر چاہے سو جانا، روپا نے بڑے پیار سے میرا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ہاں میں نہانا ضرور پسند کروں گا۔ لیکن اس کے بعد شاید سو نہ سکوں، یہ کہتے ہوئے میں اپنے کپڑے لے کر غسل خانے میں جا گھسا۔ نہانے، شیو کرنے اور کپڑے بدلنے کے بعد باہر نکلا تو روپا ہنس کر بولی، یہ ہوئی نا بات۔ اب تم اچھے لگ رہے ہو۔ کھانا حاضر ہے اس نے پاس پڑے ہوئے میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ چلو اب کسی اچھے بچے کی طرح کچھ کھالو۔ مجھے اس کے انداز پر ہنسی آ گئی اور میں نے پوچھا، یہ کھانا تم نے کب منگوایا تھا؟ جب تم نہا رہے تھے، روپا بولی۔ کھانا دیکھ کر مجھے واقعی بھوک محسوس ہوئی۔ میں کھاتا رہا اور روپا میرے سامنے بیٹھی رہی۔ تم بھی کچھ کھالو۔ میں نے کہا تو وہ بولی، میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہی تمہارے پاس آئی تھی یہاں تو بس تمہارے نوالے گننے کے لیے بیٹھی ہوں۔ اچھا تو پھر بتاؤ کہ اب تک میں نے کتنے نوالے کھائے ہیں؟ میں نے مسکرا کر پوچھا۔ اچھے خاصے کھالیے ہیں، اس نے ہنس کر برجستہ جواب دیا۔

کھانے کے بعد روپا بولی، چلو ماتا جی کے پاس چلتے ہیں وہ تمہیں پوچھ رہی تھیں۔ کل جب میں نے انہیں بتایا کہ جوگی لوگ تمہیں کسی نامعلوم جگہ لے گئے ہیں تو وہ کافی پریشان ہوگئی تھیں۔ چلو، میں اٹھتا ہوا بولا۔ ہم دونوں برآمدے سے گزر کر رمیش لاج کے پچھلے باغ میں پہنچے جہاں باپ بیٹی بیٹھے تھے۔ راجہ رمیش آج بھی پہیوں والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ساتھ والی کرسی پر ماتا جی تھیں۔ میں اور روپا ان کے قریب پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی میں نے انہیں بتایا تلک رام گزر گیا ہے۔ میں رات بھر مندر میں تلک رام کی چتا کے پاس بیٹھا تھا۔ پھر میں نے رمیش جی سے کہا، اب آپ کے گھر سانپ نہیں آئیں گے۔ انہوں نے خوش ہو کر میرا شکریہ ادا کیا۔ نہ انہوں نے پوچھا کہ میں نے کون سا ایسا ٹونا کیا ہے جس کے سبب اس گھر میں سانپ آنا اچانک بند ہو جائیں گے اور نہ ہی مجھے بات بنانے کے لیے کسی جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ موقع جان کر میں نے کہا، اب چونکہ میرا یہاں پر کام ختم ہو گیا ہے اس لیے وہ مجھے ہندوستان واپس جانے کی آ گیا دیں۔ کسی اور کے جواب دینے سے پہلے روپا فیصلہ کن لہجے میں بولی، واہ اتنی جلدی۔ ابھی تو تمہیں یہاں آئے ہوئے دو دن ہوئے ہیں۔ سکول کی چھٹیاں ہیں اور پھر تم نے وہاں جا کر کرنا بھی کیا ہے؟ اب تم ہمارے ساتھ ہی ہندوستان واپس جاؤ گے اور ہم اگلے مہینے واپس جا رہے ہیں۔ رمیش اپنی نواسی کی تائید میں کہنے لگے، بھئی جب تک ہماری نواسی نہیں چاہے گی تم واپس نہیں جا سکتے۔ میں نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور یہ بھی سچ تھا کہ مجھے ہندوستان میں کچھ نہیں کرنا تھا۔ نیتو مصر میں تھی اور باپو کی جانب سے مجھے اطمینان تھا۔

ایسے میں ایک نوکر نے اطلاع دی کہ دربار سنگھ اپنے پریوار کے ساتھ ملنے آئے ہیں۔ مہاراج سے پہلے رانی پارو جی نے کہا، انہیں یہاں لے آؤ۔ چند منٹ بعد نوکر کی معیت میں چار افراد پر مشتمل ایک کنبہ آتا دکھائی دیا۔ سب سے آگے ایک درمیانی عمر کے کلین کٹ مرد تھے۔ اس کے ساتھ غالباً ان کی پتنی اور دو جڑواں بیٹیاں تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے مہاراج کو ست سریا کہا۔ پھر انہوں نے ماتا جی سے پوچھا، آپ کب آئیں بھرجائی جی؟ رانی جی نے جواب دیا، کچھ روز ہوئے ہیں۔ ہماری بیلی کو بھی اپنے سنگ لانا تھا، دربار سنگھ نے کہا۔ آپ کو تو معلوم ہے وہ لمبے سفر سے کتراتے ہیں رانی جی نے جواب دیا۔ ان کو گوبیندر کی ہوا لگ گئی ہے وہ بھی گوبیندر کی طرح سفر سے کترانے لگ گئے ہیں۔ میں نے انہیں کتنی بار سمجھایا تھا کہ گوبیندر کی صحبت سے دور رہو، لیکن وہ میری ایک نہیں سنتے، انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس بات پر سب ہنس پڑے۔ پھر انہوں نے روپا کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا، تو اپنی ماتا کی طرح سندر ہے، روپا۔ اس کے بعد وہ میری جانب بڑھے اور مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولے، یاد نہیں پڑتا میں نے تمہیں پہلے کہاں دیکھا ہے پر تمہیں کہیں دیکھا ضرور ہے۔ رانی پارو بیچ میں بولیں۔ یہ اپنا رامو ہے۔ آپ اسے گوبیندر جی کے ہاں ملے تھے۔ گوبیندر جی کے ہاں سے جیسے انہیں سب کچھ یاد آیا۔ ان کی آنکھوں کی چمک کچھ اور سوا ہو گئی۔ انہوں نے مجھے جذباتی انداز میں کہا، اوے ہاں۔ اب اچھی طرح یاد آیا۔ انہوں نے اپنی طرف ملانے کے لیے بڑھے ہوئے میرے ہاتھ کو نظر انداز کر کے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ اوے تجھے تو جپھی ڈال کر (گلے لگا کر) ملنا ہے۔ پھر وہ اپنی بیگم سے میرا تعارف کرتا ہوا بولا، شیلا جی، یہ وہی مُنڈا ہے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ گوبیندر جی اسے سانپوں کا گرو سمجھتے ہیں۔ بڑے بڑے اژدہا اس کی انگلی کے اشارے پر ناچتے ہیں۔ پھر اس نے بلبیر والا واقعہ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہوئے آخر میں چٹکی بجاتے ہوئے کہا، اس منڈے نے گوبیندر جی کے دوتے (نواسے) بلبیر کو اژدہا کی جکڑ سے ایک چٹکی میں چھڑا دیا تھا۔ پھر اپنی جڑواں لڑکیوں کا تعارف مجھ سے کراتے ہوئے بولا، یہ میری کمیلا اور رسیلا ہیں۔ دسویں میں پڑھتی ہیں، اور بڑی ہشیار ہیں۔ میں نے جب ان کو بلبیر والا واقعہ بتایا تو انہیں بڑی مشکل سے یقین آیا۔ تم ذرا انہیں بتاؤ کہ تم نے اس موذی کو کیسے پچھاڑا تھا؟ اس تعارف کے دوران دونوں بہنیں میرے اتنے قریب آ گئیں کہ مجھے سانس لینا بھی دشوار ہونے لگا اور اوپر سے دربار جی مجھے مسلسل گلے لگائے ہوئے تھا۔ پھر مجھ سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولا، اس مُنڈے کو تو میں آج یہاں سے جاتے ہوئے اپنے سنگ لے جاؤں گا۔ پھر رانی جی سے کہنے لگا، بھرجائی آپ اسے چند دنوں کے لیے ہمارے گھر جانے کی آ گیا دیں۔ کیوں نہیں بھائی صاب۔ آپ جب چاہیں رامو کو اپنے ساتھ لے جائیں، ماتا جی نے کہا۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے روپا اپنی کرسی سے اچانک کھڑی ہو کر مہمانوں سے بولی، آپ پدھاریے، ہم لوگ ابھی نکلنے والے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرا بازو پکڑا اور مجھے تقریباً گھسیٹتی ہوئی وہاں سے نکال لائی۔ روپا کے ساتھ کہیں جانے کی خبر میرے لیے نئی تھی۔ اس کے باوجود میں روپا کے

ساتھ باہر نکلنے لگا تو پیچھے سے دربار جی کی آواز آئی، میرے گھر ضرور آنا کا کا۔ جی اچھا، میں نے جواب دیا۔ ایک تو روپا نے اچانک کہیں جانے کا پروگرام بنایا تھا اور دوسرا وہ مجھے اپنے ساتھ چمٹائے ہوئے اور کھینچتے ہوئے اپنے نانا اور ماتا کے علاوہ مہمانوں کی موجودگی میں وہاں سے نکلی تھی۔ میرے لیے اس کا رویہ نہ صرف عجیب تھا بلکہ حیران کن بھی تھی۔ میرے پچھلے تجربے کے مطابق روپا کافی سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس نے اب تک اپنے گھر والوں کی موجودگی میں اپنے اور میرے درمیان مناسب فاصلہ رکھا تھا۔ مجھے کچھ اچھنبا ہوا لیکن میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔

برآمدے کا موڑ مڑ کر ہم ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو روپا کی جانب دیکھ کر مجھے مزید حیرت ہوئی کیونکہ اس کا چہرہ غصے سے لال انگارہ ہو رہا تھا۔ اس کے گورے ہاتھ اور لال ہونٹ غصے سے بُری طرح کانپ رہے تھے۔ میں نے سمجھ نہ آنے والے لہجے میں پوچھا، یہ تمہیں اچانک کیا ہوا ہے روپی، تم اچھی تو ہو؟ لیکن ایک تو غصے کی وجہ سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی اور دوسرا وہ مسلسل کانپے جا رہی تھی۔ میرا کمرہ وہاں سے قریب تھا اس لیے میں اسے اپنے کمرے میں لایا۔ دروازہ پیچھے سے بند کر کے اسے کرسی پر بٹھا کر قریب پڑے ہوئے جگ سے ایک گلاس میں پانی انڈیل کر اسے اپنے ہاتھوں سے چند گھونٹ پلوائے۔ مجھے ابھی تک اس کے اس غیر معمولی ردِعمل کی وجہ معلوم نہیں تھی۔ اس کی کرسی کے سامنے زمین پر اپنے دونوں پاؤں پر بیٹھ کر میں نے اس کے گال ہلکے سے تھپتھپاتے ہوئے پوچھا، کیا بات ہے روپی۔ یہ تمہیں اچانک کیا ہوا ہے، مجھے بھی تو کچھ بتاؤ؟ وہ۔ وہ غصے کی وجہ سے روپا کے منہ سے وہ کے علاوہ کوئی اور لفظ نہیں نکلا تھا۔

پھر شرارت کے طور پر جگ سے تھوڑا سا پانی اپنے ہاتھوں میں ڈال کر اس کے چہرے پر چھڑکا۔ اس شرارت کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کے چہرے پر غصے کی سرخی کچھ ماند پڑی لیکن وہ مسکرائی نہیں۔ پھر وہ بدستور غصے کی حالت میں بولی، وہ لڑکیاں تمہیں گھور گھور کر ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے بلیاں گوشت کو۔ میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کچا چبا جاؤں اور ان کی آنکھیں نوچ کر ان کے ہاتھوں میں پکڑا دوں۔ کونسی بلیاں؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ وہ میلی اور کچیلی۔ اس نے کمیلا اور رسیلا کا نام بگاڑتے ہوئے کہا۔ میرا دھیان انکی جانب نہیں گیا تھا، میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ہاں وہ تو میں نے دیکھا تھا کہ تم نے ان پر ایک نظرِ غلط بھی نہیں ڈالی تھی۔ اسی لیے تو میں تمہیں وہاں سے نکال کر لے آئی ہوں۔ اور تم ان کے گھر بھی نہیں جانا، اچھا۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں حکم صادر کیا۔

روپا کا ردِعمل مجھے کئی ان کہے پیغام دے رہا تھا۔ ایک تو یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہے اور دوسرا یہ کہ وہ کسی کو میرے قریب برداشت نہیں کر پائے گی۔ مجھے رمپا نے نیتو کے من کا حال بتا دیا تھا اور اگر روپا ایک روز پہلے یہاں آ کر نیتو سے ملاقات کر لیتی تو دونوں کے درمیان کہیں سے میرا ذکر آ نکلتا تو بات خطرناک حد تک بڑھنے کا اندیشہ تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ دونوں کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ چونکہ ابھی تک میں نے دونوں میں سے کسی کو اپنے اندرونی جذبات سے آگاہ نہیں کیا تھا اس لیے مجھے کسی فکر کی ضرورت نہیں تھی۔

اس کے باوجود روپا کے رویے نے مجھے سوچ کے ایک ایسے دوراہے پر لا کر کھڑا کیا تھا جہاں سے مجھے اپنے لیے ایک راہ کو چننا تھا۔ جہاں تک روپا کے والدین کا تعلق تھا تو مجھے یقین تھا کہ وہ لاکھ مجھے اپنے پریوار کا حصہ سمجھیں ان کی نگاہوں میں میری حیثیت کسی سپیرے سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ کبھی بھی نہیں چاہیں گے کہ ان کی اولاد اور راجہ مان سنگھ جیسا اعلیٰ خاندانی خون ایک معمولی سپیرے کے بستر کی زینت بنے۔ اس سپیرے کی زینت، جس کا خاندانی شجرہ تو کیا ہوتا جس کو اپنے والدین تک کا پتہ نہیں تھا۔ جسے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ کس نے اس کی صورت میں اپنی گندگی جنم دے کر دنیا کی نگاہوں سے سندر بن کے گھنے جنگلات میں پھینک کر چھپانے کی کوشش کی تھی۔ روپا کے برعکس نیتو کے والدین کے بارے میں مجھے رمپا کے توسط سے معلوم تھا کہ انہیں مجھے اپنانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میرے خیال میں روپا کا یہ ردِعمل اس کی جذباتی کیفیت کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا۔ اگر وہ بھی میرے طرح ان تمام عوامل پر اچھی طرح غور کرتی اور ان کے دوررس نتائج پر دھیان دیتی تو اس کا ردِعمل جدا ہوتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں روپا کو اس شدید جذباتی جھٹکے سے کیسے نکالوں۔

عقل کا تقاضہ تھا کہ میں ابھی کسی راہ پر چلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے ساتھ پیش آنے والے حوادث اس بات کے متقاضی تھے کہ میرے جیون کا ریلا ایک غیر متعین راہ پر اور ایک انجانے رخ کی جانب گامزن تھا۔ کیا معلوم کل کلاں یہ ریلا مجھے کسی ایسی جگہ لے جائے جہاں سے خلاصی ممکن ہی نہ ہو۔ یہ حوادث بار بار مجھے یاددہانی کرا رہے تھے کہ میں ابھی تک اپنی پہنچان بھی نہیں کر پایا تھا۔ کسی سے پہچان بڑھانے سے پہلے مجھے اپنی پہچان کرنی چاہیے۔ مجھے ابھی کسی جانب جانے یا کسی جانب اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تو میں اپنا بوجھ سہنے کے نا قابل ہوں کسی اور کا بوجھ اپنے کندھوں پر کیسے سہوں گا؟

تم اچانک کن سوچوں میں گم ہو گئے ہو؟ روپا نے میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے اپنی جانب اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔ روپا کی آواز نے مجھے خیالات سے باہر نکالا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں ابھی تک روپا کی کرسی کے سامنے فرش پر اپنے پیروں پر بیٹھا تھا اور میرے ہاتھ ابھی تک اس کے گلا سہلا رہے تھے۔ ایک بات اچھی ہوئی کہ میری سوچوں کے دوران اس نے اپنے غصے پر خاصا قابو پا لیا تھا۔ میں تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا روپی، میں نے جواب دیا۔ اچھا تو مجھے بتاؤ کہ تم میرے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟ اس نے شوخی سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اشتیاق سے پوچھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمہارا من بھی تمہاری صورت کی طرح اجلا اور معصوم ہے، میں نے کہا۔ وہ کرسی سے نیچے اتر کر میرے سامنے فرش پر اپنے پاؤں پر ایسے بیٹھی کہ اس کا گال میرے گال کو چھونے

لگا اور اس کے دل کی دھڑکن مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگی تو اس نے تیز سانسوں کے درمیان پوچھا، اچھا بتاؤ میرے بارے میں اور کیا سوچ رہے تھے؟ اب وہ میرے اس قدر قریب ہوگئی کہ اس کے ہونٹوں کی آواز میرے ہونٹوں نے سنی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ۔۔۔ میری آواز دروازے پر اچانک دستک سے رک گئی۔

ہم دونوں کھڑے ہو گئے، روپا واپس کرسی پر بیٹھ گئی اور میں نے دروازے کے قریب جا کر کہا، اندر آ جاؤ۔ دروازہ بند نہیں ہے۔ دروازہ کھلا تو سامنے ایک نوکر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے کہا، رامو بابو، مندر سے پنچ جی آپ سے ملنے آئے ہیں۔ اچھا تم چل کر انہیں بٹھاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔ اسے جواب دے کر میں نے روپا کی جانب دیکھ کر کہا، تم جا کر آرام کرو، میں انہیں دیکھتا ہوں۔ وہ بولی، نہیں میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ دونوں بلیاں ابھی یہاں ہیں۔ میں انہیں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ اچھا تو پھر تم اپنے کمرے میں چلو۔ ان لوگوں سے فارغ ہو کر میں بھی سیدھا وہیں آ جاؤں گا، میں نے کہا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اگر وہ لوگ تمہیں کہیں لے جانا چاہیں تو مجھے آ کر بتا دینا اور واپس باہر ان بلیوں کے پاس بھی نہ جانا۔ روپا مجھے نصیحت کرنے کے بعد اپنے کمرے کی جانب روانہ ہوئی اور میں بیٹھک کی جانب چل پڑا۔ بیٹھک میں پنچ کے ساتھ ادھیڑ عمر کا ایک خوبرو جوڑا بیٹھا تھا۔ دراز قد، پتلی جسامت اور کھلتی رنگت پر سفید اور بھورے بالوں والے ایک پختہ عمر کے مرد نے بیش قیمت سوٹ پہنا تھا۔ اس کے ساتھ شفاف رنگت کی دراز قد عورت تھی۔ جس کا قد اپنے میاں کے برابر تھا۔ عورت نے نیلے کشمیری کام والی کالی ساڑھی اور اسی طرح کا قیمتی بلاؤز پہنا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر دونوں نے حیرانی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔ ان کی حیرانی دیکھ کر اندازہ ہوا جیسے وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے یا انہوں نے مجھے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ لیکن وہ دونوں چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔ ان کی پنچ کی اردلی میں آمد اس بات کی دلیل تھی کہ وہ پہلے مندر گئے تھے یا انہوں نے مجھے پنچ کے ساتھ مندر میں دیکھا تھا اور اب پنچ کو اپنے ساتھ کسی سفارش کے لیے لائے تھے۔ پنچ نے کھڑے ہو کر دونوں کے سامنے میرے ہاتھ پر مناسبہ کی مہر کا بوسہ دینے اور میرے چرن چھونے کے بعد کہا، بڑی سرکاراں، یہ لوگاں بڑی دور سے آپ کو ملن کے واسطے آوت ہیں اور یہ مندر میں آن کر آپ کا پوچھت تھے۔ یہ کہہ کر پنچ ہاتھ جوڑ کر جاتے ہوئے کہنے لگا۔ میں چلتا ہوں بڑی سرکاراں۔

پنچ کے جانے کے بعد ہم تینوں تنہا رہ گئے تو میں نے جوڑے کی جانب رخ کر کے کہا، آپ لوگ تشریف رکھیں۔ وہ دونوں صوفے پر بیٹھے تو ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، جی فرمایئے میں آپ کی کیا سیوا کروں؟ رامو صاب میرا نام اکرام خان ہے اور یہ میری بیگم نیلم ہے۔ اکرام کا پشتو لہجے میں اردو بولنا اس کے پٹھان ہونے کی چغلی کھا رہا تھا اور اس کی گھمبیر آواز اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کر رہی تھی۔ جس انداز سے اکرام نے میرا نام لیا تھا ایسے لگتا تھا جیسے وہ نہ صرف میرے نام بلکہ مجھ سے بھی بڑی اچھی طرح واقف ہے۔ ان کے مسلمان نام اس بات کی دلیل تھے کہ انہوں نے مجھے مندر میں یقیناً نہیں دیکھا ہوگا۔ لیکن بعض مسلمان مندروں میں اور بعض ہندو مساجد میں جاتے ہیں۔ جیسے رمپا نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے مندروں، درگاہوں اور مسجدوں میں میری ملن کی آشا کے دیپ جلائے تھے۔ پنچ بتا رہا تھا کہ یہ لوگ مندر میں مجھے پوچھ رہے تھے۔ اگر انہوں نے مجھے مندر میں نہیں دیکھا تھا تو بھی میرا چہرہ ان کے لیے یقیناً اجنبی نہیں تھا۔ قیاس کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے میں نے ان کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھا۔

ہندوستان میں آپ کا کہاں سے تعلق ہے؟ نیلم نے بیٹھتے ہوئے بڑی سریلی آواز سے پوچھا۔ میں ہندوستان میں کلکتہ کے قریب سندر بن کے علاقے کا رہنے والا ہوں۔ اور آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟ میں نے پوچھا۔ میرا تعلق ویسے تو پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک قبائلی علاقے سے ہے۔ لیکن ہمیں افریقا میں رہتے ہوئے عرصہ ہوا ہے۔ میرے میاں، نیلم نے اپنے شوہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، جوہانس برگ میں ماہرِ امراضِ قلب ہیں اور میں بھی بچوں کی سرجن ہوں۔ آپ ہندوستان سے کب آئے؟ اس بار اکرام نے پوچھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے ہیں، میں نے جواب دیا۔ آپ کا سفر کیسے کٹا؟ اکرام نے پوچھا۔ الحمدوللہ، اچھا کٹا۔ میں نے ان کے مسلمان ناموں کے پیشِ نظر جان کر الحمدوللہ کہا تھا۔

میرے الحمدوللہ کہنے پر دونوں نے ایک دوسرے کو ایسے دیکھا جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ آیا یہ لڑکا مسلمان ہے یا نہیں۔ آپ میرے بزرگوں جیسے ہیں اس لیے مجھے آپ کی بجائے تم کہہ کر مخاطب کریں تو مجھے خوشی ہو گی، میں نے مسکرا کر کہا۔ میرے اس اندازِ تخاطب سے دونوں کچھ ڈھیلے ہو کر بیٹھ گئے۔ تعارف کا مرحلہ طے ہوا تو میں نے پوچھا، آپ نے کیسے زحمت فرمائی؟ ہمیں آپ سے ایک ضروری کام ہے، اکرام نے کہا۔ جی فرمایئے، میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟ میں نے دونوں کو دیکھ کر پوچھا تو نیلم نے جواب دیا، بات خاصی لمبی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کہاں سے شروع کروں۔ میں نے مسکرا کر گرہ لگائی، ہر بات ہمیشہ بسم اللہ سے شروع کریں۔ میرے جواب پر دونوں مسکرا دیئے۔ اکرام نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا، بات دراصل یہ ہے کہ پچھلے دو سال سے ہمارا کنبہ افریقا میں سانپوں سے متعلق ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہے۔ نیلم نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، یہ دو سال سے اوپر کی بات ہے، ہم نے جوہانس برگ سے پچاس کلومیٹر جنوب میں سوبیتو نامی ایک چھوٹے لیکن خوبصورت مقام پر ایک گھر لیا تھا۔ گھر کی زمین ایک ایکڑ سے کچھ زیادہ تھی۔ ہمارے خریدنے سے پہلے وہ گھر کافی عرصے سے خالی پڑا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے پچھلے باغیچے کو خودرو پودوں کے علاوہ کئی جنگلی جانوروں نے اپنا مستقل مسکن بنا

لیا تھا۔ گھر خریدنے کے بعد ہم نے پچھلے باغیچے کی صفائی کروائی۔ صفائی کے دوران کئی اقسام کے جانوروں اور خودرو پودوں کا صفایا کروادیا تھا۔ جن میں ایک کالی Black Momba ناگن بھی اپنے انڈوں اور بچوں کے ساتھ تھی۔ اس واقعے کے ایک ہفتہ بعد سے ہماری مصیبت کا آغاز ہوا جب ہماری اس وقت آٹھ سالہ بیٹی شاہینہ پر شام کا اندھیرا چھاتے ہی جیسے مرگی کا پہلا دورہ پڑا۔ ہم لوگ اسے اسی وقت ہسپتال لے گئے۔ جہاں کسی دوا سے اسے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ وہ ساری رات اسی حالت میں رہی لیکن صبح کا سورج نکلتے ہی وہ بالکل ٹھیک ہوگئی۔ اس روز سے یہ دورے ہر رات کو سورج غروب ہونے پر پڑتے ہیں اور سورج طلوع ہونے پر ختم ہوجاتے ہیں۔ وہ صبح بالکل ایک نارمل بچے کی طرح اٹھتی ہیں، سکول جاتی ہے۔ دن کے وقت اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے رات کو کسی قسم کا کوئی دورہ پڑتا ہے۔ سکول میں ہر امتحان پاس کرتی ہے۔ اس کی بہت سی سہیلیاں ہیں۔ اسے جانور پسند ہیں، وہ بڑی ہو کر جانوروں کی ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔ بڑی ہنس مکھ بچی ہے اس کا سارا دن ایک عام بچے جیسا گزرتا ہے۔ اندھیرا چھاتے ہی اس پر وہ مصیبت دوبارہ آجاتی ہے۔ والدین ہونے کے ناطے ہم نے اس کا علاج کروانے کی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس کا ہر قسم کا چیک اپ کرایا۔ ہر چیک اپ معتدل ہے اور اس کے دماغ میں مرگی یا کسی اور بیماری کے کوئی آثار نہیں ہیں۔

ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے ہماری معلومات کے مطابق میڈیکل کی تاریخ میں کوئی ایسی بیماری نہیں ہے جو غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک لگتی ہے اور دن کی روشنی میں اس کا کوئی نام ونشان تک جسم میں نہیں ملتا۔ بیمار جسم میں کسی بھی بیماری کے اثرات چوبیس گھنٹے رہتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ ان کی شدت میں وقت کے ساتھ ساتھ کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ شاہینہ کا مسئلہ اس کے برعکس ہے۔ چھ ماہ تک مسلسل ہسپتالوں کے چکر لگا کر ہم تھک ہار گئے تو دیسی ٹوٹکوں پر آئے جن سے کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ نئے گھر میں کسی قسم کی بدروح، جن یا پری کا آسیب تھا جو رات ہوتے ہی کسی نامعلوم وجہ سے ہماری بیٹی کے جسم پر قابو پالیتا ہے۔ اس خدشے کے پیشِ نظر ہم نے پہلے تو صرف مسلمان عاملوں کا سہارا لیا۔ اس کے بعد ہر مذہب کے عاملوں سے ملے۔ انہیں گھر لاتے اور انہیں غروبِ آفتاب کے وقت اپنی بیٹی کی حالت دکھاتے۔ کچھ عامل تو اس کی حالت دیکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایک عامل نے رات کے وقت کچھ دیر رہنے کی کوشش کی تو چند گھنٹوں سے زیادہ ہماری بیٹی کے کمرے میں نہیں ٹھہر سکا۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ اگر ہم رات کے وقت گھر سے باہر رہیں تو اس پر دورہ نہیں پڑتا۔ گھر میں آتے ہی پڑتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس گھر سے جان چھڑانے کی سوچی ہے؟ دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔ جی ہاں، ایک سال پہلے ہم نے اپنا وہ والا مکان بیچ کر نیا مکان اس نیت سے بدلا تھا کہ شاید آسیب زدہ گھر سے جان چھڑا کر ہماری شینا کی مصیبت ٹل جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ گھر تبدیل کرنے کے ایک سال بعد بھی ہماری مصیبت برقرار رہی۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گی کہ دورے کے دوران وہ کس قسم کی حرکات کرتی ہے جو عاملوں کو خوفزدہ کر کے بھگا دیتی ہے؟ میں نے نیلم سے ایک اور سوال کیا تو اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا دورے کے دوران جونہی کوئی اس کے کمرے میں ہوتا ہے تو وہ ردِعمل کے طور پر کالے سانپ کی طرح اُس پر تھوکتی ہے اور کسی سانپ کی طرح سسکاریاں بھر کر جیسے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ جو ایک عامل اس کے کمرے میں رات کو چند گھنٹے ٹھہرنے کے بعد بھاگ گیا تھا وہ بتا رہا تھا کہ اس نے شینا کی گود میں منہ کالا سانپ دیکھا تھا جو شینا کی بجائے اس پر اپنا زہر تھوکنے لگا تھا۔ اور وہ اس سانپ کے ڈر سے بھاگا تھا۔ دوسرے روز ہم نے شینا کے سکول جانے کے بعد اس کا سارا کمرہ سانپ کی تلاش میں الٹ ڈالا لیکن ہمیں سانپ کہیں نظر نہ آیا اور ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اگر ہم شینا کو اپنے کمرے میں غروبِ آفتاب سے طلوعِ آفتاب تک تنہا چھوڑ دیں تو کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آتا۔ اکرام نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

کیا شینا نے آج تک اپنے دورے کی حالت میں آپ میں سے کسی کو کوئی نقصان پہنچایا ہے؟ میں نے پوچھا۔ نیلم نے جواب دیا، بالکل نہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو میرے خیال کے مطابق آپ شینا کو غروبِ آفتاب سے طلوع آفتاب تک تنہا چھوڑ دیں۔ یوں سمجھیں آپ کی بیٹی اپنے کمرے میں آرام سے سو رہی ہے۔ نیلم بولی، آپ کی بات بجا ہے۔ ایک سال کے ناکام علاج کے بعد سے تھک ہار کر ہم پچھلے ایک سال سے صرف یہی کر رہے ہیں۔ سورج غروب ہونے سے پہلے اسے کھلا پلا کر اپنے کمرے میں چھوڑ دیتے ہیں۔ صبح کو وہ ہشاش بشاش اپنے کمرے سے نکل کر اپنا دن گزارتی ہے۔ ہم اس بات سے خوش تھے کہ چلو ہماری بیٹی دن کے وقت تو ہمارے پاس ہوتی ہے۔ آج تک رات کے وقت اسے کسی قسم کا کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا۔

میں نے پوچھا، کیا شینا دورے کے دوران کسی سے کبھی کوئی بات کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے یا نہیں؟ ہم نے کوشش کی تھی۔ وہ ہمارے کسی سوال کا جواب دینے کی بجائے صرف ہمیں گھورتی رہتی ہے، دونوں نے بیک زبان جواب دیا۔ میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گئی، نیلم نے کہا۔ شینا پر ہر ماہ کی چاند کی چودھویں رات کو ایسے دورے نہیں پڑتے تھے۔ پڑتے تھے، سے آپ کی کیا مراد ہے؟ میں نے نیلم سے سوال کیا۔ نیلم کہنے لگی، میری مراد ہے کہ اس ماہ چاند کی چودھویں رات سے پہلے ہر ماہ چاند کی چودھویں کو اس پر ایسے دورے نہیں پڑتے تھے۔ اس بار سات جولائی کو چودھویں کی رات تھی۔ اس روز دو سالوں میں پہلی بار شینا پر دورہ پڑا لیکن یہ دورہ دوسرے تمام دوروں سے منفرد تھا۔ اس روز وہ اپنے کمرے میں مقید نہیں رہی۔ وہ تقریباً آدھی رات کے وقت اپنے کمرے سے نکلی اور اپنے چھوٹے بھائی انعام کے کمرے میں گئی۔ میرے آٹھ سالہ بیٹے کا نام

انعام ہے اور اسے مصوری کا شوق ہے اس وجہ سے ہم نے اس کے کمرے میں مصوری کا سارا سامان لا کر رکھا ہوا ہے۔ شینا نے اپنے بھائی کے کمرے میں رات کا بڑا حصہ گزار کر ایک تصویر بنائی۔ دو سال میں پہلی بار وہ طلوعِ آفتاب سے قبل اپنی بنائی ہوئی تصویر لے کر ہمارے کمرے میں آئی اور ہمیں جگا کر وہ تصویر دیتے ہوئے بولی، امی آپ اس بھیا کو ہمارے گھر لائیں۔ ہمیں خوشی اس بات کی تھی وہ دو برس میں پہلی بار اپنے کمرے سے سورج سے پہلے نکلی تھی۔ ہم اس کی بنائی ہوئی تصویر دیکھ کر حیران ہو گئے وہ تصویر ہماری دس سالہ شینا کی نہیں بلکہ کسی منجھے ہوئے مصور کا شاہکار معلوم ہوتی تھی۔ میں نے شینا سے پوچھا تھا کہ تم نے اس لڑکے کو کہاں دیکھا ہے؟ تو وہ کہنے لگی کہ خواب میں اسے بین بجاتے دیکھا ہے۔ اس روز کے بعد یہ ہر صبح اٹھ کر مجھے بتاتی تھی کہ اس نے خواب میں بین والے بھیّے کو دیکھا ہے۔ بین والا بھیّا اس سے کھیلتا ہے۔ اکرام کہنے لگا، میں نے شینا سے پوچھا تھا کہ تمہیں کس نے بتایا ہے کہ بین والا لڑکا تمہارا بھیّا ہے؟ اُسی نے تو بتایا ہے؟ شینا نے فوراً جواب دیا تھا۔

کیا تم اس کے بین والے بھیّا کی تصویر دیکھنا پسند کرو گے؟ اکرام نے مجھ سے پوچھا۔ ضرور ضرور۔ کیوں نہیں، میں نے جواب دیا۔ اکرام نے اپنے قریب پڑے ہوئے ایک بریف کیس سے ایک ربڑ کے رول میں لپٹی ہوئی تصویر نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا، یہ رہی وہ تصویر۔ اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر میں نے ابھی کھولا نہیں تھا کہ نیلم بولی، تصویر دیکھنے سے پہلے میں آپ پر واضح کر دوں کہ میری بیٹی کوئی مصور نہیں ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں صرف چند آڑھی ترچھی لکیریں ہی کھینچی ہیں۔ میں نے رول سے ربڑ اتارا اور تصویر کھول کر دیکھی تو میری آنکھیں جیسے اُبل پڑیں۔ کیلاش کے کمرے میں بین بجاتے ہوئے وہ میری رنگین تصویر تھی۔ اس تصویر میں کیلاش کے کمرے کو جس تفصیل سے دکھایا گیا تھا وہ بھی میرے لیے کسی حیرت سے کم نہیں تھا۔ اور تو اور بستر پر پڑی ہوئی چادر کا ڈیزائن اور چادر کی سلوٹوں تک کو تصویر میں اجاگر کر کے دکھایا گیا تھا۔ میرے بستر کی پچھلی دیوار پر آویزاں تصاویر بھی دکھائی گئی تھیں۔ تصویر اس زاویے سے بنائی گئی تھی جس زاویے سے میں نے اپنی آنکھیں کھول کر پہلی بار مناسہ کو دیکھا تھا۔ چاند کی تاریخ کا تو مجھے علم نہیں تھا لیکن یہ بات طے تھی کہ وہ رات سات جولائی کی تھی۔ دل میں سوچا، اے خدا، اے بھگوان یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ کیا یہ تصویر مناسہ نے شینا کے بدن میں داخل ہو کر اس سے بنوائی ہے۔ یا یہ تصویر مناسہ نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر شینا کے ہاتھ میں پکڑائی ہے؟

میرے پاس کہنے کو ابھی تک کچھ نہیں تھا اس لیے خاموشی اور حیرت سے ان کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو نیلم بولی۔ ہم نے یہ تصویر اپنے ہر جانکار کو دکھائی تھی۔ کسی نے تمہیں پہچاننے کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ ہمارے پاس صرف تمہاری تصویر تھی اور کل تک ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آیا یہ کسی جیتے جاگتے انسان کی تصویر ہے یا ہماری بیٹی کے ذہن کی تخلیق ہے۔ اگر یہ واقعی کسی جیتے جاگتے انسان کی تصویر ہے تو وہ کون ہے، کہاں ہے، اس کا نام کیا ہے اور ہم اسے کہاں سے ڈھونڈ لائیں؟ یہ تو ہمارا ایک نوکر موتی رام دو دن کی چھٹی پر کبرلی اپنی بہن سے ملنے آیا تھا۔ وہ کبرلی کے مندر میں موجود تھا جس وقت مندر میں موجود لوگ تمہارے پاؤں کی دھودھن پی رہے تھے۔ بلکہ موتی رام کے بقول وہ بھی تمہارے پاؤں کی دھودھن کی پرشاد پینے والے بھاگیا وان لوگوں میں تھا۔ اس نے کل جو ہانس برگ جاتے ہی ہمیں تمہارا نام اور تمہارے بارے میں سب کچھ بتایا اور آج اسی لیے ہم یہاں ہیں۔ یہ کہتے ہوئے دونوں نے کرسیوں سے اٹھ کر میرے سامنے زمین پر بیٹھ کر اپنے ہاتھ جوڑ کر کہا، ہماری معصوم بیٹی اپنے بین والے بھیّا کو بلا رہی ہے۔ خدا یا بھگوان جس کو بھی تم مانتے ہو، کے واسطے ہمیں خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔

- بقیہ -

ڈرامہ

خواب ہی تو ہے

مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں اس دولت کے عوض اپنے ضمیر کا سودا نہیں کر سکتا۔

سرفراز: ڈاکٹر صاحب! یہ دولت نہیں آپ کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ آپ کا مکان۔۔۔،

فواد: رشوت کی اس رقم سے میں یہاں مکان بنا بھی لوں تو آخر اس میں کتنے برس رہوں گا؟ اس کی سزا میں مجھے ہمیشہ آگ میں جلنا ہوگا۔ اور مجھے ہی نہیں آپ کو بھی۔ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔

سرفراز: فواد صاحب ایسا ظلم مت کیجئے! جن لوگوں نے یہ رقم دی ہے میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں۔

فواد: مگر میں نے کسی سے کوئی وعدہ نہیں کیا، سوائے اس کے کہ جس دن میں نے ملازمت اختیار کی تھی، اپنے ضمیر کے آگے ایمانداری اور اپنے عہدے سے وفاداری کا حلف اٹھایا تھا۔ ایک ایسا عہد جو کسی دستاویز میں درج نہیں مگر آج بھی میرے دل کے صفحات پر لکھا ہوا ہے، گزرتے وقت کی ہوائیں بھی اسے مٹا نہیں پائیں۔ اب میں اس اپائنٹمنٹ میں تمام امیدواروں کے معاملے میں غیر جانب دار رہوں گا۔

سرفراز: پھر انٹرویو اور اپائنٹمنٹ کا کیا ہوگا؟

فواد: جس دئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا۔

اچھا چلتا ہوں۔ خدا حافظ (جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

گٹھیا(Gout)

ڈاکٹر فیروز عالم
(کیلیفورنیا)

گاؤٹ ایک قدیم مرض ہے۔اسکا تذکرہ قبل مسیح کے حکما، جیسے سقراط اور افلاطون، نے اپنی تحریروں میں بھی کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ جوڑوں کی سوزش ہے جسکی وجہ سے جوڑ سرخ ہو جاتے ہیں اور اسکے ساتھ شدید درد ہوتا ہے اور مریض چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتا۔سولہویں صدی میں جب یورپ ترقی اور مالی فارغ البالی کی منزلیں طے کر رہا تھا طبقہء امرا میں یہ مرض عام تھا۔اسکی بڑی وجہ مرغن غذا، خاص طور سے گوشت اور شراب کی زیادتی سمجھی جاتی تھی جو بڑی حد تک صحیح بھی تھی۔بعد میں اس پر تحقیق کی گئی اور لندن کے ایک ہسپتال نے تقریباً ۱۸۷۵ میں یہ ثابت کیا کہ خون میں ''یورک ایسڈ'' کی زیادتی گاؤٹ کے حملے کا سبب ہوتی ہے۔یورک ایسڈ نام اسلئے کہ پہلے پہل یہ کیمیائی عنصر پیشاب میں دریافت ہوا تھا۔اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اگرچہ غذا میں کچھ اشیا کی زیادتی گاؤٹ کا سبب ہوتی ہے مگر اسکے علاوہ بہت سے دوسرے عناصر بھی اس بیماری کا سبب ہیں اسلئے عام افراد میں حتیٰ کہ غریب اور پس ماندہ عوام میں بھی گاؤٹ اور یورک ایسڈ کی وجہ سے دوسری بیماریاں بھی لاحق ہوسکتی ہیں۔اس مضمون کی ضرورت اس لئے ہے کہ ہندو پاکستان کے عوام کی کثیر تعداد خون میں یورک ایسڈ کی زیادتی کا شکار ہے اور ''زائی لورک'' ZYLORIC جیسی دوائیں کھا رہی ہے۔

طبی اور کیمیائی طور پر گاؤٹ کا پس منظر اور اسکی توجیہ

(یہ ذرا پیچیدہ مسئلہ ہے مگر میں کوشش کروں گا کہ اردو میں اسکو سہل طریقے سے بیان کرسکوں)

ہمیں بتایا گیا ہے کہ انسان خاک سے بنایا گیا ہے۔دراصل سائنسی تناظر میں اسکا مطلب یہ ہے کہ انسانی جسم کئی قسم کے کیمیائی عناصر کا مرکب ہے۔ اس میں تقریباً ہر وہ عنصر شامل ہے جو زمین میں (خاک) میں شامل ہے۔اسمیں کچھ عناصر وافر مقدار میں اور کچھ کم مقدار میں ہوتے ہیں۔مثلاً کیلشیم جو ہڈیوں کا خاص عنصر ہے زیادہ مقدار میں اور پوٹاشیم جو اندرون خلیات رہائیش پذیر ہے بہت کم ہے۔جسم میں جو کچھ بھی ہے وہ بنیادی طور پر کیمیائی عنصر ہے۔جسم میں پانی کی مقدار تقریباً ۶۵ فیصد ہے۔یعنی اگر ایک شخص کا وزن ۱۱۰ کلوگرام ہے تو اسکا حقیقی وزن صرف ۳۵ کلوگرام ہے باقی سب پانی ہے۔پانی کے علاوہ جسم میں سب سے زیادہ وزن گوشت کا ہے۔ گوشت جسے سائنسی اصطلاح میں MUSCLES کہتے ہیں وہ پروٹین سے بنے ہوتے ہیں۔انہی کی وجہ سے انسان حرکت کرتا ہے اور انکے خلیات کے اندر بہت سے کیمیائی عمل جاری رہتے ہیں جن سے زندگی رواں رہتی ہے۔ان خلیات کی نشوونما کے کے لئے دو عناصر بیحد ضروری ہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ پروٹین کی اکائی (AMINO ACID) ہے جنکی تعمیر نیوکلک ایسڈ کے زیر اثر ہے امائینو ایسڈ (aminoacid) کا اجتماع پروٹین کا خلیہ بناتے ہیں اور بہت سے خلیات مل کر گوشت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔نیوک لک ایسڈ کی پیدائش میں ایک کیمیا پیورین (PURINE) کی ضرورت ہے جو کاربن، ہائیڈروجن اور نائی ٹروجن پر مشتمل ہے۔اس لحاظ سے پیورین، امائنو ایسڈ اور نیوک لک ایسڈ بہت اہم ہیں کہ ایک طرح حیات کے تسلسل کے یہی ذمہ دار ہیں۔کیونکہ DNA and RNA ہی کی وجہ سے ہر جاندار اپنی وراثت کی نشانیاں آنے والی نسلوں کو منتقل کرتا ہے۔جب انسانی جسم کے خلیات کسی وجہ سے توڑ پھوڑ کا شکار ہوتے ہیں تو ان سے پیورین خارج ہوتی ہے اور جسم اسے مزید چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرتا ہے تاکہ پیشاب کے ذریعہ اسے آسانی سے خارج کر سکے، یہ چھوٹا ٹکڑا یورک ایسڈ ہے۔اگر یورک ایسڈ کی پیداوار زیادہ ہو تو اسکی مقدار کی سطح خون میں بھی بڑھ جاتی ہے

علامات

یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ گاؤٹ یورک ایسڈ کی زیادتی کا مرکزی کردار ہے مگر گاؤٹ جو ایک قسم کی آرتھرائیٹس (جوڑوں کی بیماری) ہے اسکے علاوہ بھی یورک ایسڈ کی زیادتی جسم میں گاؤٹ کے بغیر بھی بہت سی مہلک بیماریاں کرتی ہے جنکا ہم ذیل میں تذکرہ کرینگے۔گاؤٹ چالیس سال کے مردوں میں شروع ہوتی ہے عورتوں میں کبرسنی سے پہلے یہ عام نہیں، کہا جاتا ہے کہ زنانہ ہارمون ایک طرح عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر غیر معمولی حالات میں یہ کسی بھی عمر میں ہوسکتا ہے۔کلاسیکل طور پر اسکا حملہ رات کے کسی پہر اور شراب کے استعمال کے بعد ہوتا ہے، پاؤں کے انگوٹھے کے جوڑ میں اچانک سوجن اور شدید درد ہوتا ہے۔بیان کیا جاتا ہے کہ درد اسقدر شدید ہوتا ہے کہ مریض کو محسوس ہوتا ہے جیسے انگوٹھا کسی شکنجے میں پھنس گیا ہے اور یہ شکنجہ لحہ لحہ مزید سخت ہوتا جاتا ہے۔مریض کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور پھر بخار چڑھ جاتا ہے۔اگر علاج نہ کیا جائے تو مرض خود کبھی ٹھیک نہیں ہوتا اور اس قسم کے حملے بار بار ہوتے ہیں۔اسکی وجہ یہ ہے کہ جب خون میں یورک ایسڈ کی مقدار بڑھ جاتی ہے تو یورک ایسڈ جو کچلے ہوئے شیشے کی طرح ہوتا ہے جوڑوں کی جھلیوں اور نرم چپٹی ہڈیوں میں قلمی شورے کی سوئیوں کی طرح چبھ جاتا ہے اور شدید سوزش کا سبب ہوتا ہے۔خوش قسمتی سے اب اسکا علاج ممکن ہے۔

اگر یورک ایسڈ کی سطح کو قابو میں نہ کیا جائے تو یہ کئی دوسرے جوڑوں میں بھی تباہی مچا دیتا ہے اور آخر کار یہ قلمی شورا جوڑوں کے اطراف اور جسم کے نرم حصوں میں گٹھلیاں بن کر ابھرتا ہے اسے TOPHUS کہتے ہیں۔

دیگر اثرات

یورک ایسڈ کے خراج کا طریقہ صرف گردوں کے راستے پیشاب

کے ذریعے ہے۔مگر گردے ایک خاص حد تک اس مادہ کو خارج کر سکتے ہیں۔

جب اسکی سطح بڑھ جاتی ہے تو پیشاب میں بھی اسکی مقدار بڑھ جاتی ہے اور یہاں بھی یہ گردوں کی نالیوں میں جم کر یا تو گردے کی پتھری بناتا ہے یا گروں کو سوزش میں مبتلا کر کے ان کو برباد کر دیتا ہے۔

تشخیص

اگر چہ صرف مریض کی ہسٹری یا معائینے ہی سے اسکی تشخیص ممکن ہے مگر حتمی طور پر خون میں یورک ایسڈ کے مقدار کی پیمائش ضروری ہے۔مردوں میں خون میں دو ملی گرام سے سات ملی گرام اور خواتین میں دو ملی گرام سے چھ ملی گرام نارمل ہے۔مگر یہ بھی باور کرنا ضروری ہے کہ اچانک حملے اور انگوٹھے میں سوزش کے وقت کبھی کبھی بوجوہ یورک ایسڈ نارمل بھی ہوسکتا ہے۔اسی طرح کبھی کبھی آٹھ ملی گرام کی سطح پر بھی کوئی علامت نہیں ہوتی۔تشخیص کے لئے کبھی کبھار جوڑ کی شدید سوزش کے باوجود، اگر خون میں یورک ایسڈ کی سطح نارمل ہو تو جوڑ میں سوئی ڈال کر اسکا پانی نکال کر خوردبین کے ذریعہ معائنہ کیا جاتا ہے جو یورک ایسڈ کی سوئیاں ظاہر کرتا ہے جس سے تشخیص مستحکم ہوجاتی ہے۔

یورک ایسڈ کی بڑھی ہوئی سطح کی وجوہات۔

یورک ایسڈ ہمارے جسم کے خلیات کی نارمل شکست وریخت کا فضلہ ہے۔زندگی اسی شکست وریخت سے عبارت ہے۔پرانے خلیات تباہ ہوتے ہیں اور نئے خلیات جنم لیتے ہیں۔طبی لحاظ سے ان لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔وہ جو قدرتی طور پر اس سے زیادہ یورک ایسڈ پیدا کرتے ہیں جو جسم کی اس صلاحیت سے زیادہ ہے جسے وہ خارج کر سکے۔انہیں OVER PRODUCERS کہا جاتا ہے۔دوسرے وہ جو اگر چہ یورک ایسڈ کی نارمل مقدار پیدکرتے ہیں مگر ان کے گردوے اسے خارج کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے خون میں اس کی سطح بڑھنا شروع ہوجاتی ہے انہیں UNDER EXCRETOR کہا جاتا ہے۔

مختلف قسم کے کینسر یورک ایسڈ کی زیادہ مقدار پیدا کرتے ہیں اور گردے کی کئی بیماریاں خارج کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔کینسر کی کیموتھیراپی کے دوران جب ٹیومر کو بہت شدت سے تباہ کیا جاتا ہے، ٹیومر ٹوٹتے پھوٹتے یورک ایسڈ کی زبردست مقدار خارج کرتا ہے جسکی وجہ سے یورک ایسڈ گردوں میں جم کر اسکی نالیوں کو بلاک کر دیتا ہے یہ ایک سنگین مسئلہ ہے مگر اسکے تدارک کے بہترین طریقے موجود ہیں اور کیموتھیراپی سے پہلے انہیں اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔اگر کسی وجہ سے ایسا نہ کی جائے تو گردوں کی تباہی سے مریض کی موت واقع ہوسکتی ہے۔کچھ مرض جیسے ضیابیطس اور بلڈ پریشر بھی یورک ایسڈ کے بڑھنے کا سبب ہیں۔غذا میں گوشت، جھینگے اور لابسٹر اور شراب نوشی سے بھی یورک ایسڈ بڑھ جاتا ہے۔کچھ دوائیں جیسے پیشاب آور گولیاں اور جسم میں پانی کی کمی بھی یورک ایسڈ کی مقدار بڑھا دیتے ہیں۔

علاج

اس کے علاج کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ یورک ایسڈ کی سطح کو نارمل رکھا جائے۔جن لوگوں میں اخراج محدود ہے ان میں اس کے اخراج کو بڑھانے کی ضرورت ہے اور جو زیادہ یورک ایسڈ پیدا کرتے ہیں ان میں یورک ایسڈ کی پیداوار کو بلاک کرنے کی ضرورت ہے۔جس کیمائی عمل سے پیورین یورک ایسڈ میں تبدیل ہوتی ہے اسکے بلاک کر نے کی دوا زائی لورک ہے جسکا کیمیائی نام ALLOPURINOL ہے۔یہ سوا اور تین سو ملی گرام میں آتی ہے اور بہت ہی موثر ہے۔عام حالت میں اسکا کوئی مضر اثر نہیں مگر کچھ لوگ اس سے الرجک ہیں اس لئے اگر پہلی ڈوز کے بعد جسم پر خارش ہو تو اسے فوراً بند کر دینا چاہئے۔گاؤٹ کے اچانک حملے میں دو صدیوں سے ایک دوا جسے cochicine کہتے ہیں بہت ہی موثر ہے مگر اس سے جان لیوا ڈائریا ہوجاتا ہے اس لئے آجکل استعمال کم سے کم ہوتا ہے۔

گوشت کا استعمال کم کریں اور پانی کا استعمال زیادہ کریں تا کہ گردے یورک ایسڈ کو فلش کر سکیں۔

- بقیہ -

شہر کا آخری اجنبی شخص

سے بہتیرا سمجھایا کہ میں بے قصور ہوں میں نے صرف اپنے حق کی خاطر صدا بلند کی تھی سو میری سزا معاف کی جائے لیکن قاضی میرے کسی اشارے کو نہ سمجھ سکا، میں روز آتا اپنے بے قصور ہونے کی داستان دہراتا لیکن بے سود، پھر میں ایک لمبے عرصے تک یہ اشارہ کرتا رہا کہ مجھے ترجمان مہیا کیا جائے تا کہ وہ میری بات قاضی کو سمجھا سکے۔۔۔قاضی کو میرا یہ اشارہ سمجھ آ گیا اور اُس نے مجھے اشاروں کی مدد سے بتایا کہ میرے لیے ترجمان ڈھونڈا جائے گا سو تب تک مجھے جیل میں رہنا ہوگا۔

مجھے ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا کہ جس میں میں بیٹھ تو سکتا تھا لیکن پوری طرح لیٹنا ممکن نہ تھا سو مجھے اکڑوں ہو کر سونا پڑتا تھا اور وہاں سونے اور سوچنے کے سوا کوئی کام بھی نہیں تھا۔

دن مہینے اور مہینے سالوں میں ڈھل گئے لیکن مجھے ابھی تک کوئی ہم زبان نہیں ملا، اِس کوٹھڑی میں رہتے رہتے میرے بازو اور ٹانگیں ٹیڑھی ہوگئیں ہیں۔روز میں کھانا لانے والے سپاہی سے اشاروں میں پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی ہم زبان ملا ہے؟

سپاہی گردن نفی میں ہلاتا ہوا روز واپس چلا جاتا ہے میں اُسکی گردن تائید میں ہلنے کا منتظر رہتا ہوں اگر میرے پاس یہاں آئینہ ہوتا تو یقیناً میں دیکھ کر بتا سکتا کہ میرے بال کتنے سفید ہو چکے ہیں اور مجھے کوئی بھی ہم زبان نہیں ملا۔۔۔

''تمدن کی فضائیں''

بدتر از گناہ

یونس شرر (نیویارک)

یہاں زنجیر کے حلقوں سے ماتم روز ہوتا ہے
کہ اس بازارِ دنیا میں محرّم روز ہوتا ہے

گلی، کوچے و چوبارے، گھروں میں اور سڑکوں پر
قیامت سے گزرتی ہے ، یہ عالم روز ہوتا ہے

یہاں وحشت سی وحشت ہے ، ہوسنا کی لیے پیہم
میں منبر سے مخاطب ہوں، کہاں ہے درد کا مرہم

نہ نغمہ ہے نہ خوشبو ہے، نہ آہٹ اور آوازیں
تمدّن کی فضاؤں میں بہت گہرا اندھیرا ہے

مرے احساس نے ساری رگیں اب چھیل کر رکھدیں
مری سانسیں اُلجھتی ہیں، سیہ بختی نے گھیرا ہے

بھٹکتا پھر رہا ہوں میں جُنوں کی شاہراہوں پر
رواجوں اور سماجوں کی نئی قربان گاہوں پر

مری خانہ بدوشی زندگی کا شاخسانہ ہے
کثافت، داغ سینہ پر تباہی مجرمانہ ہے

نہ میں عیسٰی نفس ہوں اور نہ ہی سقراط ہے مجھ میں
مجھے تو قتل ہو کر آج، اس بستی سے جانا ہے

یہ کیسے جرم پلتے ہیں، یہاں ان آستانوں میں
فراق و وصل جیسے فاحتاؤں کی دکانوں میں

لہُو کے رنگ میں لکھی یہ تاریخی عبارت ہے
گنہگاروں کی صف میں ہوں، یہی میری عبادت ہے

کہ میں ہوں حشر کے میدان میں روزِ عدالت ہے
گئے گذرے زمانوں اور حدیثوں کی تلاوت ہے

دُعا دیتا ہوں اس جہل میں ڈوبے محدّث کو
کہ جو پامال کرتے ہیں، یہ منبر کے تقدّس کو

فنا فی الجبر کے فتوے، جگر کو چاک کرتے ہیں
اطاعت صبر کی تلقین سے یہ زخم بھرتے ہیں

کہانی سگ پرستوں کی سُنی تھی داستانوں میں
ستم پیشہ طریقت سے یہ ہم پر ظلم کرتے ہیں

مرے تارِ نفس سے کچھ انہیں تم روشنی دے دو
قلم کی روشنائی سے،نجات و زندگی دے دو

مسائل پیروی،تقلید کے ہیں بارگاہوں میں
کہ ہر لمحہ نیا اک معجزہ ہے، خانقاہوں میں

حریمِ حسن کے جلوے ، چراغاں سا نگاہوں میں
قضا و قدر کے فتوے، لب و رخسار بانہوں میں

یہی اِن آسماں زادوں کا تہذیبی حوالہ ہے
کہیں رندِ خراباتی، کہیں صوفی کا پیالہ ہے

زمیں کی ہے خبر ان کو ، نہ ہے اب آسمانوں کی
زمیں زادوں نے صورت ہی بدل دی ہے جہانوں کی

معیشت اور مشیّت پر یقیں گمراہ کُن اُن کا
خبر ان کو کہاں ہے ان مشینوں کارخانوں کی

مری نظموں کو بدتر از گناہ تعبیر کرتے ہیں
یہ اُن معصوم انسانوں کو یوں زنجیر کرتے ہیں

○

''آوارہ سا ایک خیال''

یوگیندر بہل تشنہ
(شنگھائی)

باندھ کر وہ اعمال کی گٹھڑی
سوئے عدم جب ہوا روانہ
رستہ طویل اور انجانہ
معاً اِک خیال ذہن میں آنا
اتنے برس گزارے کہاں تُو نے
میرے یار کیا ہے کمایا
کیا کسی کی پیاس بجھائی؟
کسی کے غم میں شریک ہوا؟
درد کسی کا بانٹا کبھی تُو نے!
راہِ فلاح کوئی لمحہ گزرا
مجبور و بے بس کی کبھی خبر لی
کیا کبھی کسی کے دل میں جھانکا؟
کرموں کا قرض تھی تیری مجبوری!
اُن کا لین دین تمہی کو کرنا تھا!
انسان ہونے کا فرض نبھایا کوئی!
آئندہ کے سفر کے لیے کچھ باندھا؟
لوٹ کر کبھی جب پھر آؤ گے
کیسا جیون تم اپنا چاہو گے
زیر و زبر، جو دُکھ سُکھ بھوگے
ردوبدل اپنی چاہ کا کچھ کرتا!
تنگی تُرشی کے دن تُو نے دیکھے
پُن دان ذرا سا کر لیتا
تشنگیوں کا حل کچھ کرتا اپنی
آئندہ تیرا گلزار ذرا ہوتا
سامنے تھا اعمال کا بچھوا
من بھیتر ڈنک مار رہا تھا
سوئے عدم جب ہوا روانہ
تشنہ ایسا کچھ سوچ رہا تھا

سمٹتا دائرہ

پروین شیر
(نیوجرسی سٹی)

کشادگی تھی دائرے کی گود میں
سما گئی تھی ایک انجمن یہاں
شجر کی شاخ شاخ پر
تھی نغمگی طیور کی
حسین پھول خوشبوؤں سے تر بہ تر تھے
جھومتی تھیں تتلیاں سرور میں
دھنک تھی اور کہکشاں کی رہ گزر تھی
جگنوؤں کے قمقموں کی جھلملی تھی رقص میں
مگر یہاں سے رفتہ رفتہ
سب ہوا کے تیز رتھ پہ اُڑ گئے!
یہ دائرہ سمٹ گیا
یہاں فقط خزاں رسیدہ اک شجر
کھڑا ہے دل کی ٹوٹتی
رگوں کو ٹہنیوں کی خشک
انگلیوں سے تھام کر...!

○

حاصلِ محفل

فیصل عظیم
(کینیڈا)

تمہیدوں کی بھول بُھلیّاں
باتیں گنجلک
روحِ معنی کی ارزانی
تعریفوں کے مردہ پیکر
توصیفی نظروں سے پوجا پاٹ کے منظر
گویا سب کچھ لمحے بھر کو سر آنکھوں پر
ایک عجب ہنگامہ شب بھر
واہ وا کی مشکوک صدائیں
پلک جھپکتے آنکھ سے اوجھل
اور ان سب کا حاصل، کچھ بوسیدہ منظر!

آنچیں دیتا پیٹ کا دوزخ
میلے برتن
اور چولہے پر، دیر سے کھولتی
اک کپ چائے، جو
روز یہی ناٹک کرتی ہے
ہلکی آنچ پہ پکتے پکتے
کڑوا کسیلا زہر ہوئی ہے

○

خاکی بدن

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

جو خاک زندہ ہوئی کبھی تیرے دم[1] سے
رواں ہے تیری طرف گو کہیں ذرا خم سے

یہ خاک صدیوں جمی تھی سنگ ریزوں پر
اسی کو نقشِ رواں کر دیا ذرا نم[2] سے

جو ٹھہرا نائب[3] یزداں زمیں پہ خاکی بدن
چلی خلافتِ آدم یہاں اُسی دم سے

رِواں دواں ہیں جو خاکی بدن یہاں ہر سُو
سجی ہے رونقِ دنیا انہیں کے دم خم سے

یہ آزمائش[4] دنیا یہ مال و عشرت و زن
ہیں امتحان میں آدم حوا اول دم سے

گرچہ لبریز ہے لذت سے یہ حسیں دنیا
نفس پہ گزرے گی نکلے کی روح جب دم سے

ہے کائنات بھی وسعت[5] پذیر ہر دم یاں
ازل سے کُن فیکوں ہے رواں دما دم سے

نہ جانے سفر کیسے اختتام ہوتا ہے
ریاضؔ سوچ میں گم ہے یہاں اسی غم سے

○

(القرآن): ۱۔الحجر۔۲۹، ۲۔الانبیاء۔۳۰، ۳۔البقرہ، ۳۰،
۴۔الکہف۔۷، ۵۔الذریٰت۔۴۷

دریوزہ طلب

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
(بہار، بھارت)

گلیوں میں اور کوچوں میں
بکھرے خواب کے منظر پنہاں
قتل وخوں کا شور بھی شامل
گولی بم بارود اور پتھر
مٹی، گھر، آنگن، دیوار میں
ایسے میں بے انت مسافت
گونج بنی ہے لہروں کی
نیم شگفتہ عکس کے سائے
جابر کون اور قاہر کون؟
یاد کی شمع جلتی رہے گی

کرفیو

احمد کلیم فیض پوری
(مہاراشٹر، بھارت)

کرفیو
لگا ہوا تھا
شہر میں جنگلوں میں
چاند سورج میں
دلھن کے گہنوں میں
برگد اور نیم کے نیچے
چوپال مین
عبادت گاہوں میں
جھیل کے پانی میں
سارے خونخوار وحشی
چھپے بیٹھے تھے
ٹپکتی چھت کے نیچے
لرز رہے تھے
مگر یہ کرفیو
لگایا ہوا تھا
انھیں کا!

سانحۂ پشاور

(آرمی پبلک سکول کے شہید اور زخمی ہونے
والے پھول سے بچوں کے نام)

نسیم سحر
(راولپنڈی)

ہمارے پھول سے بچّے شہید ہو گئے ہیں
بہیمیت میں عدو تو یزید ہو گئے ہیں

خدا کا قہر کسی دن تو اُن پہ ہو نازل !
کہ ظالموں کے ستم اب شدید ہو گئے ہیں

وطن فروش ہماری صفوں میں ہیں شامل !
یہ کون لوگ ہیں جو زرخرید ہو گئے ہیں

یہ کون پیکرِ ابلیس بن کے آیا ہے؟
ہیں کون لوگ جو اُس کے مرید ہو گئے ہیں؟

ہمارا دین تو دیتا ہے امن کا پیغام
یہ لوگ دین سے کتنے بعید ہو گئے ہیں !

بقا کی جنگ لڑیں گے یہ نونہال ضرور
اب ان کے حوصلے مثلِ حدید ہو گئے ہیں

یہ جنگ جاری رہے گی ہماری فتح تلک
ہمارے عزم ، مصمّم مزید ہو گئے ہیں

ہماری روح پہ اب کے جو زخم آئے نسیم
حیاتِ نَو کی ہمیں وہ نوید ہو گئے ہیں

محبت تو حقیت ہے

سید طاہر شیرازی
(جھنگ)

محبت تو حقیقت ہے
جو جھٹلائی نہیں جاتی
جسے بھولا نہیں جاتا
کبھی صحرا میں پھرتی ہے
کبھی بیلوں میں آتی ہے
کبھی دریا کی لہروں سے
یہ ٹکراتی ہے سر اپنا

محبت تو حقیقت ہے
جو جھٹلائی نہیں جاتی
جسے بھولا نہیں جاتا

یہ ظالم وقت کے دھارے
کیوں نفرت بڑھاتے ہیں
یہ چاہت کی تڑپ اندر
سے تڑپاتی ہے کیوں اتنا
جسے چاہا مرے دل نے
بہت ہی، انتہاؤں سے
مجھے معلوم یہ کب تھا
اُسے تو مجھ سے نفرت ہے
اُسے تو مجھ سے نفرت ہے

○

والد صاحب کے نام

وسیم صدیقی
(اسلام آباد)

عزیز تر وہ مجھے رکھتا تھا رگِ جاں سے
یہ بات سچ ہے میرا باپ کم نہ تھا ماں سے
وہ ماں کے کہنے پر کچھ رعب مجھ پہ رکھتا تھا
یہی وجہ تھی مجھے چومتے جھجکتا تھا
وہ آشنا میرے ہر کرب سے رہا ہر دم
جو کھُل کے جی نہیں پایا مگر سسکتا تھا
جڑی تھی اس ک ہر اک ہاں، فقط میری ہاں سے
یہ بات سچ ہے میرا باپ کم نہ تھا ماں سے
ہر اک درد و چپ چاپ خود پہ سہتا تھا
تمام عُمر وہ اپنوں سے کٹ کے رہتا تھا
وہ لوٹتا تھا کہیں رات دیر کو، دن بھر
وجود اس کا پسینے میں ڈھل کے بہتا تھا
گلے تھے پھر بھی مجھے ایسے چاک داماں سے
یہ بات سچ ہے میرا باپ کم نہ تھا ماں سے
پُرانا سوٹ وہ پہنتا تھا، کم وہ کھاتا تھا
مگر کھلونے میرے سب خرید لاتا تھا
وہ مجھ کو سوئے ہوئے دیکھتا تھا جی بھر کے
نہ جانے سوچ کے کیا کیا وہ مسکراتا تھا
میرے بغیر تھے بس خواب اس کے ویراں سے
یہ بات سچ ہے میرا باپ کم نہ تھا ماں سے

○

سنگی کتابیں۔کاغذی پیراہن

سیمیں کرن
(فیصل آباد)

کنفیوشس یا کونگ فوزی ساڑھے پانچ سوقبل مسیح کا وہ مفکر، عالم اور فلسفی ہے جس کی تعلیمات نے چین، جاپان، تائیوان، کوریا اور مشرق بعید میں زبردست پزیرائی حاصل کی اور یہاں کنفیوشس ازم نے نہ صرف ایک مذہب کی حثیت اختیار کر لی بلکہ وہ ان کی زندگیوں کا ایک لازمی جزو بھی بن گیا اور اب بھی ہے۔اس طرح کنفیوشس مت غیر سامی مذاہب میں ایک اہم مذہب کی حثیت اختیار کر جاتا ہے!

ایک ایسا مکتبہ فکر جسے ختم کرنے کی کوشش کے دوران نہ صرف اس کے مفکرین کو زندہ دفن کر دیا گیا بلکہ اس کی کتب کو جلایا بھی گیا! پھر مگر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس کے نظریات کو نہ صرف سرکاری طور پر اپنا لیا گیا بلکہ علم وانصاف کے معاملے بھی اسی راہنمائی میں طے ہونے لگے اور شاہی ملازمت کے لئے کنفیوشس کی ''پانچ کتابوں'' کا مطالعہ لازمی قرار پایا اور سول سروس کے امتحانات میں یہ سلیبس کا حصہ بن گئیں! یہ امتحانی نظام ماسوا ایک چھوٹی سے رکاوٹ کے ۱۹۰۵ء تک مسلسل کئی سو سال تک جاری رہا۔سو کنفیوشس کا مطالعہ میرے لئے ایک تہذیب اور عہد کا مطالعہ تھا جس نے جنوبی ایشیا اور مشرق بعید کی ایک وسیع بیلٹ کو متاثر کیا!

میرے لئے یہ سفر علم ومعرفت اور فکر وفلسفے کا سفر ثابت ہوا مجھے خوشی ہے کہ محترم یونس خان کی اس اہم کتاب کے مسودے کی نظر ثانی کا موقع مجھے ملا اور جب میرے علم میں یہ آیا کہ کتابیں جلائے جانے کے بعد کنفیوشسی مبلغین نے اِسے پتھر کی سلوں پر کندہ کر کے محفوظ کیا تو میں نے ان کتابوں کو بے ساختہ'' سنگی کتابیں، کاغذی پیراہن'' کہا! یہی پھر اس کتاب کا عنوان ٹھہرا۔

اس کتاب کی اہمیت دو چند اس لئے بھی ہو جاتی ہے کہ ان قوانین اور فکر وفلسفہ نے صدیوں چین پر حکومت کی اور ایک مذہبی فکر وفلسفہ کا صدیوں حکومت کرنا، ان کے نتائج اور ان کی تعلیمات کو جاننا اور مشرقی طرز فکر کو سمجھنا، مشرقی معاشروں میں اپنی الگ ہی ایک اہمیت رکھتا ہے!

کنفیوشس کے ہزاروں کی تعداد میں شاگرد تھے اور ان میں سے ستر اپنے عہد کے مشہور دانشور ہوئے!

گو کہ کنفیوشس مت ایک غیر سامی مذہب کہلایا بلکہ یہ بحث بھی جاری رہی اور ہے کہ کیا یہ واقعی کوئی مذہب ہے بھی یا نہیں!

اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یہ احساس شدت سے ہوا کہ کنفیوشس کی دی گئی تعلیمات، اخلاقی اصول وقوانین ضرور کسی الہامی قوت کے زیر سایہ تشکیل پائے ہیں!

یہ سلسلہ تعلیم موتیوں کی تسبیح میں پرونے جیسا بے ساختہ عمل ہے جہاں ہر نتیجہ خود بخود دوسرے نتیجے پہ منتج ہو کر جڑتا چلا جاتا ہے!

اور جب کنفیوشس خود یہ پیغام دیتا ہے کہ ''میں اصل میں مفکر نہیں محض ایک پیامبر ہوں'' تو یہ بھی اس کی الہامی شخصیت کا اعلامیہ ٹھہرتا ہے!

الہامی اور آسمانی کتب کے ضابطہ اخلاق سے حیرت انگیز مماثلت بھی کنفیوشس کی صداقت کیلئے ایک اہم دلیل اور حجت ثابت ہوتی ہے۔کنفیوشس کے بہت سے اقوال قرانی آیات سے مماثلت کرتے بھی میرے لئے ایک سوال چھوڑ گئے کہ کیا کنفیوشس واقعی اپنے عہد کا پیغمبر تھا! کیا یہ پیغامات وتعلیمات واقعی کسی مقدس ذات اور ادارے سے جاری کئے گئے تھے؟

یہ سوال کتاب کے مطالعے کے دوران بار بار آپ کے سامنے بھی کھڑا ہوگا!

کنفیوشس کہتا ہے کہ ''اعلی انسان کو نہ تو کوئی پریشانی ہے نہ خوف''

''جو اپنے لئے پسند کرو وہ دوسروں کے لئے بھی ناپسند نہ کرو''

''غلطی کرنا اور اس کی اصلاح نہ کرنا ہی اصل غلطی ہے''

ہر فلسفی کی طرح ایک اعلی، برتر انسان ایک مثالی انسان کا تصور کنفیوشس کے ہاں بھی بہت واضح ہے! کنفیوشس کا یہ بہتر اور اعلی انسان ہی در اصل معاشرے اور حکومت کی ریڑھ کی ہڈی ہے جس کے گرد یہ ڈھانچہ کھڑا ہے!

اس کتاب، اس تہذیب کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی اہم ثابت ہوتا ہے کہ کنفیوشس اپنے درس وتدریس کے سلسلے کے دوران بار بار اس خطے کے قدیم انسان اور قدیم تعلیمات کا زکر کرتا ہے اور اپنے عہد کو جدید گردانتا ہے اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس علاقے کی تہذیبی بستیوں کی تاریخ کتنی قدیم ہے؟!

کنفیوشس کے قوانین وضابطہ اخلاق بظاہر سادہ وکتابی باتیں معلوم پڑتی ہیں مگر یہی اصول اور ضابطہ حیات ہیں جو ایک اچھے فرد اور معاشرے کی اساس ہوا کرتے ہیں! اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان اصولوں نے چین میں صدیوں حکومت کی!

مشرقی اور جنوبی ایشیا کے اس مفکر کا مطالعہ کئی جہتوں سے ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اس طرز فکر کو سمجھنے میں کئی لحاظ سے اہم ثابت ہوگی! کیونکہ کنفیوشس کے اخلاقی ضوابط ایسے ہیں کہ وہ ہر معاشرے کے لئے اہم ہیں۔ایسی اخلاقی قدریں جو نا صرف مشرقی بلکہ مغربی معاشرے میں بھی بنیادی کلیدی کردار ادا کر سکتی ہیں۔اخلاقی ضوابط رسوم اور فکر و فلسفہ بے شک ہر معاشرے کا جداگانہ ہے مگر کچھ آفاقی سچائیاں ہر طرف یکساں ہیں۔سو وہ سنگی کتابیں جو صدیوں پہلے کندہ ہوئیں تھیں ان کا یہ کاغذی پیراہن یقیناً باب علم وفکر میں اک حرف معتبر ثابت ہوگا۔

رفیق حسین کے افسانوی کردار

(فطری وجود کے آئینے میں)

ڈاکٹر علی عباس
(چندی گڑھ، بھارت)

"**تخلیقی** ادب کے پس پردہ کوئی ایسی قوت ضرور سرگرم عمل رہتی ہے جس کا خود فنکار کو بھی باقاعدگی کے ساتھ احساس نہیں ہوتا ہے۔ادب اگر چہ صرف اسی قوت کا پروردہ نہیں ہوتا مگر اس قوت کا ادب کی تخلیق اور اسے مخصوص مزاج بخشنے میں بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔"

بحث رفیق حسین کے افسانوں میں موجود ان کرداروں پر ہونی ہے جنہیں جانور سے موسوم کیا جاتا ہے۔رفیق حسین اور ان کے افسانوں پر سب سے پہلے صاحب طرز ادیب اور محقق پروفیسر نیّر مسعود نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"سہولت کی خاطر کہا جا سکتا ہے کہ ان (رفیق حسین) کے افسانوں کا موضوع جانور ہیں،لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ رفیق حسین جانوروں کے موضوع پر ہمیں کیا بتانا چاہتے ہیں۔انہوں نے جانوروں کی ہیئتوں،اداؤں، عادتوں،جبلّتوں اور جذبوں تک کی عمدہ عکاسی کی ہے۔"

اور وہ کہتے ہیں کہ:

"یہ خیال کرنا بھی مناسب نہ ہوگا کہ ان کا بنیادی موضوع جانور اور انسان کا موازنہ ہے،اور یہ خیال کرنا اور بھی نامناسب ہوگا کہ وہ جانور کو انسان پر فوقیت دیتے ہیں۔جانور اور انسان کا اس قسم کا تقابل ان کا مقصود نہیں معلوم ہوتا۔البتہ ان کے یہاں یہ دونوں فطری اور عقلی مظاہر کی نمائندگی کرتے ہیں۔۔۔حیوان فطری وجود کا نمائندہ ہے اور انسانی وجود کو کبھی مسخ کرتا ہے،کبھی خطرے میں ڈالتا ہے اور کبھی فنا کر دیتا ہے۔اسے رفیق کا بنیادی موضوع خواہ نہ کہا جائے لیکن یہ ان کے افسانوں کا ایک مشترکہ موضوع ضرور ہے۔"

بہر حال آیئے دیکھتے ہیں کہ رفیق حسین کے افسانوی مجموعے "آئینۂ حیرت" میں وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے ان کے افسانے اردو دنیا میں منفرد طرز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے افسانوں کی انفرادیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں ایک بار اور نیّر مسعود سے رجوع کرنا ہوگا اور یہ جاننا ہوگا کہ آخر رفیق حسین کے افسانوں میں موجود وہ کون سی خصوصیات ہیں جو انہیں اردو کے دیگر تمام افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہیں۔زیرِ نظر افسانوی مجموعے "آئینۂ حیرت" میں شامل افسانوں کے مرکزی خیال کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

"آئینۂ حیرت" کے افسانوں کو ایک سے زیادہ بار پڑھا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ رفیق حسین نے جنگل اور حیوان کو اپنا کینوس بنایا ہے لیکن ان کی توجہ کا مرکز وجود اور اس کا عدم ہے،حیات اور اس پر زمان کا گہرا سایہ ہے۔"

جانوروں کی فطری اور جبلّی قوتوں کو جس فنکارانہ مہارت کے ساتھ رفیق حسین نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے،اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ جانوروں کے عادات وخصائل پر کس قدر گہری نظر رکھتے تھے۔یہاں پر رفیق حسین کے چیدہ افسانوں کے کرداروں پر ایک نگاہ ڈال لیتے ہیں:

"شیر: شیر دُم کو اپنے پہلو میں سمیٹے ہوئے،منہ کھولے،ہلکے ہلکے ہانپتا ہوا،تیزی سے آنکھیں ادھر اُدھو گھماتا ہوا سامنے کی کھڑی چڑھائی کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔دفعتاً ریچھ،جس کی کہ بو اسے ندی کے کنارے ہی سے آ گئی تھی،سامنے پتھروں پر آہستہ آہستہ بھدّے بدن سے چڑھتا نظر (آیا)۔شیر کا کھلا ہوا منہ بند ہو گیا ،دُم لٹھیا کی طرح پیچھے جا پڑی اور دُم کی پتلی نوک ناگن کی طرح دائیں بائیں لہرانے لگی۔

ریچھ: اس تڑانخے کی آواز سے ریچھ،جو کہ ان پتھروں کے پاس سے گزر رہا تھا ٹھٹھک گیا،بھاری جھبرا سر ہلا ہلا کر ادھر اُدھر سونگھا۔دو بوئیں مشترکہ! جھلاّ کر نیچے سے ناک کے بانسے کو دو دفعہ پونچھا اور دونوں پتھروں کے بیچ میں گھُس گیا۔بجلی کی طرح شیر شکار کو چھوڑ گھوم کے کھڑا ہو گیا۔آندھی کی طرح ریچھ نے جھٹکا لیا اور راستہ روک کر سات فیٹ اونچا،تین فیٹ چوڑا جھبرا دیو پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔(بیر)

ہاتھی: شیرنی کی جنگل دہلا دینے والی دہاڑ،اس نے سکون اور اطمینان کے ساتھ سونڈ کی نوک منہ میں دبائے ہوئے اور اٹھے ہوئے پچھلے ایک پیر سے دوسرا پیر کھجاتے ہوئے سُنی۔اس کی بائیں طرف کی پھوٹی ہوئی آنکھ جس میں سے دائمی سیاہ بہنے والے آنسوؤں سے مستک پر ایک کالی لکیر بنی ہوئی تھی،اپنے دید سے خالی گڑھے پر بچھائی اور سالم آنکھ کے چھوٹے گول ڈھیلے نے چاروں طرف اوپر نیچے کئی چکر کھائے۔(ہر فرعونے راموسیٰ)

گھوڑی: یکایک یہ آواز جو آئی،گھوڑی چونک،دونوں کان پیچھے دبا خاموش کھڑی ہو گئی۔گونگی نے پھر وہی آواز نکالی۔گھوڑی نے آگے پیچھے کان ہلاتے ہوئے پھر اس آواز کو سُنا۔۔۔آواز کو سنا تو پھر یہ معلوم ہوا کہ اس مریل گھوڑی میں کسی نے بجلی بھر دی۔ایک مرتبہ ہنہنانے کی تڑپ ماری۔دیکھتے دیکھتے ساز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے گھوڑی آزاد بموں سے نکل کر یکّے کے چاروں طرف پھرنے لگی۔وہ رکتی بھاگتی،کبھی الف ہوتی،کبھی دولتّیاں چلانے لگتی۔کان سکوڑے، دانت نکالے یکّے کے گِرد گھومنے لگی۔(بے زبان)

"رفیق حسین کے افسانوں کے دروبست کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ جس طرح کوئی انجینئر اپنی تعمیر کا نقشہ پہلے سے تیار کر کے ایک ایک اینٹ کی جگہ مقرر کر لیتا ہے،اسی طرح انہوں نے بھی افسانوں کی منصوبہ بندی اور تنظیم کی ہے۔اور ان کا یہ قول درست معلوم ہوتا ہے کہ میں افسانہ لکھنے سے پہلے اس کے پلاٹ اور تمام جزئیات کا اپنے تصور میں مکمل جائزہ لے لیتا ہوں۔"

کہا جاسکتا ہے کہ انسان اور حیوان کے درمیان بنیادی فرق جبلّت اور عقل کا ہے۔انسان عقل اور جبلّت دونوں کے ذریعے عمل کے خیر وشر اور اس کے نتائج سے آگاہ ہونے کے ساتھ اسے انجام دینے یا نہ دینے کا پابند ہوتا ہے، جب کہ جانور اپنی جبلّتِ محض سے کام لیتے ہوئے کسی بھی عمل کی انجام دہی پر قدرت رکھتا ہے اور اسے انجام دے کر ہی دم لیتا ہے۔اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ انسان اپنی جبلّی قوتوں کے اصرار کے باوجود بھی کسی عمل کو صرف اس لیے انجام نہیں دیتا کہ عقل اس میں حارج ہوتی ہے اور عمل کرنے والے کو اس کے برے نتائج سے باخبر کرتی ہے۔کبھی کبھی انسان کی جبلّی قوتوں پر ایگو یا سپر ایگو اس قدر حاوی ہو جاتی ہے کہ وہ کسی مرتے ہوئے انسان کی مدد کرنے سے بھی خود کو روک لیتا ہے۔جب کہ جنگلی جانوروں کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ موت کی پروا کیے بغیر اپنے ساتھی کی حفاظت کرتے ہیں۔یہاں پر وہ محض اپنی جبلّی قوت کو کام میں لاتے ہیں اور انجام سے بے خبر، اپنی اڈ اور فطرت کے مطابق عمل کرتے ہیں۔رفیق حسین نے اپنی کہانیوں میں انسان اور جانور کے درمیان جس اشتراک اور افتراق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، وہ دراصل وہی جبلّی قوتیں ہیں جو ان دونوں (انسان اور حیوان) کے اندر موجود ہیں۔ان کے افسانے " گوری ہو گوری" میں دیکھا جاسکتا ہے کہ انسان اور حیوان اپنی اپنی جبلّتوں کو کس طرح کام میں لاتے ہیں۔جہاں ایک جانور اپنی جبلّتِ محض سے وہ کام کر جاتا ہے جسے ایک انسان خوف کے سبب انجام دینے سے گھبراتا ہے۔

" گوری ہو گوری" میں انسان اور جانور کی جبلّی قوتوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔اس کہانی میں جبلّت کو سمجھنے کے لیے ہمیں کچھ دیر تک اس کہانی کے ساتھ چلنا ہوگا۔دراصل اس میں ایک ایسے گاؤں کی کہانی پیش کی گئی ہے جہاں کے لوگ جانوروں اور چھوٹے چھوٹے کیڑوں مکوڑوں کی آوازوں اور ان کی حرکتوں سے آنے والے خطروں کو بھانپ لیا کرتے ہیں۔اس افسانے کی کردار بسنتی جھینگروں کی جھنکار، مینڈکوں کی ٹرٹر اور الوؤں کی ہَک ہَک کی آوازوں کو ایک دم سے سُن کر خوف زدہ ہو جاتی ہے اور پھر گھر کے سبھی سونے والوں کو جلدی جلدی بیدار کرتی ہے لیکن اس وقت تک سیلاب کا پانی بڑی خاموشی سے گاؤں والوں کے گھروں میں پہنچ جاتا ہے، تیزی کے ساتھ گاؤں کے سبھی لوگ گھر چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتے ہیں۔مادھو (بسنتی کا شوہر) دیکھتا ہے کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔مادھو، بسنتی اپنے بچوں کے ساتھ باہر نکلنے کو تیار تھے، مگر مادھو کو اپنی گائے اور چار بیلوں کی فکر دامن گیر تھی، جو کہ گاؤں کے باہر اس کے سالے کے یہاں بندھے ہوئے تھے۔مادھو نے اپنے گھر ہی سے اپنے سالے ناگا کو آواز دی مگر کوئی جواب نہ آیا۔نفسا نفسی کے عالم میں ڈکراتی بھینسیں، چلاّتی گائیں، ممیاتی بکریاں، روتے بچّے، سہمی عورتیں اور پکارتے مرد۔سب بھیگے، سب پانی ٹپٹپاتے ریل کی پٹری پر چڑھے۔اندھیری رات میں سونی پٹری آباد ہوگئی۔۔۔آدمیوں میں ایک چمار کا لڑکا اور دو سگے بھائی کُرمی کم تھے اور بچّوں میں رام کلیا نظر نہیں آرہی تھی۔رام کلیا کی ماں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔سب دلاسا دے رہے تھے۔وہیں پر اُن کی گوری گائے کھڑی اِڑّا رہی تھی " تو کاں آ آں ں ھ تو کاں آ آں ں ھ " یہ بھی ایک دکھ پیٹی ماں تھی جس کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا، بچھڑا اس کا بھی نہیں مل رہا تھا، دکھیا ماں رو رہی ہے۔" تو کاں آ آں ھ " یہ گائے روتی ہوئی بسنتی کے پاس آئی۔بسنتی نے اپنی باہیں اس کی گردن میں ڈال دیں اور دونوں مائیں روئیں۔گوری رے موری رمکلیا۔۔۔اینھ لیھ لیھ لیھ۔گوری رے اب تو ہے کون چرائے لیھ لیھ لیھ۔گوری رے اب تو ہے کون کھلائیہ لیھ لیھ۔پھر گائے نے وہی لمبی آواز نکالی تو کاں آ آں ھھ۔۔۔

اس افسانے میں گوری (گائے) مرکزی کردار ہے جو قاری کی پوری توجہ اپنی طرف مبذول رکھتی ہے۔انسانوں کی بھیڑ میں تنہا یہ گوری اپنی جبلّت سے کس قدر انسانی ایگو اور سپر ایگو سے آگے نکل جاتی ہے اس بات کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہر ایک رمکلیا کی ماں کو دلاسہ تو دیتا ہے مگر سیلاب زدہ اپنے گاؤں میں جا کر رمکلیا کو لانے کی جرات کسی میں نہیں ہوتی۔انہیں کے بیچ موجود گوری کا اپنا بچھڑا بھی بچھڑا ہوا تھا مگر اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ادھر رمکلیا اپنے چھپّر کی آدھی چھت بہہ جانے کے باوجود ابھی بھی آواز دے رہی ہے مگر انسانوں کے ہجوم تک اس کی آواز نہیں پہنچ پا رہی تھی۔

ریل کی پٹری پر سو رہے انسانوں کے درمیان سے گوری صبح نمودار ہونے سے قبل ہی بڑی خاموشی سے پانی میں اترتی ہے اور اپنے بچھڑے کی تلاش میں نکل جاتی ہے۔رمکلیا نے گائے کی آواز سنی مگر گائے نظر نہ آئی۔اس نے پوری طاقت سے پکارا" گوری ہو گوری" جواب آیا" تو کاں آں آں۔۔۔" رمکلیا کی آواز کی طرف بڑھتی ہوئی گوری (گائے) کے کانوں میں ایک اور آواز آئی" اوماں آں ں ھ " یہ باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔یہاں پر ہمیں گائے کی جبلّی قوت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔جب ایک گوری کو دو آوازیں مدد کے لیے پکار رہی ہوتی ہیں، ایک رمکلیا کی اور دوسری بچھڑے کی۔آخر وہ کس کے پاس جائے۔اس مقام پر اس کی جبلّت اسے پہلے اپنے بچھڑے کی طرف جانے کے لیے آمادہ کرتی ہے اور وہ اسی کی طرف جاتی بھی ہے، لیکن بچھڑے کے قریب پہنچ کر چکّر لگاتی ہے۔اسے سونگھتی ہے، ایک دفعہ اس کی تھوتھنی بھی چاٹتی اور پھر تیرتی ہوئی دوسری طرف نکل جاتی ہے۔ظاہر ہے کہ ہمارے ذہن میں ایک سوالیہ نشان ابھرتا ہے کہ اپنے بچّے سے اس حد تک قریب ہو جانے کے باوجود اس نے اسے باہر کیوں نہیں نکالا۔؟ کچھ دیر بعد گوری پھر لوٹ کر اپنے بچّے کے قریب آتی ہے پھر چاروں طرف چکر لگاتی ہے اور اسے باہر نکالنے کی کوشش کرتی ہے مگر بچھڑا پھر بھی آگے نہیں بڑھتا۔آخر قاری کی نگاہیں گوری اور اس کے بچھڑے پر ٹھہر جاتی ہیں۔یہاں تک کہ گوری اپنے بچّے کو چھوڑ کر پھر کسی دوسری طرف چلی جاتی ہے۔

یہاں پر انسانی شعور اور حیوانی جبلّت کی حدیں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے بچھڑے کو بچانے کے لیے گوری نے اپنی تمام تر

جبلّی قوتوں کا اظہار کیا اور اپنے بچھڑے کو وہیں چھوڑ کر اور رمکلیا کی طرف رخ کیا جو گوری کو پکارتے پکارتے بے ہوش ہو کر چھپّر کے اوپری کنارے پر پڑی ہوئی تھی۔ گوری اس کے قریب پہنچی اور کئی آوازیں دی مگر جب رمکلیا کی آنکھ نہ کھلی تو گوری نے اپنی گرم گرم زبان سے اس کا منھ چاٹنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ رمکلیا کو ہوش آ گیا۔ گوری میّا گوری میّا کہتی ہوئی اس کی پشت سے چمٹ گئی، گوری اسے لے کر دوبارہ بچھڑے کی طرف گئی اور کئی چکّر لگائے مگر اب بھی بچھڑا ساتھ نہ چلا، واپس جانے لگی۔ اب یہاں سے انسانی شعور اپنا کام کرتا ہے اور آٹھ سال کی رمکلیا کو پورا ماجرا سمجھ میں آ جاتا ہے، گائے ایک بار پھر بچھڑے کے قریب پہنچی۔ اور جیسے ہی بچھڑے کے قریب گوری پہنچی رمکلیا نے اوندھے لیٹے ہی لیٹے ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسّی کی گانٹھ نکال دی۔

دن کے بارہ بجے جس وقت گوری آگے آگے پیٹھ پر رمکلیا اور پیچھے پیچھے بچھڑا" اوں ماں آں ھ " کے سوال جواب کرتے ہوئے گاؤں والوں میں پہنچے تو بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی کبھی رمکلیا کو گلے لگاتی اور کبھی گوری سے چمٹ جاتی۔ اور گوری بس اتنا کہتی" تم ماں آں آں ھ، ہم ماں آں آں ھ"۔ یہاں پر رفیق حسین نے گوری کو رمکلیا پر یا رمکلیا کو گوری پر فوقیت نہیں دی ہے لیکن یہ ضرور بتا دیا ہے کہ جانور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے بغیر انجام کی پروا کیے نکل پڑتا ہے جب کہ انسان انجام کے خوف سے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ رفیق حسین نے بڑی گہرائی سے جانوروں کی فطری قوتوں کا مشاہدہ کیا ہے اور انہیں مشاہدوں کی روشنی میں اپنے افسانوں کے کردار گڑھے ہیں جن میں انسانی اڈ، ایگو اور سپر ایگو سب کچھ جانوروں کی جبلّت میں بہ یک وقت دیکھا جا سکتا ہے۔

جانوروں کو ایک ممتاز خصوصیت کے طور پر انسٹنکٹ (Instinct) کی قوت بھی دی گئی ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس قوت کی وجہ سے جانوروں میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔ اس قوت کا جانوروں میں ہونا جدید دور کی سائنس کے ذریعے دریافت ہوا ہے لیکن جس زمانے میں رفیق حسین نے یہ افسانے لکھے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اس قسم کی اصطلاح سے ہرگز واقف نہ رہے ہوں گے۔ انہیں کے افسانے سے ہم اس قوت کو سمجھنے کی بھی کوشش کریں گے اور دیکھیں گے کہ جسے ہم محض جانوروں کی جبلّت سمجھتے ہیں اس جبلّت میں کتنی اور قوتیں پائی جاتی ہیں۔

انسان اور جانور کے درمیان دوستی اور دشمنی کا جذبہ بھی خوب ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ رفیق حسین کے افسانوں میں موجود کرداروں کے ذریعے لگایا جا سکتا ہے اور دیکھا جا سکتا ہے کہ جانور اپنی انسٹنکٹ (Instinct) سے کس حد تک اپنے دوست یا دشمن کو پہچان سکتا ہے۔ درج ذیل اقتباس میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شیرنی اپنے کیے ہوئے شکاروں کی چوری کرنے والے بہاری کو کس طرح پہچان کر اسے اپنا شکار بنا لیتی ہے:

"بہاری سانبھر پر جھکا ہوا تھا۔ تین سکنڈ کے واسطے ٹھٹھک گیا لیکن فوراً ہی اس نے ارداہ کیا کہ ایک ہی ٹکڑا کاٹ لے۔ کھائی اور چڑی ہوئی سانبھر کی لاش پر ایک ہی وقت میں ایک جگہ دونوں ہاتھ ہنسیا سے گوشت کاٹنے میں لگ گئے اور دوسری جگہ اس کے دانت کچّے گوشت میں مصروف ہو گئے۔ دو لقمے پیٹ میں اور سیر بھر کا ٹکڑا ہاتھ میں لے کر بہاری بھاگا۔ پیڑ سے نکل کر جھاڑیوں میں سے ہو کر جس وقت وہ سانپ لائن پر آیا وہیں شیرنی کھڑی تھی۔ خاموش بجلی سی کوندی۔ چار من کا شیرنی کا جسم ایک ہی چھلانگ میں بھاگتے ہوئے بہاری پر گرا۔ کمر اور پسلیاں سینکوں کی طرح چرچراتی چلی گئیں۔ بہاری شیرنی کے اگلے پیروں کے نیچے ایسا پڑا تھا جیسے کھونٹی سے گری ہوئی اچکن پڑی ہو۔"

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جانور اپنی اسی انسٹنکٹ (Instinct) کے ذریعے کس طرح اپنی جان کی بازی لگا کر ایک اپنے محسن کو بچاتا ہے جس نے کبھی اس کی مدد کی تھی۔ یہاں پر دوستی کے اس جذبے کو دیکھا جا سکتا ہے کہ جہاں اکثر انسان موت کے خوف سے اپنے عزیز ترین دوست کو چھوڑ دیتے ہیں، لیکن کلوا (کتّا) اپنی جان کی پروا کیے بغیر منّن کو پانی سے نکال کر دوستی اور احسان مندی کی ایک مثال قائم کر دیتا ہے:

"منّن اپنی فکریں بھول گئے۔ کنارے اکڑوں بیٹھ کر مچھلیوں کی سیر میں محو ہو گئے۔ ایک مچھلی دیوار کی جڑ تک آ گئی، منّن نے جھک کر اسے پکڑنا چاہا، پوری جان سے اندر لڑھک گیا، کلوا کچھ دور تھا، ان کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہیں سے اس نے پانی میں جست ماری۔۔۔ پانی بہت گہرا تھا۔ کئی منٹ کے بعد بچّے نے اچھال کھایا۔ کلوا نے ڈھال کی طرح اپنا جسم بچّے کے سینے کے نیچے کر دیا۔ بچّے کے پیٹ میں کافی پانی جا چکا تھا۔ وہ قریب قریب بے ہوش تھا لیکن قدرتاً اس کا ایک ہاتھ کلوا کی گردن میں اور دوسرا پچھلے پیروں سے لپٹ گیا۔ اُفق کی سرخی گہری پڑتے پڑتے سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔۔۔ اب کلوا کا بھی پیٹ پھول چکا تھا، جسم میں طاقت نہ تھی یا اپنی ناک پانی سے باہر رکھ سکتا تھا یا بچّے کی۔ دل میں طاقت وہی باقی تھی۔ آخر مالک کی ناک اوپر رہی اور تھکی ہوئی گردن نیچے جھک گئی۔ صبح کو کچھ لوگ جمع ہوئے۔ سسکتے ہوئے بچّے کو نکال کر میڈیکل کالج کی طرف دوڑے۔ کلوا کی پھولی ہوئی لاش وہیں چھوڑی جس کو تھوڑی دیر بعد دو بھنگیوں نے نکال کر احاطے سے باہر میدان میں پھینک دیا۔"

اسی طرح رفیق حسین کے افسانے" آئینۂ حیرت" کی بندریا کو بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح تلاشِ بسیار کے بعد جب اپنے کھوئے ہوئے بچّے سے ملنے کی کوشش کرتی ہے تو اسے مار کر بھگا دیا جاتا ہے مگر وہ اپنے بچے کی محبت میں اور اسے دیکھنے کے لیے رئیس کے گھر کی چھت کے ارد گرد ہی چکّر کاٹتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ لینڈ سلائڈ کے وقت اپنے بچّے کو نہ پا کر وہ ایسا قدم اٹھاتی ہے جس سے اس کی مامتا تمام تر انسٹنکٹ پر غالب آ جاتی ہے:

"ایک دن رئیس کا ڈرائیور بندریا کے بچّے کو اٹھا لے جاتا ہے تا کہ

رئیس کا منّتوں مرادوں والا کمزور بچّہ بندر کی ہوا پاس رہنے سے تندرست ہو جائے۔۔لیکن اب بندریا کا بچّہ ہر وقت اپنی ماں کی یاد میں چیخا کرتا ہے اور اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں وہ بیمار ہو کر بچّے کی صحت کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔۔۔ رئیس کے یہاں سے ایک لڑکی پوجا کی غرض سے اپنے یہاں لے جاتی ہے۔ پہاڑ پر بارش اور ٹھنڈ شروع ہو جاتی ہے بندروں کی ٹولی واپس جا چکی ہے لیکن بندریا اپنے بچّے کی تلاش میں وہیں رہتی ہے اور بے قرار ہو کر ایک رات وہ رئیس کی کوٹھی پر پہنچ جاتی ہے۔اسی وقت لینڈ سلائڈ میں اوپر والا پہاڑ نیچے پھسلنا شروع ہوتا ہے مامتا کی ماری بندریا کو جب اپنا بچہ نظر نہیں آتا تو وہ رئیس کے بچّے کو لے بھاگتی ہے۔لینڈ سلائڈ میں کوٹھی بکھر کر نیچے پھسل جاتی ہے اور اپنے مکینوں سمیت ملبے کی تہوں میں دفن ہو جاتی ہے۔بندریا بچّے کی حفاظت کرتے ہوئے لینڈ سلائڈ کے خاتمے تک بھاگتی رہتی ہے۔آخر زخموں اور تھکن سے چُور ہو کر مر جاتی ہے۔ایک ڈھٹیال اس کی گود سے بچّے کو اٹھالے جاتا ہے اور اب لاکھوں کی جائداد کا مالک یہ بچّہ نیم وحشی ڈھٹیال بن کر جانوروں کی سی زندگی گزارے گا۔"

یہاں پر بھی وہی جبلّت اور اِڈنظر آتی ہے جو عام طور پر حیوانوں میں پائی جاتی ہے بس فرق یہ ہے کہ اس افسانے میں بندریا اپنی جان جوکھم میں ڈال کر رئیس کے کمزور سے بچّے کو اپنا بچّہ سمجھ کر اٹھالے جاتی ہے اور اپنی موت تک اسے زندہ رکھتی ہے۔جب سے بندریا کو معلوم ہوا تھا کہ اس کا بچّہ رئیس کے وہاں ہے، ہر روز صبح سے شام تک اسی کی چھت اور آس پاس کے مکانوں کا چکّر کاٹنا اس کا معمول بن گیا تھا۔یہاں پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایک جاندار نے ایک دوسرے جاندار صرف اس لیے قید کیا کہ ایک اور جاندار کی جان بچائی جا سکے مگر اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ کیا کبھی انسان نے یہ سوچا ہوگا کہ وہ جس بندریا سے اُس کے بچّے کو چھین لایا ہے وہی لینڈ سلائڈ کے وقت اس کے بچّے کی جان بچائے گی۔ اس افسانے میں بہت سارے اشارے اور استعارے موجود ہیں لیکن خصوصیت سے استعارے نگاہ میں رکھا گیا وہ لینڈ سلائڈ کا منظر ہے۔جو پل بھر میں وہ سب کچھ برباد کر دیتا ہے جو ایک زمانے سے آباد تھا۔اسی لینڈ سلائڈ کے استعاراتی معنی کو نیّر مسعود نے یوں بیان کیا:

"آئینۂ حیرت کا لینڈ سلائڈ ہے۔لینڈ سلائڈ یا گزرے ہوئے وقت کی تجسیمِ فنا کے اس کہرام میں ایک جاندار وجود ایک اور جاندار وجود کا بوجھ اٹھائے بقا کی ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہے"

"لاکھوں کروڑوں من سلیں، پتھر، درخت، مٹّی برابر اوپر سے گر رہی ہیں۔پہاڑ کا اس طرف کا پورا ڈھال چوٹی سے لے کر نیچے بیر بھٹی تک پھسل پڑا ہے۔بیر بھٹی کی آبادی کئی سو فٹ ملبے کے نیچے دفن ہو گئی۔کیا جھونپڑا کیا مکان، کیا امیر، کیا غریب، کیا پیر کیا فقیر سب دفن ہو چکے ہیں۔فردوس کا ٹیچ کے منتشر ٹکڑوں پر بھی گزوں بلکہ بلّیوں ملبہ گر چکا ہے اور گر رہا ہے، اور اب بھی اس شورِ قیامت میں، اس اندھیرے میں بندریا پتھر سے چٹان پر اور چٹان سے درخت پر، درخت سے نگل جانے والے ملبے پر اچکتی ہے۔تین ہی ہاتھ پیر ہیں۔ایک ہاتھ سے بچّہ سینے سے چمٹا رکھا ہے۔۔۔رات کی تباہ کاریوں کے بعد فلکِ پیر انتہائی معصومیت سے مسکرایا، خاموش پہاڑوں میں صبح ہوئی، بادل بھی چھٹ چکے ہیں، کہرا بھی نہیں ہے، ہوا بھی بند ہے، دو چار چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔بیر بھٹی کی آبادی تین سو فٹ ملبہ اوڑھے ٹھنڈی پڑی سو رہی ہے، سامنے مخمور کالا پہاڑ ڈھیڑ میل دو ہزار فٹ لمبا کتھئی بھورا دہانہ پھاڑے جمائی سی لے رہا ہے، لمبی چوڑی جمائی ہے۔کچھ عرصہ لگے گا۔پانچ سو برس میں پھر اس دہانے کو گھنے جنگل اُگ کر ڈھانک لیں گے۔"

"اور یہ وقت کی معتدل رفتار کے ساتھ ہوگا اور قانونِ قدرت کے عین مطابق ہوگا اور حسبِ معمول ہوگا۔لینڈ سلائڈ کی رات جو کچھ ہوا وہ بھی کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔فردوس کا ٹیچ کی کیا بساط، بیر بھٹی کی چھوٹی سی بستی کی بھی کیا بساط۔بڑے بڑے شہروں کو مٹّی ڈھانپ لیتی ہے اور اُس مٹّی پر مٹّی جمتی ہے۔یہ وقت کے معمولی کام ہیں۔غیر معمولی بات صرف یہ ہے کہ جو کام وقت صدیوں میں انجام دیتا ہے وہ اس نے لینڈ سلائڈ کی رات ساعتوں میں انجام دے دیا۔اس لیے کہ اس رات برسوں کے بجائے، سکنڈوں بلکہ پلوں حالت بدل رہی تھی۔گویا اس رات چکّی تیز چل رہی تھی۔"

کہا جا سکتا ہے کہ اس افسانے کے پلاٹ کا نقطۂ عروج لینڈ سلائڈ کے وقت تباہی کا منظر ہے جس میں رفیق حسین نے انسان، جانور، جنگل اور پہاڑ کو اس طور پر استعمال کیا ہے کہ جس سے قاری کے ذہن میں فنا کا تصور پیدا ہو جاتا ہے۔

اب ہم "آئینہ حیرت" کے اس افسانے کا مطالعہ کرتے ہیں جہاں زندگی کی جستجو میں ایک جاندار اپنی محبوبہ کو غذا بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے تو دوسری طرف ایک اور جاندار اپنی شریکِ حیات کو موت سے بدتر زندگی جینے پر مجبور کرتا ہے۔ دو قسم کے جانداروں کی زندگیوں سے تعمیر کی گئی یہ کہانی ہمارے اندر موجود اخلاقی زوال کو پیش کرتی ہے۔اس میں سماج کے عزت دار طبقے کی داخلی زندگی کے کرب کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔مزید گفتگو سے قبل اس افسانے "شیریں فرہاد" کا خلاصہ ملاحظہ کیجیے:

"نئی روشنی اور اونچی سوسائٹی کے دلدادہ اقبال احمد کی سیدھی سادی بیوی نسیمہ نے ایک بلّی پال رکھی تھی۔اقبال احمد بلّی پالنے کا مخالف ہے۔اور جب ایک بلاّ گھر میں آنے لگتا ہے تو اقبال احمد اس بلّے کو طرح طرح کی سزائیں دیتا ہے۔ترقی پا کر اقبال احمد کو نسیمہ اپنے شایانِ شان نہیں معلوم ہوتی، وہ دوسری شادی کر لیتا ہے اور دوسرے گھر میں رہنے لگتا ہے، نسیمہ بھی بلّی کو ساتھ لے کر میکے روانہ ہو جاتی ہے، لیکن اسٹیشن پر بلّی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور کتّوں سے ڈر کر سیدھے اپنے ٹھکانے پر واپس آتی ہے، جو نسیمہ کے واپس جانے پر ویران پڑا ہے۔دوسرے دن اقبال احمد گھر میں آتا ہے اور اس کا سامان اٹھانے رکھنے لگتا ہے، بلّی اور بلاّ ایک دوسرے کمرے میں بھاگتے پھرتے ہیں۔اقبال احمد گھر کے سارے کمروں کو مقفل کر کے چلا جاتا ہے۔بلّی اور بلاّ انہیں میں سے

ایک کمرے میں بند رہ جاتے ہیں۔ کچھ دنوں میں دونوں بھوک سے مرنے لگتے ہیں۔ آخر بھوک سے بیتاب ہوکر فرہاد (بلاّ) شیریں (بلّی) کو اپنی غذا بنا لیتا ہے۔ اسی دن گھر کے دروازے ایک بار پھر کھولے جاتے ہیں، بلاّ باہر نکل جاتا ہے، تندرست ہوجاتا ہے اور عرصے تک اپنی محبوبہ شیریں کو آواز دیتا پھرتا ہے۔"

اس افسانے میں رفیق حسین نے شیریں (بلّی) اور فرہاد (بلاّ) کی مثالی محبت کے درمیان بھوک کی لکیر کو کھینچ کر اصول زندگی اور محبت کے معنی کو بدل دیا ہے۔ بھوک کے سبب اپنی محبوبہ کے گرم گوشت سے اپنے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرنا اتنا آسان نہیں، جتنا کہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ اس کرب کو رفیق حسین کے درج ذیل اقتباس سے محسوس کیا جاسکتا ہے:

"فرہاد اب بھی آدھ آدھ گھنٹے بعد نحیف "عععاَ" کی آواز نکالتا تھا۔۔۔ انہیں آخری دم کے سنبھالوں میں اس نے چاروں طرف دیکھا تو ایک طرف گوشت کا چھوٹا سا ڈھیر معلوم ہوا۔ پچھلے پیروں کو زمین پر گھسیٹتا ہوا، اگلے پنجوں کے سہارے آگے کھسکتا بڑھا، مگر وہاں کیا تھا، دھوکا تھا، گوشت نہ تھا۔ اس کی محبوبہ شیریں کا خشک ڈھانچہ، آخری اور کمزور سانسیں اب بھی لیتا ہوا موجود تھا۔ ہاں شیریں، وہی شیریں تھی، اس کو دیکھا سونگھا، گھوما اور پھر انچوں انچوں پنجوں سے نڈھال دھڑ کو گھسیٹتا دروازے کی دراڑ تک آیا اور پڑ گیا۔۔۔ اور پھر جب ہوش آیا تو گوشت کی بو آرہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو شیریں کا تنِ لاغر اب بھی بقیدِ حیات تھا۔ دفعتاً" فرہاد کے نامکمل حیوانی دماغ نے شیریں اور غذا دونوں کو ایک ہی نقطۂ خیال میں وابستہ کردیا۔ ایک ایک انگل آہستہ آہستہ اس نے اپنا سر بڑھایا، جبڑا کھولا اور شیریں کا گلا دبا دیا۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں، فرہاد کو دیکھا اور آخری مرتبہ خفیف سی "مآوں" کی آواز نکالی۔"

دیکھا جاسکتا ہے کہ سپرایگو کے ذریعے فرہاد کو سامنے پڑی نڈھال شیریں ایک گوشت کا لوتھڑا دکھائی دینے لگتی ہے کیونکہ وہ اب وہی دیکھنا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے شیریں کے گلے کو اپنے دانت سے دبایا اور اپنی بھوک مٹائی۔ لیکن شیریں کے گرم خون اور نرم گوشت کا نشہ کب تک رہا اور پھر فرہاد پر کیا گزری وہ بھی دیکھ لیجیے:

"طویل فاقے کے بعد شکم پُر فرہاد نشے کی حالت میں ایک صندوق پر بیٹھ کر نیند کے جھونکے لینے لگے اور ابھی اسی حالت میں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ باہر میں کھٹ پٹ ہوئی۔ اقبال احمد اور چند ملازموں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ اس کمرے کی کنڈی کھٹکی، دروازہ کھلا، تھکے، نشے میں چور کمزور اور پیٹ پھولے ہوئے فرہاد با دلِ ناخواستہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ڈگمگاتے، جھومتے، آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل زینے پر سے ہوتے ہوئے کوٹھے پر چل دیے۔۔۔ عقل اور حافظے سے مجبور فرہاد۔ اس واقعے کے بعد مدتوں شیریں کو کوٹھوں کوٹھوں، گلیوں گلیوں اور گھروں گھروں تلاش کرتا پھرا۔"

ایسی نازک صورتِ حال میں ایک جاندار سے جہاں تک ممکن ہوسکا اپنے محبوب کو غذا بنانے سے خود کو روکے رکھا اور آخری لمحے تک بے پناہ محبت کی نظروں سے اسے دیکھتا رہا لیکن جن حالات نے فرہاد کو شیریں کا گلا دبانے پر مجبور کیا وہ نہ صرف یہ کہ کوئی جاندار کرسکتا ہے بلکہ کوئی بھی کرسکتا ہے۔ اس افسانے میں موجود ایک خاتون کردار نسیمہ ہے جس کی زندگی شیریں (بلّی) سے بدتر نظر آتی ہے۔ جی ہاں نسیمہ کو اخلاق (نسیمہ کا شوہر) ایک ایسی زندگی جینے کو مجبور کرتا ہے، جہاں معاشرے کا ہر فرد اسے نوچ کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سب کا ذمہ دار صرف اور صرف اخلاق ہے۔ یہاں بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ انسان کہا جانے والا یہ جاندار کسی اور جاندار سے بہتر نظر نہیں آتا بلکہ حیوانیت میں اس سے دو قدم آگے ہی دکھائی دیتا ہے۔

اب ہم رفیق حسین کی اس افسانوں دنیا کی طرف چلتے ہیں جہاں سب کچھ نمائشی اور دکھاوا ہونے کے باوجود زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس افسانوی دنیا میں ہمیں دو ایسے "بے زبان" ملتے ہیں۔ جو سرکس کی دنیا کے ماہر فنکار سمجھے جاتے تھے۔ ایک منھ زور اور ضدّی گھوڑی اور دوسرے اس پر سواری کرنے والی ایک خوبصورت لڑکی۔ جس کے کرتب کو دیکھنے کے لیے جوان، بچے اور بوڑھے دور دور سے آتے تھے۔ انہیں میں ایک شوقین مزاج بوڑھا رئیس (نواب محمود علی خان) بھی ہوتا ہے جو اس خوبصورت لڑکی پر لبلوٹ ہوجاتا ہے۔ لڑکی کو اپنی بیگم بنانے اور محل میں داخل کرنے کے لیے، سرکس کے منیجر کو بڑی رقم دے کر خرید لیتا ہے۔ گھر لانے کے بعد رئیس پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ میک اپ کی بھاری بھرکم تہوں کے نیچے ایک بھیانک صورت والی بے زبان (گونگی) لڑکی ہے، نواب کو اس سے شدید نفرت ہوجاتی ہے، لیکن بدنامی کے خوف سے خاموش رہتا ہے اور لڑکی کو اپنے باورچی کے سپرد کردیتا ہے، جہاں وہ نوکرانی کی طرح کام کرتے کرتے، وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہوجاتی ہے۔ ادھر گھوڑی کو سرکس والوں نے ایسی تربیت دے رکھی تھی کہ وہ اس گونگی لڑکی کے سوا کسی اور کو اپنی پیٹھ پر بیٹھنے نہیں دیتی۔ لڑکی کے جانے کے بعد اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا، اس پر طرح طرح کے ظلم کیے جاتے، یہاں تک کہ وہ مریل گھوڑی بن کر رہ گئی۔ عاجز آکر سرکس والے اسے نیلام کردیتے ہیں اور پھر وہ یکّے میں جوت دی جاتی ہے۔ یہ دونوں بے زبان اپنی اپنی جگہ اکیلے، ستم رسیدہ اور خاموش ایک دوسرے کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

مدّتوں بعد ایک دن وہ لڑکی اسی یکّے پر بیٹھتی ہے جس پر سرکس کی گھوڑی جُتی ہوئی تھی، یکا یک اس گونگی لڑکی کی آواز سن کر گھوڑی پر ایک جوش طاری ہوجاتا ہے اور وہ خود کو چھڑا کر یکّے کے گرد پاگلوں کی طرح چکّر کاٹنے لگتی ہے، گونگی بھی اسے پہچان لیتی ہے، اس پر بھی ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ یکّے سے کود کر سرکس کے دنوں کی طرح گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر سوار ہوجاتی ہے، گھوڑی اسے لے کر سرپٹ بھاگتی ہے اور میلوں بھاگتی چلی جاتی ہے، آخر دونوں زمین پر گرتے ہیں اور زخم کھا کر مرجاتے ہیں۔ بقول نیّر مسعود:

"ان میں سے کسی بھی رنگ میں جزئیات کے رنگ بھر کر کوئی معمولی افسانہ نگار بھی اچھا خاصہ افسانہ، اچھا افسانہ نگار بہت اچھا افسانہ لکھ سکتا ہے۔ لیکن رفیق حسین سے بہتر افسانہ نگار بھی ان نقشوں پر رفیق حسین سے بہتر افسانہ نہیں لکھ سکتا، کیونکہ جزئیات کے انتخاب میں وہ رفیق حسین سے مات کھا جائے گا۔ یہ اس لیے کہ ان افسانوں کے نقشے اور ان نقشوں کے جزئیات دونوں ہی ایک دماغ کے ساختہ ہیں اور اس لیے دونوں ایک ساتھ سانس لیتے معلوم ہوتے ہیں اور اس طرح ہم پیوست ہیں کہ اعتماد کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ رفیق حسین نے ان افسانوں کے نقشے پہلے تیار کیے تھے یا ان کے جزئیات۔ اسی لیے کے ان افسانوں کو پڑھ کر ذہن اس سوال میں الجھتا ہے کہ یہ جزئیات ان نقشوں کے لیے بنائے گئے ہیں یا یہ نقشے ان جزئیات کے مطابق تیار کیے گئے ہیں۔"

افسانے کی تلخیص اور رفیق حسین کے افسانوں کی جزئیات کی تشخیص میں نیّر مسعود نے جس فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے وہ انہیں جیسے افسانہ نگار سے ممکن ہے، کیونکہ ایک اچھا افسانہ نگار ہی کسی اچھے افسانے کی بہترین جزئیات نگاری کی تشخیص کر سکتا ہے۔ نیّر مسعود نے اپنی افسانوی دنیا میں موجود جزئیات کے لازمے کو نظر میں رکھتے ہوئے رفیق حسین کے افسانوں کا مطالعہ کیا ہے۔

اس افسانے میں دو بے زبانوں کی کہانی ایک سرکس کے ذریعے ہمارے سامنے آتی اور دونوں ہی اس کے اہم کردار ہیں، ان دونوں کو الگ الگ وقتوں میں بیچ دیا جاتا ہے۔ دونوں کے ساتھ ان کے مالکوں کا رویّہ ظالمانہ ہے، ایک گھر کے اندر جوتی جاتی ہے اور دوسری گھر کے باہر۔ یہ دونوں شدّت سے جوتے جاتے ہیں۔ نافرمانی کے سبب انہیں مزید ظلم اور تشدّد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب یہی گونگی لڑکی سرکس میں اپنے ہُنر اور اپنی خوبصورتی کا جلوہ دکھاتی تو ناظرین عش عش کرتے نظر آتے:

"وہ ایک مجسّم شباب تھی، اس کی ہر بات میں شوخی تھی، شرارت تھی، ہاتھوں میں پھڑک تھی، پیروں میں تھرک تھی، گردن میں لچک تھی، آنکھوں میں چمک تھی۔ دنیا اس کو تکتی تھی اور وہ بے خبر تھی۔ ہنٹر گھماتے گھماتے ایک دفعہ وہ لپکی، سپاٹے بھرتی گھوڑے پر ہاتھ لگاتے ہی بجلی کی پھرتی سے سوار ہوگئی، دونوں ہاتھوں سے کھلے ہوئے بالوں کو سنوارا اور پھر بھاگتی گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر کھڑی ہو گئی۔"

گونگی لڑکی اور بے زبان جانور کا آپس میں اس طرح گھلنا ملنا، ایک دوسرے کے اشاروں کو سمجھنا اور ان کی بے پناہ محبتوں کو افسانہ نگار نے جس خوبصورتی سے اپنے افسانے میں پیش کیا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نیّر مسعود نے جو کہا ہے وہ بالکل بجا ہے کہ "نقشے جزئیات کے مطابق بنائے گئے ہیں یا جزئیات نقشے کے مطابق تیار کیے گئے ہیں"۔ سرکس کے بعد کس طرح سے رفیق حسین نے ان دونوں کی زندگیوں کا نقشہ کھینچا ہے اسے دیکھ کر نیر مسعود کے قول کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے۔ بے زبان کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

"جاڑے جاتے ہیں بہاریں آتی ہیں، جنگ پر جنگ، صدیاں آتی اور جاتی ہیں، قوموں پر قومیں آتی ہیں، نسلوں پر نسلیں جاتی ہیں پر یہ بیٹھی بیٹھی تکتی ہیں اور ہم آندھی کے تنکے اب اُڑے، جب گرے، پل بھر ہی اُڑتے ہیں، پھر بھی قسمت کے مارے الفت و محبت، یاس و حسرت، آرزو اور تمنّا کا گھروندا یعنی لپ لپ کرتا دل پہلو میں لیے پھرتے ہیں۔ اتفاق نے اکٹھا کر دیا مل گئے، حادثات نے جدا کر دیا الگ ہو گئے۔ نہ اس کا کوئی گھر نہ دوار، سرکس کی زندگی کیا تھی، صبح کا خواب تھا، چونکے تو کچھ نہ تھا۔ گھوڑی کے لیے یکّہ تھا، یکّے والا تھا، کانپور کی سڑکیں گلیاں تھیں۔ ادھر لڑکی کے لیے چولھا تھا، برتن تھے، سِل تھی اور بٹا تھا اور دو بیبیوں کی خدمت تھی۔ مصالحہ پیسنا، برتن مانجھنا، کھانا پکانا، گھر بھر کو کھلانا، بچا کھچا خود کھانا اور پھر اسی کو دہرانا، یہی زندگی تھی۔"

دونوں کی دوبارہ ملاقات کا بھی عجب واقعہ ہوا۔ کالے خان اپنی بیوی کے ساتھ گونگی لڑکی کو لے کر یکے پر سوار ہو، بازار جاتا ہے اور ایک دوکان سے دو زنانے گرگابی جوتے لا کے پردے کے اندر سرڈال کے بیوی کو دکھاتا ہے، دونوں جوتوں میں سے ایک پسند آیا، میاں جوتے لے کر پھر دوکان کی طرف چلے بیوی کی نیت اس جوتے سے اُس جوتے پر ڈانواڈول ہوئی، گونگی کو اشارہ کیا، بلا میاں کو بُلا۔ وہ بے چاری اپنی زبان میں چلّائی "آ آ واوا! وا آ واوا!" پر مردہ دل گھوڑی نے مدّتوں بعد پھر وہی آواز سنی، وہی آواز جو کبھی محبتوں کا پیغام ہوا کرتی تھی۔ وہ آواز جس سے زندگی کی گزری ہوئی مسرّتیں وابستہ تھیں۔۔۔ اس نے ایک دفعہ ہنہنا نیکی تڑپ ماری، جال میں پھنسے ہوئے جنگلی ہرن کی طرح وہ تڑپی اور پھڑکی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ گونگی پردے کا ایک کونا ہٹائے، یکّے کا ڈنڈا پکڑے، خاموش بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس وقت اپنی پرانی دنیا کو پھر ایک دفعہ زندہ ہوتے دیکھا۔ اس کے مردہ ہاتھ پیروں میں ایک روح سی دوڑی۔ وہ پردے ہٹا، یکّے سے کود، سڑک پر لمحے بھر کھڑی ہوئی اور پھر ہزاروں ششدر آدمیوں کے سامنے وہ لاغر اور ادھیڑ عمر کی عورت گھوڑی کی طرف لپکی اور اچھل کر اس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔ اور گھوڑی تیر کی طرح یہ جا وہ جا نکلی چلی گئی۔

اس افسانے میں بھی ہمیں وہی سب کچھ نظر آتا ہے جو ان کے دوسرے افسانوں میں موجود ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ یہاں پر لڑکی اور گھوڑی دونوں ہی بے زبان ہیں اور دونوں کی جبلّی قوتیں اور انسٹنکٹ سماجی اور اخلاقی بندشوں سے آزاد ہیں۔ اگر اس موقعے پر خود کو مہذب سمجھنے والا انسان ہوتا تو وہ حالات اور معاشرے کے جبر کی بندشوں میں خود کو جکڑا ہوا محسوس کرتا اور ایسے موقعے پر ایک دوسرے سے کترا کر نکل جاتا۔ لیکن ان دونوں بے زبانوں نے حالات کی جکڑ بندیوں سے خود کو آزاد کر کے دائمی مسرّت حاصل کر لی۔

المختصر یہ کہ رفیق حسین نے اپنے تمام افسانوں کی بنت میں جس قسم کی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے وہ انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور اپنے فن کا بانی اور خاتم بناتی ہے۔

۔ڈرامہ۔

خواب ہی تو ہے

محمد اسداللہ
(ناگپور، بھارت)

کردار

ناظم، فواد، عرفان، پہلا فرشتہ (دربان۔۔ دروازے پر کھڑا رہ کر اعلان کرنے والا)، خاص فرشتہ (دو ماتحت فرشتوں کے ساتھ کرسی پر)، پہلا ماتحت فرشتہ، دوسرا ماتحت فرشتہ، پہلا مددگار فرشتہ، دوسرا مددگار فرشتہ، مرزا غالب، سمیر (چائے والا)، چنگیز خان (ڈاکو)، قتیل شفائی (ڈاکٹر)، تماشائی، سرفراز پٹیل۔

منظر

معمولی قسم کا ایک کمرہ جس میں ایک ٹیبل اور دو صوفے رکھے ہوئے ہیں۔ ناظم داخل ہوتا ہے۔ ادھر ادھر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ ایک ایک چیز اٹھا کر رکھتا جاتا ہے اور بڑبڑاتا ہے۔

ناظم: افوہ! کس قدر افراتفری ہے یہاں! سارا کمرہ بکھرا پڑا ہے۔ کتنے لوگ رہتے ہیں اس گھر میں مگر کسی کو اپنی ذمے داری کا ذرا احساس جو ہو۔ اب سارے کام مجھ ہی کو کرنے ہوں گے۔ محترمہ بیگم صاحبہ کو تو میں کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ ان کی آفس کی ڈیوٹی ہے کہ میرے منہ پر پڑا ہوا تالا!

فواد: (داخل ہوتا ہے) السلام علیکم

ناظم: وعلیکم السلام، معاف کرنا بھئی فواد! گھر کا حال دیکھ رہے ہو۔۔۔ مجھ سے بھی برا ہے۔۔ یہاں ہر شخص منہ اٹھائے چلا آتا ہے، آرام کرتا ہے اور چل دیتا ہے۔ گھر کی دیکھ بھال سے، اس کے بھلے برے سے یہاں کسی کو کوئی سروکار نہیں، ہر ایک نے گھر کو سرائے سمجھ رکھا ہے۔

فواد: یہ تو بہت اچھی بات ہے۔

ناظم: ایں! کیا کہا تم نے تمہارا دماغ تو ٹھکانے پر ہے، ذرا دوبارہ کہنا۔ یعنی یعنی، تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ سب لوگوں کو گھر کو سرائے سمجھنا چاہیے؟

فواد: جناب! نہ صرف یہ گھر، یہ ملک بلکہ ساری دنیا ایک سرائے ہے۔ یہ حقیقت اگر سمجھ میں آجائے تو سارے انسانوں کی زندگیاں بدل جائیں۔

ناظم: بہت فلسفیانہ باتیں کرنے لگے ہو! کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟

فواد: یہ سب۔۔۔، میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ کل ایک مولوی صاحب بیان میں فرما رہے تھے۔ ویسے ان کی بات سچ ہی تو ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں ایک دن ایسا آنے والا ہے جب وہ اس سرائے فانی کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا، ایک ایسی دنیا میں جو اس کے لیے بالکل اجنبی ہے۔

ناظم: کیا بات ہے یار! تم کچھ پریشان نظر آرہے ہو۔ کیا پھر کوئی نئی مصیبت گلے لگا لی؟

فواد: مصیبتیں گلے پڑتی ہیں، انھیں گلے لگاتا کون ہے؟

ناظم: نہیں نہیں۔۔ دنیا میں ہوتے ہیں، کچھ لوگ، ایسے بھی۔۔۔، جنھیں یہ شوق ہوا کرتا ہے اور تم۔۔۔

فواد: مگر جناب! میں ان میں سے نہیں ہوں۔

ناظم: لگتا ہے تم اپنے کالج میں ہونے والے اپائنٹمنٹ کے سلسلے میں پریشان ہو۔

فواد: کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔

ناظم: تم تو وہاں کے پرنسپل ہو تمھیں کیا پریشانی ہے؟

فواد: پرابلم یہ ہے کہ انٹرویو کی تاریخ کا اعلان نہیں ہوا اور لوگ ابھی سے اس طرح ٹوٹے پڑ رہے ہیں جیسے مردے پر گدھ جھپٹتے ہیں۔

ناظم: تم اپنے زندہ ہونے کا ثبوت کیوں نہیں دیتے۔ بحیثیت پرنسپل تمہاری رائے سب سے اہم ہے۔

فواد: مینجمنٹ نامی انجمن آرا کے سامنے میری رائے کی کیا اہمیت ہے۔ مگر ہاں۔۔۔ میں کسی اسامی کے لیے رستہ ہموار کر سکتا ہوں۔ اور اگر میں اڑ جاؤں تو کھیل بگاڑ بھی سکتا ہوں۔ لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں، اسی لیے سرفراز پٹیل نے ان دو اسامیوں کے تقرر کے لیے ایک بھاری رقم میرے سر پر لا کر پٹخ دی ہے۔ وہی میری پریشانی ہے۔

ناظم: لات مارو ایسی حرام کی کمائی کو، دے مارو اسی کے منہ پر، پہلی بات تو یہ کہ تم نے وہ رقم قبول ہی کیوں کی؟ سرفراز تو ایک دلال ہے، تم سے کام کروائے گا اور بیچ میں اپنا کمیشن بنائے گا۔

فواد: ارے میں نا نا کہتا ہی رہ گیا وہ نوٹوں سے بھرا بریف کیس چھوڑ کر چلا گیا۔ تمہاری 'نانا'۔۔۔، مجھے پتہ ہے۔ (عرفان داخل ہوتا ہے)

عرفان: السلام علیکم انکل! اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا آج شام میرے اسکول میں ڈرامے کا کمپٹیشن ہے۔ ایک ڈرامے میں میں بھی کام کر رہا ہوں۔ آپ کو آنا ہے پلیز!

فواد: ساری عرفان، میں نے تمھیں فون پر بتایا تھا نا کہ آج شام مجھے اپنی فیملی کے ساتھ کہیں جانا ہے۔

عرفان: وہ کچھ نہیں انکل، آپ میرے لیے اتنی سی قربانی نہیں دے سکتے۔

ناظم: ہاں ہاں فواد! ان کے لیے اپنی فیملی کو قربان کرو، ان کے اسکول جا کر ان کا ڈراما ضرور دیکھو اور پھر اپنے گھر آکر دوسرا ڈراما بھی دیکھ لینا۔ اپنی فیملی کا ڈراما۔

عرفان: دیکھیے آپ انھیں بہکا رہے ہیں۔ انکل پلیز آپ کو آنا ہے یعنی آنا ہے۔

فواد: اچھا اچھا دیکھتا ہوں۔

عرفان: انکل! مجھے آپ کا انتظار رہے گا۔(جاتا ہے)

ناظم: تو۔۔۔یہی ہے نا تمہاری 'نانا' میاں! ایسی پھسپھسی نانا گری سے کام نہیں چلے گا، دادا گری دکھاؤ دادا گری سمجھے! مانا کہ آپ نے اردو میں ایم اے کیا ہے، ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے۔ڈھیر سارا ادب پڑھ رکھا ہے، مرزا غالب کے آپ زبردست مداح ہیں۔پھر بھی آپ کو ایک چیز سیکھنے کی ضرورت ہے۔

فواد: اب سیکھنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟

ناظم: فواد صاحب! آپ 'نہیں' بولنا سیکھیے ورنہ یہ دنیا آپ کو حلوہ سمجھ کر کھا جائیگی۔جو کام آپ کو نہیں کرنا چاہیے، اس کے لیے کہئے 'نہیں'۔۔دل نا کہہ رہا ہو تو اے مروت کے مارے آدمی! ہاں مت کہو، بے خوف کہو، 'نہیں'۔نہ کسی کا لحاظ کرو، نہ کسی سے ڈرو، ہمت کے ساتھ کہو 'نہیں'۔

فواد: ہاں، ٹھیک ہے۔

ناظم: ہاں۔۔۔پھر وہی ہاں۔کب سدھرو گے؟ (دونوں ہنستے ہیں) ۔۔۔فواد! نہیں بولنا اتنا آسان نہیں ہے۔تمہیں پتہ ہے جنت کیا ہے؟

فواد: کیا ہے؟

ناظم: برائیوں، گناہوں اور باطل طاقتوں سے انکار کرنے یعنی انھیں نہیں بولنے کا انعام ہے جنت! سمجھے۔

فواد: واہ! کیا بات ہے، زبردست۔

ناظم: ہاں تو تمہیں اس شخص نے جو رشوت دی ہے اس سے بھی انکار کرنا ہے تمہیں۔یعنی 'نہیں' کہنا ہے۔اس میں کیا دقت ہے؟

فواد: میں وہ رقم لوٹا سکتا ہوں اور ایسا ہی کروں گا مگر سرفراز وہی رقم اوپر والوں کو دے کر انھیں سیٹ کرے گا۔ان پر دباؤ بنا کر اپنا مقصد پورا کر لے گا، پھر مجھے زندگی بھر ان دونوں ٹیچرس کو ذلت اور بے بسی کے ساتھ جھیلنا پڑے گا۔اوپر والوں کے کسی کینڈیڈیٹ کو آپ آنکھ تک نہیں دکھا سکتے۔ناظم! میں ایک ایسی سرنگ میں پھنس گیا ہوں جہاں سے نہ آگے بڑھ سکتا ہوں نہ پیچھے مڑ سکتا ہوں۔

ناظم: گھبراؤ نہیں اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔

فواد: جو لوگ اعلیٰ عہدوں پر پہنچتے ہیں، ان کا یہ مقدر ہو گیا ہے کہ برائیاں قدم قدم پر انھیں دعوت دیتی ہیں۔ناجائز مال کمانے کے مواقع انھیں خوش آمدید کہتے ہیں۔اب اکثر لوگ اسی لالچ میں ادھر آتے ہیں۔قوم کی خدمت کا جذبہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔جو ایماندار بن کر قوم کو سنوارنا چاہتے ہیں انھیں بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔میں نے ان گناہوں سے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔

ناظم: اب کیا گرو گے۔

فواد: اسی ذلت اور رسوائی کی قیمت پر مجھے یہ سودا کرنا ہوگا، میں اس غلط راستے پر ہرگز آگے نہیں بڑھ سکتا؟

ناظم: اور سنا ہے تمہاری بہن رضیہ بھی آئی ہوئی ہے؟

فواد: ہاں! وہ بھی میرے لیے ایک آزمائش ہے۔اس کے سسرال والوں نے اسے اکسا دیا ہے کہ ہم سے وہ والد صاحب کی جائداد میں سے اپنا حصہ مانگے۔

ناظم: وہ تو تمہیں وراثت کی تقسیم کے وقت ہی دے دینا چاہئے تھا۔

فواد: اس کے لیے میں تیار تھا، میرے دوسرے بھائی راضی نہیں تھے۔اب اگر میں اپنے حصے سے دوں تو اتنی رقم بنتی ہے جتنے میں اپنا گھر بنانے کے لئے میں نے پلاٹ خرید رکھا ہے۔ناظم! اپنا خود کا گھر ہو، یہ خواب ہے، عظمیٰ کا، میں ایک کالج کا پرنسپل ہونے کے باوجود اس شہر میں اپنا گھر تک نہیں بنا سکا۔کئی مسائل اس خواب کی تعبیر کے راستے میں کھڑے ہیں۔مگر۔۔۔فی الحال میری پریشانی ایک دوسرا ہی خواب ہے۔

ناظم: واہ! ابھی ایک خواب پورا نہیں ہوا اور دوسرا دیکھنے لگے۔

فواد: یہ وہ خواب نہیں ہے جو ہم دن میں دیکھتے ہیں۔یہ نیا خواب میں نے کل رات دیکھا۔اپنا انجام سوچ کر میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔

ناظم: ایسا کیا دیکھ لیا؟

فواد: بہت طویل خواب ہے یار۔۔بہت ہی طویل۔

ناظم: خواب دیکھا یا فلم 'میرا نام جوکر'، دیکھ لی؟

فواد: ہاں تو سنو! میں نے دیکھا۔۔۔۔۔میں نے دیکھا۔۔۔۔

(اسٹیج کی روشنیاں گل ہو جاتی ہیں۔دھیرے دھیرے شور بڑھنے لگتا ہے۔)

(اندھیرے میں لوگوں کی چیخ پکار سنائی دیتی ہے دھیرے دھیرے شور بڑھتا جاتا ہے۔دو آوازیں ابھرتی ہیں۔)

ایک آواز: ارے میں کہاں ہوں؟ ہائے! یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیسا شور ہے یہ؟

دوسری آواز: لگتا ہے قیامت آ گئی ہے۔یا خدا!

پہلی آواز: اپنی قبروں سے اٹھ اٹھ کر کہاں جا رہے ہیں یہ لوگ۔یہ ہمیں کس نے جگا دیا۔

دوسری آواز: لگتا ہے دنیا ختم ہو گئی۔حشر قائم ہوگا، اب حساب کتاب ہوگا۔

پہلی آواز: یہ قیامت کیوں آ گئی؟

دوسری آواز: دنیا ختم ہو گئی۔خدا نے دنیا کا کھیل ختم کر دیا۔

پہلی آواز: مگر کیوں؟

دوسری آواز: کیا تم نے مرنے سے پہلے سنا نہیں تھا کہ ایک دن دنیا ختم کر دی جائے گی۔اس دنیا میں شاید ایک بھی بھلا آدمی بچا نہیں تھا۔بے ایمانوں سے بھر گئی تھی وہ دنیا۔

پہلی آواز: اب ہمارا کیا ہوگا؟ کہاں جائیں گے ہم؟

(اسٹیج پر دھیرے دھیرے روشنی بڑھتی ہے۔ایک میدان کا منظر ہے۔تین فرشتے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے سامنے ٹیبل پر پڑی فائلوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ایک فرشتہ پیچھے کھڑا ہے۔دروازے کے قریب کھڑا ہوا ایک فرشتہ بہ آوازِ بلند اعلان کرتا ہے۔)

پہلا فرشتہ: سنو، اے اولادِ آدم! دنیا کی ابتدا سے انتہا تک کے انسانوں، سنو!

''چہارسُو''

ایک ضروری اعلان! قیامت قائم ہوچکی ہے اوراب حشر برپا ہونے جارہا ہے۔ اپنی قبروں سے باہر نکل آؤ!

آگاہ ہو! خدائے عزوجل نے اُس دنیا میں تمہیں ایک خاص مدت تک کے لیے بھیجا تھا، وہ دارِفانی، دارالعمل تھا اور یہ میدانِ محشر، دارُالجزا ہے۔ آج یہاں سب کے ساتھ انصاف ہوگا تمہارے نیک و بد کے مطابق جزا وسزا کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ نیکوکاروں کو خدا جنت کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے گا اور بدکار جہنم واصل ہوں گے۔

یہاں فیصلے کے لئے الگ الگ عدالتیں ہیں۔ خدا کے حقوق کی عدالت اور بندوں کے حقوق کی عدالت! روزِازل سے روزِآخر تک کے انسانوں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اپنے انجام کو جاننے کے لیے بے قرار ہے۔ انسانوں کے اس اژدھام کے پیشِ نظر فرشتوں کی ایک ذیلی کچہری قائم کی جارہی ہے۔ آپ اپنے مقدمات یہاں بھی پیش کرسکتے ہیں مگر آخری فیصلہ تو خدا ہی کے حضور میں ہوگا۔ یکے بعد دیگرے آیئے! قطار میں آیئے! یہ دنیا نہیں ہے، بے اصولی نہ اختیار کریں ورنہ بے بھاؤ کی پڑے گی۔ اس کچہری کا پہلا مقدمہ شروع کیا جاتا ہے۔

شاعرِاردو زبان مرزا غالبؔ حاضر ہوں! (مرزا غالبؔ اپنے مخصوص لباس میں حاضر ہوتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھے فرشتوں میں سے درمیانی فرشتہ غالبؔ سے سوالات کرتا ہے)

خاص فرشتہ: آیئے! تشریف لایئے بڑے میاں، (غالبؔ کی فائیل دیکھتے ہوئے) آپ کی تعریف!

غالبؔ:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

دوسرا ماتحت فرشتہ: (فرشتہ غالبؔ کا اعمال نامہ الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے اسے سونگھتا ہے) جناب! آپ کے اعمال نامے سے یہ کیسی مہک آرہی ہے، افوہ! کیا ساری عمر پیتے ہی رہے؟

غالب:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

پہلا ماتحت فرشتہ: تو گویا زندگی میں شراب سے کبھی توبہ کی ہی نہیں؟

غالبؔ:

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ماہتاب میں

خاص فرشتہ: غالبؔ صاحب! آپ کا جنت میں جانا تو بڑا مشکل نظر آتا ہے، آپ کے اعمال نامے میں بہت گڑ بڑ ہے۔ نہ نماز نہ روزے، مزید یہ شراب اور جوا۔۔۔،

غالبؔ:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا ؟

پہلا ماتحت فرشتہ: اوہ! آپ نے تو ہم پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا۔ اچھا چلیے! مان لیجئے خدا نے آپ کو بخش دیا۔ یہاں سے آپ کو چھٹکارا مل گیا اور آپ جنت میں چلے گئے۔ وہاں جاکر آخر آپ کریں گے کیا؟

غالبؔ:

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں، اگر، واں ہوگئیں

دوسرا ماتحت فرشتہ: استاد! یہ حضرت تو جنت میں جاکر بھی گڑ بڑ کریں گے، یوں بھی دنیا میں کب چین سے رہے ہیں!

غالبؔ:

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

خاص فرشتہ: سبحان اللہ

اس کی امّت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

خاص فرشتہ: افوہ! ظالم نے کیا اشعار کہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کلمۂ طیبہ کا اردو ترجمہ پڑھ رہا ہے، مگر کیا کریں،۔۔۔ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔ یہ تو بڑا پیچیدہ مقدمہ ہے۔ (فرشتوں سے) فرشتو! اسے بڑی عدالت میں لے جاؤ! یہ مقدمہ ہمارے بس کا نہیں اسے تو خدا ہی سمجھے! (دو فرشتے غالبؔ کو لے جاتے ہیں)

(اسی دوران سمیر داخل ہوتا ہے)

سمیر: اے ے ے۔ چائے لو چائے ے ے، گرما گرم چائے، کڑک چائے، میٹھی چائے۔ مزہ نہ آئے تو پیسے واپس گیارنٹی والی چائے۔ چائے لو چائے ے ے

پہلا فرشتہ: (اسے روکتے ہوئے) اے تم کون ہو کہاں گھسے چلے آرہے ہو؟

سمیر: ساب اپن چائے والا، اُدھر ٹرین میں چائے بیچتا تھا، کدھر بھی گھس جاتا تھا اپن کو کوئی روک نہیں سکتا۔ چائے گرم چائے

پہلا فرشتہ: یہاں چائے کیوں بیچ رہے ہو؟

سمیر: اپن ٹرین میں چائے بیچتے بیچتے ہی مرا تھا۔ ایکسیڈینٹ ہوگیا تھا ٹرین کا۔ اسی لیے۔۔ آپ کو دوں کیا؟ بہت کڑک چائے ہے۔

پہلا فرشتہ: بند کرو اپنی یہ بکواس۔ یہ ٹرین کا ڈبہ نہیں، میدانِ حشر ہے۔

سمیر: اچھا آخرت کا حساب چل رہا ہے، چلنے دو نا، اپن کو کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں ذرا ایک دوڈبے کرکے آتا ہوں نا۔ (آگے بڑھتا ہے) اے ے ے۔ چائے لے لو چائے ے ے، گرما گرم چائے، کڑک چائے، میٹھی چائے۔ چائے

لے لو چائے ے ے۔۔

پہلا فرشتہ: ارے رکو! یہ ریلوے پلیٹ فارم نہیں ہے۔ چلو اپنا حساب کرواؤ اور ٹھکانہ پکڑو۔ (اسے پکڑ کر فرشتوں کے پاس لاتا ہے۔ فرشتے اس کا اعمال نامہ دیکھتے ہیں)

پہلا فرشتہ: چنگیز خاں حاضر ہو!

چنگیز خان: (داخل ہوتا ہے)

خاص فرشتہ: (دوسرے فرشتے سے) بتایئے ان کے کیا کارنامے ہیں۔ (فرشتے اس کا نامہ اعمال تلاش کرتے ہیں) (لڑکے کا اعمال نامہ دیکھ کر) اے لڑکے تمہاری نیکیاں اور برائیاں دونوں برابر ہیں۔ اب تمہارا کیا کیا جائے۔ جنت میں بھیجا جائے یا جہنم میں۔

سمیر: ارے ساب اپن تو دھندے والا آدمی ہے۔ ہم کو کیا۔ جدھر بھی دو پیسے کا فائدہ ہو ادھر بیج بھیج دو۔

خاص فرشتہ: (لڑکے کے ساتھ والے فرشتے سے) اسے اعراف میں لے جاؤ۔

سمیر: یہ اعراف کیا ہوتا ہے۔

دوسرا فرشتہ: جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہو جاتی ہیں انھیں اعراف میں بھیجا جاتا ہے۔

سمیر: اپن کے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

مددگار فرشتہ: یوں سمجھ لو کہ تمہارا ٹکٹ آر اے سی R.A.C ہو گیا ہے، جلد ہی کنفرم ہو جائے گا۔ کبھی نہ کبھی جنت میں جاؤ گے۔ اب چلو (پکڑ کر لے جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد واپس آتا ہے)

پہلا ماتحت فرشتہ: تم وہی چنگیز خاں ہو جس نے زمین پر خون خرابہ کیا تھا۔

چنگیز خاں: نہیں ساب وہ ہلاکو نادر شاہ اور چنگیز خاں الگ لوگ تھے میں تو بہت ہی معمولی ساڈاکو تھا۔ امیروں کا مال لوٹ کر کبھی کبھی غریبوں میں بھی بانٹ دیا کرتا تھا۔ اسی بات پر مجھے معافی دے دو!

دوسرا ماتحت فرشتہ: استاد! یہ وہ مشہور بادشاہ چنگیز خاں نہیں ہے مگر یہ بھی اپنے زمانے کا بڑا نامی گرامی لٹیرا تھا۔ دور دور تک اس کی دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں مال دیکھا لوٹ لیتا، مسافروں کے کئی قافلے، باراتیں لوٹ لیں، کئی گھروں میں ڈاکے ڈالے۔ کئی لوگوں کو قتل کر ڈالا۔

پہلا ماتحت فرشتہ: (اسے ایک کاغذ کا پرزہ تھماتے ہوئے) یہ لو تمہارا ٹکٹ۔ جاؤ جہنم میں۔

چنگیز خاں: سرکار ایسا ظلم نہ کیجئے، مجھے چھوڑ دیجئے۔۔۔ مجھ پر رحم کیجئے ۔۔۔ مجھے چھوڑ دیجئے۔

خاص فرشتہ: یہی بات تم سے بے شمار لوگوں نے زندگی میں کہی تھی۔ تم نے کسی کی ایک نہ سنی، آج تمہاری بھی سنوائی نہیں (اسے دھکیل کر دور کر دیتا ہے۔ چنگیز خان ہاتھ جوڑ کر وہیں کھڑا رہتا ہے)

پہلا فرشتہ: (اعلان کرتا ہے) قاتل شفائی حاضر ہو! ۔۔قاتل شفائی حاضر ہو! ۔۔قاتل شفائی حاضر ہو!

ڈاکٹر: (داخل ہوتے ہوئے) میرا نام قاتل شفائی نہیں، ڈاکٹر قتیل شفائی ہے۔

پہلا ماتحت فرشتہ: تم شاعر ہو؟

ڈاکٹر: نہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ میرا نام اس مشہور شاعر سے ملتا ہے مگر مجھے سخت اعتراض ہے اس بات پر کہ مجھے قاتل کہہ کر پکارا گیا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

دوسرا ماتحت فرشتہ: ممکن ہے یہ بھی اتفاق ہو۔۔۔ مگر ہم قبول کرتے ہیں کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر: فرشتے ہو کر غلطیاں کرتے ہو، مجھے تمہارے فرشتے ہونے پر شک ہے۔

پہلا ماتحت فرشتہ: تمہیں تو زندگی میں خدا پر بھی یقین نہیں تھا۔

ڈاکٹر: کیوں نہیں تھا؟۔۔۔ بالکل تھا،۔۔۔، میں پکا مسلمان تھا۔

پہلا ماتحت فرشتہ: اگر خدا اور آخرت پر یقین تھا تو تمہارا اعمال نامہ ایسا بھیانک کیوں ہے۔ لگتا ہے ڈاکٹر کا نہیں کسی جلاد کا اعمال نامہ ہے۔ خیر ڈاکٹر قتیل شفائی۔ کسی کو سردی زکام ہو جائے تب بھی تم دنیا بھر کے ٹیسٹ کروا کر ہر جگہ سے کمیشن حاصل کرتے تھے، نہ غریب دیکھتے نہ امیر، مریض مر جائے تب بھی اسے زندہ بتا کر اس کے رشتے داروں کو لوٹتے تھے۔

دوسرا ماتحت فرشتہ: ڈاکٹر! تمہارے ہر علاج میں جھوٹ اور دھوکہ اس طرح شامل تھا جیسے سیرنج میں دوائی بھری ہوئی ہوتی ہے۔ دنیا کے اکثر ڈاکو امیروں کو لوٹ کر غریب کی مدد کرتے رہے ہیں، تم نے تو غریب امیر کا فرق بھی مٹا دیا تھا۔ تم تو اس سے بھی بڑے لٹیرے ہو جو ابھی ابھی دوزخ کی طرف گیا ہے۔

لٹیرا: (فرشتے کے قریب آ کر) حضور! میں گیا نہیں، یہیں کھڑا ہوں۔

پہلا ماتحت فرشتہ: ہائیں! یہاں بھی چال بازی؟ اچھا! لاؤ تمہاری وہ پرچی، (پرچی دیتا ہے) ڈاکٹر صاحب، یہ رہا آپ کی دوائی کا نسخہ۔ فرشتو! انھیں لے جاؤ۔ (ڈاکو سے) تمہارے مقدمے پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ یہیں کھڑے رہو۔

ڈاکو: جی شکریہ

(ایک آدمی تماشائیوں میں سے نکل کر اسٹیج پر چڑھ جاتا ہے)

تماشائی: رکو! بند کرو یہ ناٹک! Stop it، Stop it یہ کیا تماشا ہو رہا ہے، بند کرو یہ ڈراما! کیا تم لوگ ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو۔ ڈرامے میں قیامت کا منظر دکھایا جا رہا ہے۔ واہ! بہت خوب! کیا قیامت ایسی ہوگی؟ آج تک کسی نے ایسی چیزیں پیش نہیں کیں، تم یہ کیا کر رہے ہو؟ سب جھوٹ اور غلط سلط ہے۔

دوسرا فرشتہ: کیا غلط ہے اس میں؟

تماشائی: غلطی یہ ہے کہ۔۔۔، کیا ہم نہیں جانتے کہ حشر کے دن سارے لوگ اپنی قبروں سے اس حال میں اٹھیں گے کہ ان کے بدن پر ایک کپڑا تک نہیں ہوگا۔ تمہارے سارے کیریکٹر ایک سے ایک کوسٹیوم پہن کر گھوم رہے ہیں۔ ڈاکٹر استھیٹ سکوپ لگائے ہوئے ہے۔ بند کرو یہ جھوٹی ناٹک بازی۔

پہلا ماتحت فرشتہ: صبر صبر! میاں اس قدر غصہ اچھا نہیں۔تمہیں چھوڑ کر یہاں سب کو پتہ ہے کہ یہ ڈراما چل رہا ہے۔اور ڈرامے میں بھی ایک خواب دکھایا جا رہا ہے۔اگر یہ خواب نہ ہوتا اور فرض کرو سچ مچ کی قیامت واقع ہو گئی ہوتی، تو برخوردار! تمہارے بدن پر بھی کچھ نہ ہوتا اور تمہیں اتنی فرصت کہاں ہوتی کہ اس ڈرامے کو اس تنقیدی نظر سے دیکھتے۔

دوسرا ماتحت فرشتہ: دیکھو! ہم سب اس دنیا میں ہیں اور دنیا بھی ایک خواب ہی ہے۔خواب میں سب چلتا ہے۔۔۔اسی لئے دنیا میں بھی کچھ بھی چل رہا ہے۔ اس ڈرامے کے ذریعے ہم، تمہیں (لوگوں کی طرف اشارہ کرکے) اور ان سب کو بھی۔۔۔،ایک بات سمجھانا چاہتے ہیں۔

تماشائی: کون سی بات؟

پہلا ماتحت فرشتہ: ایک بہت ہی اہم بات۔ایک ایسی بات جو نہ سمجھے تو نہ یہاں کے رہے نہ وہاں کے (اوپر اشارہ کرتا ہے) سمجھے؟ نہیں سمجھے!

دوسرا ماتحت فرشتہ: یہ زندگی ایک خواب کی طرح ہے۔ہم سب سوئے ہوئے ہیں۔

تماشائی: کون کہتا ہے ہم سوئے ہوئے ہیں۔ہم سب جاگ رہے ہیں؟

پہلا ماتحت فرشتہ: ’’جاگے ہوئے ہیں خواب میں جاگے ہیں جو ہنوز‘‘

دوسرا ماتحت فرشتہ: ہماری آنکھ اس وقت کھلے گی جب موت کا فرشتہ ہماری روح کو چھو لے گا۔

پہلا ماتحت فرشتہ: سمجھ سکو تو سمجھ لو، ورنہ، عوام کی طرح چپ چاپ تماشائی بن کر بیٹھے رہو۔

تماشائی: (چیخ کر) تم نے عوام یعنی پبلک کو تماشائی کہا؟ تماشائی کہہ کر اس کا مذاق اڑایا! جمہوریت کی یہ توہین میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔

پہلا ماتحت فرشتہ: میاں! سیاست کے سارے دھوکے تو تم تبرک سمجھ کر کھاتے ہو۔برسوں سے کھا رہے ہو۔اس تماشے کا ذرا سا جھوٹ تم برداشت نہیں کر سکتے۔ایک ایسا جھوٹ جو تمہیں سچائی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

دوسرا ماتحت فرشتہ: تمہاری سیاست میں یہی ہوتا ہے نا کہ ایک معمولی حیثیت کا آدمی الیکشن میں کھڑا ہوتا ہے اور میدان میں اترتے ہی چند برسوں میں کروڑوں میں کھیلنے لگتا ہے، کبھی اس پر اعتراض کیوں نہیں کیا؟

پہلا ماتحت فرشتہ: کیوں کہ اس سے ہمیں اپنے کام جو نکلوانے ہوتے ہیں۔ہمارے کام بڑے ہیں، ملک جائے جہنم میں!

پہلا ماتحت فرشتہ: جس سیاست اور جمہوریت کی تم دہائی دے رہے ہو، وہاں شرب اور دولت کے ذریعے ووٹ خریدے جاتے ہیں۔وہاں عوام کے نمائندے بھی بکتے ہیں، وہاں انسانیت کی کوئی قدر نہیں۔وہاں جاتے ہوئے شریف لوگوں کے پر جلتے ہیں۔کوئی غلطی سے چلا جائے اور اس رنگ میں ڈھلنے سے انکار کر دے تو اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔

تماشائی: یہ سب تم مجھے کیوں سنا رہے ہو؟

پہلا ماتحت فرشتہ: اس لیے کہ یہ سارا تماشا تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور تم خاموش تماشائی بنے رہتے ہو۔دھوکے پر دھوکے کھاتے ہو۔۔۔۔سنو! یہ زندگی بھی ایک دھوکہ ہے۔ہم تمہیں اس دھوکے سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔

دوسرا ماتحت فرشتہ: ہم تمہیں خبردار کر رہے ہیں کہ ایک بھیانک طوفان آنے والا ہے، قیامت! قیامت کو نہیں مانتے تو موت کو تو مانتے ہو۔۔۔۔،موت ہر آدمی کی قیامت ہے۔ہم تمہیں الرٹ کرنے کے لئے ایک میسیج بھیج رہے ہیں مگر تم اسے ریسیو کرنے کے لیے تیار نہیں۔

تماشائی: یہ سب مجھے نہیں سننا ہے، نہ تمہارا یہ تماشا دیکھنا ہے۔تم جھوٹے اور ڈھونگی ہو۔تم فرشتے نہیں ہو سکتے۔

دوسرا فرشتہ: یہ تم نے سچ کہا، ہم فرشتے نہیں ہیں۔نہ ہو سکتے ہیں، ہم واقعی فرشتے نہیں ہیں۔ہم تو اس معمولی سے ڈرامے کے اداکار ہیں۔ہم فرشتوں کا صرف رول کر رہے ہیں۔مگر ہم یہ بتانا چاہتے ہیں (دونوں ہاتھ اٹھا کر خلا میں گھورتے ہوئے) کہ اے بے کردار، بلکہ بدکردار انسان! تم تو انسان بھی نہیں ہو۔زندگی کے اس ڈرامے میں تم انسان کا صرف کردار ادا کر رہے ہو۔اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو! کیا تم محض ایک اداکار نہیں ہو؟ کیا واقعی تم انسان ہو؟

(اسٹیج پر موجود تمام کردار ساکت ہو جاتے ہیں۔دھیرے دھیرے فواد اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک چھوٹا بریف کیس اٹھائے ہوئے داخل ہوتا ہے۔پہلے فرشتے کے پاس آ کر رکتا ہے۔ایسا لگتا ہے دونوں میں بات چیت ہو رہی ہے۔آواز سنائی نہیں دیتی۔اس کے بعد فواد پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا دوسرے دروازے سے نکل جاتا ہے۔اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔اسٹیج پر اندھیرا ہے۔فواد کی آواز ابھرتی ہے)

فواد: اس خواب نے میری روح کو اندر تک جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔اب میں نے طے کر لیا ہے کہ میں رشوت کی وہ رقم سرفراز پٹیل کو لوٹا دوں گا۔میں وراثت میں اپنی بہن کا جو حصہ بنتا ہے وہ بھی لوٹا دوں گا، خواہ اس کے لیے مجھے اپنے خوابوں کا گلا ہی کیوں نہ گھونٹنا پڑے۔میں یہ جان چکا ہوں کہ کسی حقیقت پر خواب کو قربان کیا جا سکتا ہے لیکن کسی خواب کے لیے حقیقت کو ٹھکرا دینا واقعی گھاٹے کا سودا ہے۔ہم زندہ ہیں اور ایک خواب دیکھ رہے ہیں، زندگی اسی خواب کا دوسرا نام ہے۔۔۔،جس دن ہماری آنکھ بند ہو گی، یہ خواب ٹوٹ جائے گا اور آخرت ایک سنگین حقیقت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہو گی۔

(اسٹیج روشن ہو جاتا ہے۔سرفراز پٹیل اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہے۔دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

فواد: کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔سرفراز: آیئے آیئے۔(فواد داخل ہوتا ہے۔اس کے ہاتھ میں وہی بیگ ہے جو خواب کے دوران تھا۔)

سرفراز: اوہ ڈاکٹر صاحب! زہے نصیب، زہے نصیب! آپ نے کیوں زحمت کی، مجھے حکم دیا ہوتا، میں حاضر ہو جاتا۔

فواد: میں آپ کی یہ امانت لوٹانے آیا ہوں۔معذرت خواہ ہوں۔یہ کام

باقی صفحہ ۹۲ پر ملاحظہ کیجیے

ایک صدی کا قصّہ
وجینتی مالا
دیپک کنول (ممبئ،بھارت)

فلم ’’گنگا جمنا‘‘ سٹی زن بینر کے تلے بن رہی تھی جو کہ دلیپ کمار کا ذاتی بینر تھا۔بطور فلمساز یہ اُنکی پہلی فلم تھی اسلئے وہ ایک ایک پیسے کا حساب دیکھا کرتے تھے۔ایک دن اُنکے میز پر دودھ کا بل رکھا تھا۔جب وہ صبح صبح آفس میں آ کے بیٹھ گئے تو میز پر رکھے دودھ کا بل دیکھ کے وہ چونک پڑے۔اُنہوں نے اپنے چھوٹے بھائی ناصر خان صاحب کو آواز دیکر بلایا اور اُنہیں بل دکھاتے ہوئے پوچھا’’ آپ لوگ دودھ سے نہاتے ہو کیا۔‘‘ناصر صاحب کچھ نہیں بولے۔خاموشی سے باہر چلے گئے۔وجینتی مالا جو کہ اس فلم میں ہیروئن کا رول ادا کر رہی تھی ہوٹل کی بجائے اُن کے بنگلے پر ہی ٹھہرنا پسند کرتی تھی۔اتفاق سے وہ اُسوقت نہار ہی تھی۔ناصر صاحب بھاگ کر دلیپ صاحب کے پاس لے گئے اور اُن سے کہنے لگے کہ آپ دودھ کے بارے میں پوچھ رہے تھے نا تو آئیں میں آپ کو دکھاتا ہوں کہ یہ دودھ کہاں چلا جاتا ہے۔آپ نے وہ محاورہ سنا ہے نا۔ پوتوں پھلو دودھوں نہاؤ۔وہ اُنہیں غسل خانے کی موری کے پاس لے گئے جہاں سے دودھ بہہ رہا تھا۔دلیپ صاحب فوراً دودھوں نہاؤ کا مطلب سمجھ گئے۔وجینتی مالا پانی سے نہیں بلکہ دودھ سے نہایا کرتی تھی۔

وجینتی مالا جس کا نام مونو نیم وجینتی مالا رمن ہے 13 اگست 1936 کو تامل ناڈو (مدراس) کے ترپلکونی میں ایم ڈی رمن اور وسندرا دیوی رمن کے گھر پیدا ہوئی۔وسندرا رمن تامل فلموں کی ایک جانی مانی اداکارہ تھی۔1940 میں اُسکی تامل فلم ’’من گاما سبھا تھم‘‘ نے کامیابی کے ڈنکے بجائے۔اسی سال ویٹکن سٹی میں بی بی وجینتی مالا نے پوپ بارہ کے سامنے برت ناٹیم ناچ پیش کیا اور اُسکی ماں حاظرین میں بیٹھی تھی۔اُسوقت وجینتی مالا کی عمر محض سات سال تھی۔وجینتی مالا نے اپنی ابتدائی تعلیم Sacred Heart Higher Secondry سکول چرچ پارک چنئ میں حاصل کی۔اُسنے برت ناٹیم ناچ گورو رمیا پلئی اور کرناٹک کے منیکل سری واستو ائیر سے سیکھا۔تیرہ سال کی عمر میں اُسنے اسٹیج پر ڈانس پروگرام ادا کرنا شروع کیا۔ساؤتھ کے جانے مانے ہدایت کار ایم وی رمن ایک نئے چہرے کی تلاش میں تھے جسے وہ اے وی ایم کی اگلی فلم میں پیش کرنے والے تھے۔اُنہوں نے چنئ کے گھوکھلے ہال میں وجینتی مالا کو برت ناٹیم ناچ اسٹیج پر پیش کرتے دیکھا تو اُنہیں یہ لڑکی بھا گئی۔نہوں نے وجینتی مالا کو فلم میں کام کرنے کی پیشکش کی۔اس سے پہلے کہ وہ حامی بھرتی اُسکی نانی بیچ میں آ گئی اور اُسنے منع کر دیا۔اُسکا یہ ماننا تھا کہ فلموں میں کام کرنے سے اُسکی پڑھائی اور ناچ پر اثر پڑے گا۔ہدایت کار رمن نے وجینتی مالا کی نانی کو منا لیا اور اُسے اپنی فلم ’’وزیکلل‘‘ کے لئے سائن کیا جسمیں وہ مونا نام کی ایک کالج گرل کا رول ادا کر رہی تھی۔اسکے ساتھی کلا کاروں میں ساؤتھ کے نامی گرامی اداکار جیسے ساہس رانم، ایم ایس دروپڑی، ایس راجچند رن اور سنکرنن کام کر رہے تھے۔فلم زبردست کامیاب رہی۔ایک سال بعد اسی فلم کو تیلگو میں ’’جیوتھم‘‘ کے نام سے بنایا گیا۔اس فلم میں وجینتی مالا کو چھوڑ کے باقی کے سبھی ستارے تیلگو کے نامی اداکار تھے۔اس فلم کی ڈبنگ وجینتی مالا نے اپنی ہی آواز میں کی۔اُسنے اپنے باپ کی مدد لی جو تامل زبان کے ساتھ تیلگو بھی بولتا تھا۔فلم بیحد کامیاب رہی۔اُسنے 1950 کی تمل فلم ’’وجے کماری‘‘ میں بطور مہمان اداکارہ کام کیا جسمیں ساؤتھ کی جانی مانی اداکارہ ٹی آر راجکماری دوہرے رول میں تھی۔گو کہ فلم کاروباری لحاظ سے کامیاب نہیں رہی البتہ اس میں وجینتی مالا کا گانا ’’لالو لالو لالو لالو‘‘ جسمیں اُسنے مغربی انداز سے ڈانس کیا تھا بیحد مقبول ہوا۔

’’وزیکل‘‘ کی کامیابی سے اے وی ایم کے حوصلے اتنے بلند ہوئے کہ اُنہوں نے اسے ہندی میں بنانے کا فیصلہ کیا۔فلم کا نام ’’بہار‘‘ رکھا گیا۔وجینتی مالا فلم کی واحد اداکارہ تھی جسے ہندی فلم میں بھی جگہ ملی۔اُسے کرن دیوان، اوم پرکاش اور پنڈری بائی کے ساتھ پیش کیا گیا۔وجینتی مالا کی ضد تھی کہ وہ اس فلم کی ہندی ڈبنگ اپنی آواز میں کرے گی اسکے لئے اُسنے ہندی پرچار سبھا میں جا کر ہندی سیکھ لی۔اُسنے اپنے ناچ سے فلم میں جان ڈال دی۔فلم نے بھرپور کمائی کی۔ اُس سال کی سب سے زیادہ کمائی کرنے والی فلموں میں ’’بہار‘‘ چھٹے نمبر پر تھی۔اپنی پہلی ہندی فلم کی کامیابی سے خوش ہو کر اے وی ایم نے ایک بار پھر وجینتی مالا کو لے کر تمل اور تیلگو میں ایک اور فلم بنائی جس کا نام تمل میں ’’پین‘‘ تھا اور اُسکے ساتھی اداکاروں میں جمنی گنیشن، ایس بال چندرن اور انجلی دیوی تھی، جب کہ تیلگو میں اس کا نام ’’سنگھم‘‘ تھا جسمیں این ٹی راما راؤ، ایس بال چندرن، اور انجلی دیوی کلیدی رول میں تھے۔دونوں فلمیں ایک ساتھ ساؤتھ میں ریلیز ہوئیں اور دونوں کامیاب رہیں۔ایک بار پھر اے وی ایم نے اس فلم کو ہندی میں بنانے کا فیصلہ کیا۔فلم کا نام ’’لڑکی‘‘ رکھا گیا۔اس فلم میں اُسکے دو ہیرو تھے، بھارت بھوشن اور کشور کمار۔یہ فلم 1953 میں ریلیز ہونے والی فلموں کی کمائی کے حساب سے دوسرے نمبر پر رہی۔اس فلم کی جو خاص بات تھی وہ وجینتی مالا کے ڈانس تھے۔

1954 کا سال وجینتی مالا کی کامیابی اور کامرانی کا سال تھا۔اسی سال فلمستان کی ’’انارکلی‘‘ ریلیز ہوئی۔’’انارکلی‘‘ میں ہیرو کے رول میں پردیپ کمار اور فلم کی موسیقی ہیمنت کمار نے ترییب دی تھی۔اس فلم نے باکس آفس پر دھوم مچادی۔اس فلم میں ہر خاص و عام نے وجینتی مالا کی اچھوتی اداکاری کی تعریف کی۔اُسے اس فلم کے لئے تعریف و توصیف سے نوازا گیا۔اس فلم کا گانا ’’من ڈولے میرا تن ڈولے‘‘ نے فلم بینوں کو دیوانہ بنا ڈالا۔

وجینتی مالا کا جادو اس طرح سر چڑھ کے بولنے لگا تھا کہ 1955 میں اُسکی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں۔’’یاسمین‘‘ ہیرو سریش ’’پہلی جھلک‘‘ ہیرو کشور کمار

''ستارے'' ہیرو پردیپ کمار ''جشن'' ہیروکرن دیوان اور ''دیو داس'' ہیرو دلیپ کمار۔ ''دیوداس'' میں چندر مکھی کا رول سب سے پہلے نرگس کو پیش کیا گیا تھا مگر اُسنے یہ رول کرنے سے انکار کیا۔ اُسکے بعد بمل رائے نے بینا رائے اور سریا کو یہ رول پیش کیا مگر دونوں چندر مکھی کا رول کرنے کی بجائے پارو کا رول کرنے کے لئے تیار تھیں ۔سب سے پہلے پارو کے رول کے لئے مینا کماری سے رابطہ کیا گیا تھا مگر وہ کسی وجہ سے یہ رول کرنے سے قاصر تھی۔ ادھر بمل رائے کی مالی حالت کچھ ٹھیک نہ تھی جن لوگوں سے اس فلم کو بنانے کے لئے پیسہ لیا گیا تھا وہ بمل رائے کے سر پر سوار ہو چکے تھے۔ بمل رائے کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ مایوس ہو کر اُسنے سچترا سین کو پارو کے رول کے لئے سائن کیا۔ وجینتی مالا نے بمل رائے کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ اُسے چندر مکھی کے رول کے لئے مناسب سمجھتے ہیں تو وہ یہ رول کرنے کے لئے تیار ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بمل رائے نے وجینتی مالا کو اس رول کے لئے سائن کیا۔ جب یہ خبر انڈسٹری میں پھیل گئی کہ بمل رائے نے وجینتی مالا کو چندر مکھی کے رول کے لئے سائن کیا ہے تو وہ بمل رائے کا یہ کہہ کر مذاق اُڑانے لگے کہ بمل رائے کو دیوداس کے لئے کشور کمار کو لینا چاہیے۔ اس فلم کا اسکرین پلے رائٹر نبیند وگھوش بھی وجینتی مالا کے انتخاب سے خوش نہیں تھا مگر حالات کو مدنظر رکھ کر اُسے بھی ہدایت کار کے فیصلے سے صاد کرنا پڑا۔ گو کہ وجینتی مالا ''ناگن'' کی کامیابی کے بعد ایک اسٹار کا درجہ پا گئی تھی۔ بلا شبہ وہ ایک اچھی اداکارہ تھی مگر جہاں تک چندر مکھی کے رول کا سوال تھا وہ اس رول کے لئے موزوں نہیں تھی کیونکہ وہ ابھی کم سن تھی ۔ یہ بمل رائے کی ہدایت کارانہ صلاحیتوں کا کمال تھا کہ اُسنے وجینتی مالا کو چندر مکھی کے رول میں اس طرح ڈھالا کہ جس نے فلم دیکھی وہ وجینتی مالا کی اداکاری دیکھ کے دنگ رہ گیا۔ اُسنے چندر مکھی کا رول جیا تھا۔ وہ اس رول میں اس حد تک ڈوب گئی تھی کہ وجینتی مالا کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اُسے اس فلم کے لئے ساتھی کلاکار کے طور فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا مگر اُسنے یہ ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ اُسکا ماننا تھا کہ اُسکا رول ایک ساتھی کلاکار کا نہیں بلکہ ایک ہیروئن کا ہے اس لئے وہ یہ ایوارڈ لینے سے انکار کرتی ہے۔

''دیو داس'' کی ریلیز کے بعد وجینتی مالا نے فلمی نقادوں کو اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا قائل کر لیا تھا۔ 1956 میں اُسکی تین فلمیں ''تاج'' ''پٹ رانی'' اور ''انجان'' ریلیز ہوئیں۔ ان تینوں فلموں کا ہیرو پردیپ کمار تھا۔ ساتھ ہی اُسکی ایک اور فلم ''قسمت کا کھیل'' ریلیز ہوئی جس کا ہیرو سنیل دت تھا۔ اسی سال ساؤتھ کی بہت بڑی فلم ''دیوتا'' ریلیز ہوئی جسمیں ساؤتھ کے سپر سٹار جمینی گنیشن اور انجلی دیوی کے ساتھ وہ کام کر رہی تھی۔ یہ فلم سپر ہٹ تامل فلم ''کانا نونے کا ٹکانڈا'' کا ہندی روپ تھا جسمیں وجینتی مالا نے منفی رول ادا کیا تھا۔ تمل فلم میں یہ رول ساؤتھ کی اداکارہ للتا نے ادا کیا تھا۔ سب سے زیادہ جس فلم نے اُسے مقبولیت بخشی وہ فلم تھی، ''نیو دلی'' جو کہ ایک مزاحیہ فلم تھی جسمیں اُسکے مدمقابل کشور کمار تھا۔ اس فلم میں کشور کمار نے ایک پنجابی لڑکے اور وجینتی مالا نے ایک ساؤتھ انڈین لڑکی کا رول اس خوبی اور نفاست کے ساتھ ادا کیا تھا کہ فلم بین اس فلم پر ٹوٹ پڑے اور یہ فلم اُس سال کی سب سے زیادہ کمائی کرنے والی فلم قرار دی گئی۔ اتنی ساری فلموں میں مصروفیت کی وجہ سے وہ سہراب مودی کی فلم ''راج ہٹ'' میں کام نہیں کر سکی جو کہ بعد میں مدھو بالا کے پاس چلی گئی۔

وجینتی مالا قسمت کی دھنی تھی۔ فلم ''نیا دور'' جس میں دلیپ کمار اور مدھو بالا کام کر رہے تھے۔ مدھو بالا کے والد عطا اللہ خان کی مداخلت کی وجہ سے بی آر چوپڑہ نے مدھو بالا کو فلم سے الگ کیا اور اسکی جگہ وجینتی مالا آ گئی۔ اس فلم نے کامیابی کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دئے اور وجینتی مالا کو شہرت کی معراج پر لا کے کھڑا کر دیا۔ یہ فلم 1956 میں ریلیز ہوئی۔ وجینتی مالا نے ناصر حسین کی ہدایت میں بننے والی پہلی فلم ''تم سا نہیں دیکھا'' سائن کی تھی جس میں اُسکا ساتھی اداکار دیو آنند تھا۔ ناصر حسین نے فلم کا پورا اسکرپٹ دیو آنند کو سنایا بھی تھا اور وہ فلم میں کام کرنے کے لئے تیار بھی ہوا تھا لیکن فلمساز ششدھر مکھر جی نے پانسہ ہی پلٹ کے رکھ دیا۔ اُنہوں نے شمی کپور سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُسے اپنی اگلی فلم میں کام کرنے کا موقع دیں گے۔ دیو آنند کی جگہ شمی کپور آ گیا۔ دیو آنند کے ساتھ وجینتی مالا بھی فلم سے باہر ہو گئی ۔ اسکی جگہ ایتا آ گئی جو کہ فلستان کے مالک تولا رام جولان کی منظور نظر تھی۔ وجینتی مالا کو ان فلموں کے چھن جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اسی سال اُسکی ایک اور فلم ''کٹھ پتلی'' ریلیز ہوئی جس میں اُسکا ساتھی کلاکار بلراج ساہنی تھا اور اسکے ہدایت کار امیہ چکر ورتی تھے۔ بدقسمتی سے فلمبندی کے دوران امیہ چکر ورتی کی موت ہو گئی۔ اس فلم کی باقی ماندہ شوٹنگ ننن بوس نے پوری کی۔ فلم میں وجینتی مالا کے بہترین ناچ دگانے کے باوجود فلم زیادہ کامیاب نہیں رہی مگر اس میں وجینتی مالا کا کام لاجواب تھا اور یہ فلم وجینتی مالا کی یادگار فلموں میں سے ایک ہے۔ اسی سال پردیپ کمار کے ذاتی بینر کے تحت بننے والی فلم ''جھلک'' بھی ریلیز ہوئی جسمیں اُسکے ساتھ پردیپ کمار اور راجندر کمار تھے۔ سب سے زیادہ جس فلم نے باکس آفس پر دھوم مچائی وہ تھی کشور کمار کے ساتھ اُسکی آدھی بلیک اینڈ وائٹ اور آدھی رنگین فلم ''آشا'' جس کا یہ گانا اینا مینا ڈیکا، ڈھائی منا ڈیکا، آج بھی فلم شیدائیوں کو تھرکنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ فلمیں 1957 میں ریلیز ہوئیں۔

1958 میں بمل رائے کی مدھومتی ریلیز ہوئی۔ یہ فلم آواگون کے موضوع پر مبنی تھی۔ اس فلم میں دلیپ کمار اور وجینتی مالا کی لاجواب اداکاری، بمل رائے کی بے مثال ہدایت کاری، کمل بوس کی لاجواب فوٹوگرافی اور سلیل چودھری کی سحر آگین موسیقی نے چار چاند لگائے تھے۔ اس فلم میں پران اور جینت نے بھی اپنی دم دار اداکاری سے فلم میں جان ڈال دی تھی۔ یہ اُس سال کی سب سے زیادہ کمائی کرنے والی فلم تھی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران وجینتی مالا گھائل ہوئی۔ چوٹ لگنے کے باوجود وہ شوٹنگ کرتی رہی۔

ایک بار بی آر چوپڑہ کے بیٹے روی چوپڑہ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ ایک دن وجینتی مالا کی نانی ایک تھال لے کے بی آر چوپڑہ کے پاس آ گئی جسمیں ایک لاکھ کے نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ وہ یہ تھالی چوپڑہ صاحب کو پیش کرتے ہوئے

بولی کہ اُسکی ناطی کو اگلی فلم میں کام دیجئے۔ چوپڑہ صاحب نے اُسے تھالی بڑے پیار سے واپس کی اور وجینتی مالا کو اپنی اگلی فلم ''سادھنا'' کے لئے سائن کیا۔اس فلم کے لئے پہلے چوپڑہ صاحب نے نمی کو سائن کرنا چاہا تھا مگر وہ ایک طوائف کا رول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔نمی کی جگہ اس فلم میں وجینتی مالا آ گئی جسے طوائف کا رول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔اس فلم کی کہانی مکھرام شرمانے لکھی تھی۔یہ ایک متنازعہ موضوع تھا جس پر فلم بنانے کی پہل کرنا ہمت کا کام تھا۔اس فلم کی کہانی ایک بے بس اور لاچار طوائف کے گرد گھومتی تھی۔یہ ایک انقلابی فلم تھی جسمیں ایک طوائف کو مرکزی کردار میں پہلی بار پیش کیا گیا تھا۔وجینتی مالا نے یہ کردار ادا کرنے کے لئے کافی محنت کی۔اپنی بے مثال اداکاری سے اُسنے اس کردار میں جان ڈال دی۔ساحر لدھیانوی کے اچھوتے گانے اور این دتہ کی دل نشین موسیقی نے اس فلم کے سنگیت کو جاوداں کر دیا تھا۔خاص طور سے یہ گانا عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا، جب چاہا مسلا کچلا جب چاہا دھتکار دیا فلم کی جان تھا جسے لتا منگیشکر نے دل سے گایا تھا۔یہ گانا لتا منگیشکر کے بہترین گیتوں میں سے ایک ہے۔وجینتی مالا کو اُس برس دو دو فلم فیئر ایوارڈ ملے۔ایک ''مدھومتی'' کے لئے اور ایک ''سادھنا'' کے لئے۔دونوں فلموں میں اُسے بہترین اداکاری کے لئے ایوارڈ سے سرفراز ا گیا۔اسی سال دیو آنند کے ساتھ اُسکی پہلی فلم ''امر دیپ'' ریلیز ہوئی۔1958 میں اُسکی دو اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔''ستاروں سے آگے'' اور ''پیاملن'' جو کچھ خاص کمال نہ کر سکیں۔

''دیوداس'' اور ''مدھومتی'' کی کامیابی کو دیکھ کر فلمساز ایس ایس واسن نے دلیپ کمار اور وجینتی مالا کو اپنی نئی فلم میں دہرانے کا فیصلہ کیا۔اس فلم کا نام ''پیغام'' تھا۔اس فلم میں راجکمار اور موتی لال بھی اہم رول نبھا رہے تھے۔اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں وجینتی مالا کی ماں نے بھی ایک چھوٹا سا کردار ادا کیا تھا۔فلم میں دلیپ کمار، راجکمار اور وجینتی مالا کی بے مثال اداکاری نے فلم بینوں کا من موہ لیا تھا اور یہ فلم کمائی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر تھی۔اسی سال اُسکی ایک رومانی فلم ''جوانی کی ہوا'' بھی پردہ سیمیں کی زینت بنی جس میں پردیپ کمار ہیرو کے رول میں تھا۔

پھر آئی وہ فلم جو اُسکی کیریر کی سب سے بہترین فلم تصور کی جاتی ہے۔ وہ فلم تھی ''گنگا جمنا''، جسمیں اُسنے گنگا کی محبوبہ دھنو کا رول ادا کیا تھا۔جس خوبی سے اُسنے بھوجپوری مکالمے ادا کئے تھے اُسنے سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ایک ساؤتھ انڈین لڑکی ہو کر بھی اُس نے گاؤں کی ایک گنوار لڑکی دھنو کے کردار میں جان ڈال دی تھی۔اُسکے مکالموں کے اس کمال میں دلیپ صاحب کا ہاتھ تھا۔وہ اُسکے مکالمے ٹیپ ریکارڈ پر ریکارڈ کر کے اُسے دے دیتے تھے اور وہ ان مکالموں کا ریہرسل کرتی رہتی تھی۔نہ صرف مکالمے بلکہ وہ کس سین میں کونسی ساڑھی پہنے گی اسکا فیصلہ بھی دلیپ صاحب ہی کرتے تھے۔فلم ''گنگا جمنا'' دلیپ کمار اور وجینتی مالا کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس فلم نے نہ صرف ریکارڈ توڑ بزنس کیا بلکہ اسے اندرون اور بیرون ملک کافی سراہا گیا۔اس فلم نے اُس زمانے میں سات کروڑ کا بزنس کیا جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔دلیپ کمار اور وجینتی مالا کو اس فلم کے لئے فلم فیئر ایورڈ سے نوازا گیا تھا۔1961 میں اُسکی تمل فلم '' Then Nilavu '' ریلیز ہوئی جسمیں وہ جیمنی گنیشن کے ساتھ ایک لمبے عرصے کے بعد نظر آئی تھی۔یہ پہلی تمل فلم تھی جسکی شوٹنگ جموں کشمیر کی دلفریب وادیوں میں ہوئی تھی۔اسی سال جے اوم پرکاش کی اولین فلم ''آس کا پنچھی'' میں بھی وہ جلوہ افروز ہوئی جسمیں اُسکا ساتھی کلاکار راجندر کمار تھا۔اسے موہن کمار نے ڈائرکٹ کیا تھا۔

1962 کا سال وجینتی مالا کے لئے مایوس کن سال رہا۔تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔''ڈاکٹر ودیا'' جس کا ہیرو منوج کمار تھا، اوسط درجے کا بزنس کر پائی جب کہ ''رنگولی'' ہیرو کشور کمار اور ''جھولا'' ہیرو سنیل دت باکس آفس پر ناکام رہیں۔بمل رائے کی خواہش تھی کہ وہ فلم ''بندنی'' میں اُسکے ساتھ ایک بار پھر کام کرے مگر وہ اتنی مصروف تھی کہ وہ اپنے محسن کی فلم سائن نہ کر سکی۔اُسکی جگہ نوتن آ گئی۔مسلسل تین فلموں کی ناکامی کے بعد ایک بار پھر قسمت کی دیوی اُس پر مہربان ہوگئی۔ 1964 میں راجکپور کی ہدایت میں بننے والی فلم ''سنگم'' نے اُسے پھر اُسی چوٹی پر لا کے کھڑا کر دیا۔یہ فلم محبوب خان کی ''انداز'' کی طرز پر تھی۔یعنی تکونی پریم کہانی۔راجکپور جب محبوب خان کے ساتھ اس فلم میں کام کر رہا تھا تبھی اُسنے عہد کیا تھا کہ جب وہ ہدایت کار بنے گا تو ''انداز'' کو اپنے ڈھنگ سے بنائے گا۔اُسکی خواہش تھی کہ اس کہانی پر جس کا نام پہلے 'گھروندہ' تھا دلیپ کمار اُسکے ساتھ کام کرے۔بدقسمتی سے بات بنی نہیں اور راجکپور کو دلیپ کمار والے رول کے لئے راجندر کمار کو لینا پڑا۔نرگس کی جگہ وجینتی مالا آ گئی۔فلم کا نام رکھا گیا ''سنگم''۔راجکپور نے اس فلم کی فلمبندی پر پانی کی طرح پیسہ بہایا۔یہ فلم اُسکی انا کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔اس میں نہ ہی نرگس تھی اور نہ ہی دلیپ کمار۔اگر فلم فیل ہو جاتی تو وہ دلیپ کمار کا سامنا نہیں کر پاتا۔اُسنے فلم میں جان لگا دی۔سبھی فارمولے استعمال کئے۔اُسکا فارمولہ اتنا کامیاب ہوا کہ اس فلم نے چوراسی کروڑ سے زیادہ کا بزنس کیا۔یہ فلم پچھلی پانچ دہائیوں میں کمائی کرنے والی فلموں کی فہرست میں چوتھے نمبر پر تھی۔اسی سال وجینتی مالا کی ایک اور فلم ''لیڈر'' ریلیز ہوئی۔یہ دلیپ کمار کے ساتھ اُسکی پانچویں فلم تھی۔''سنگم'' کے مقابلے ''لیڈر'' کمائی کے معاملے میں پست رہی تاہم اُسکی اور دلیپ کمار کی اداکاری کی خوب تعریف کی گئی۔اسی سال ایک اور فلم ''زندگی'' نے وجینتی مالا کو کامیابی کی معراج پر لا کے کھڑا کر دیا۔اس فلم کی کہانی اسی کے کردار کے گرد گھومتی تھی۔اس میں اُسکے ساتھی کلاکاروں میں پرتھوی راج کپور، راجکمار اور راجندر کمار تھے اور ہدایت کار مشہور رائٹر رامانند ساگر تھے۔اس فلم نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔اس سال کی ایک اور فلم تھی ''پھولوں کی سیج''، جسمیں اسکے علاوہ اشوک کمار اور منوج کمار جلوہ گر تھے۔اس فلم نے بھی اچھا خاصا بزنس کیا۔اس سال کے آخیر میں ریلیز ہونے والی فلم تھی ''اشارہ'' جسمیں اُسنے ششادھر مکھرجی کے بیٹے جائے مکھرجی کے ساتھ پہلی بار کام کیا تھا۔فلم ٹھیک ٹھاک رہی۔

1965 کا شروعاتی دور حوصلہ افزا نہیں رہا۔''نیا قانون'' جسمیں اشوک کمار اور بھارت بھوشن، اُسکے ساتھی کلاکار تھے، ناکام رہی۔اسکے بعد ایک اور فلم کی نمائش ہوئی

جس کا نام ''دو دلوں کی داستان'' تھا۔ یہ فلم 1966 میں ریلیز ہوئی اور فلاپ قرار دی گئی ۔وجینتی مالا نے اسی سال ایک نئی فلم سائن کی جس کا نام ''سورج'' تھا۔ یہ کاسٹیوم ڈرامہ فلم تھی جسے ساؤتھ کے جانے مانے ہدایت کار ٹی پرکاش راو ڈائرکٹ کر رہے تھے۔ اس فلم کے ستاروں میں وجینتی مالا کے علاوہ جوبلی کمار یعنی راجندر کمار، ممتاز اور نیتو سنگھ بھی شامل تھے۔ فلم ''سورج'' نے پچھلی ناکامیوں کی بھرپائی کی۔ شنکر جے کشن کے سحر آگیں سنگیت سے آراستہ یہ فلم کمائی کے لحاظ سے اُس سال کی سب سے زیادہ کمائی کرنے والی دوسری فلم رہی۔ وہ اس فلم کی کامیابی کا جشن پوری طرح منا بھی نہ پائی تھی کہ اُسکی ایک اور فلم ''امر پالی'' ریلیز ہوئی جس نے اُسکی خوشیوں کو ماتم میں بدل دیا۔ اُس سال کی سب سے مہنگی فلم ''امر پالی'' کا باکس آفس پر اتنا برا حشر ہوا کہ وجینتی مالا نے فلمی دنیا چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تو بھلا ہو بی آر چوپڑہ کا جس نے اُسے روکا۔ اُسنے اُسکی ہمت بندھائی اور اُسے یقین دلایا کہ وہ ایک اور دہائی تک فلمی دنیا پر راج کر سکتی ہے۔ اسی بیچ ہدایت کار چانکیہ نے اُسے فلم ''رام اور شیام'' کے لئے سائن کیا۔ یہ دلیپ کمار کے ساتھ اُسکی ساتویں فلم تھی۔ اس فلم کی ابھی شوٹنگ بھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ دلیپ کمار اور وجینتی مالا کے مابین کچھ ایسی غلط فہمی پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے فلم کی پیش رفت پر اثر پڑا۔ ہدایت کار چانکیہ اپنی فلم کو اس جھگڑے کی بھینٹ چڑھانا نہیں چاہتا تھا اسلئے اُس نے وجینتی مالا کو فلم سے باہر کر دیا اور اُسکی جگہ وحیدہ رحمان کو لے آیا۔ وجینتی مالا اس فیصلے سے تلملا اُٹھی۔ بہر حال اُسنے زہر کا گھونٹ چپ چاپ پی لیا تبھی دیو آنند اُسکے لئے خوشی کا پیغام لے کے آیا۔ دیو آنند ایک سسپنس تھرلر فلم بنانے جا رہا تھا جس کا نام ''جیول تھیف'' تھا۔ اس فلم کو دیو آنند کے چھوٹے بھائی ڈائرکٹ کر رہے تھے۔ اس فلم میں دیو آنند کے علاوہ اشوک کمار بھی کام کر رہے تھے۔ اس فلم کے لئے سائرہ بانو کو سائن کیا گیا تھا جو دلیپ کمار سے شادی کے بندھن میں بندھ گئی تھی جسکی وجہ سے اُس نے فلم میں کام کرنے سے انکار کیا۔ اُسکی جگہ وجینتی مالا کو لیا گیا۔ اس فلم نے زبردست بزنس کیا اور وجینتی مالا اور دیو آنند کی جوڑی کو لوگوں نے خوب پسند کیا۔ اسی سال اُس کی ایک اور فلم ''چھوٹی سی ملاقات'' ریلیز ہوئی جس کے اداکار اور فلمساز بنگالی سینما کے سپر ہیرو اُتم کمار تھے۔ یہ فلم پہلے ''اگنی پریکھشا'' کے نام سے بنگالی زبان میں بنی تھی اور اس نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا تھا۔ ہندی میں یہ فلم چل نہیں پائی۔

دلیپ کمار اور وجینتی مالا کے بیچ جو غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی وہ دور ہوگئی تھی اور دونوں ایک ساتھ فلم ''سنگھرش'' میں کام کرنے کے لئے راضی ہوئے تھے۔ یہ فلم ایچ ایس روبل بنا رہے تھے اور اُن کی پہلی پسند سادھنا تھی۔ سادھنا تھائی رائڈ کی بیماری سے جوجھ رہی تھی اس لئے وہ فلم میں کام کرنے سے قاصر تھی۔ اسکی جگہ وجینتی مالا آگئی۔ اس میں دلیپ کمار کے علاوہ بلراج ساہنی اور سنجیو کمار بھی کام کر رہے تھے۔ وجینتی مالا کی ڈانسنگ قابلیت کو مدنظر رکھ کر اس میں ناچ گانے کی سچویشن پیدا کی گئی تا کہ وجینتی مالا کی فنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال ہو۔ اسی سال اُسکی ایک اور فلم ''ساتھی'' بھی ریلیز ہوئی جسمیں اُسکے ساتھ راجندر کمار تھا۔ ساتھ ہی دیو آنند کی ''دنیا'' ''پیار ہی پیار'' ''پرنس'' اور گنوار بھی ریلیز ہوئیں۔ ''گنوار'' اُسکی آخری فلم تھی۔ سبھی فلموں نے خوب بزنس کیا۔

قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وجینتی مالا نے کئی خوبصورت اور کامیاب فلمیں ٹھکرا دیں۔ اُسے فلم ''سپنوں کے سوداگر'' میں راج کپور کے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی گئی۔ اُسنے فلم ٹھکرا دی۔ اسکی جگہ ہیما مالنی آگئی۔ اُسے گلزار نے فلم ''آندھی'' میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ اُسنے یہ فلم بھی ٹھکرا دی۔ اسکی جگہ بنگال کی حسینہ سچترا سین آگئی۔ اُسے یش چوپڑہ کی فلم ''دیوار'' میں بھی کام کرنے سے انکار کر دیا۔ منوج کمار نے اُسے دلیپ کمار کے ساتھ فلم ''کرانتی'' میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ وہ اس فلم میں بھی کام کرنے کے لئے راضی نہ ہوئی۔

وجینتی مالا کے بارے میں وقت وقت پر طرح طرح کی افواہیں اُڑتی رہیں۔ پہلے اُسکا نام دلیپ کمار کے ساتھ تب جڑ گیا جب وہ اُنکی گھریلو فلم ''گنگا جمنا'' میں کام کر رہی تھی۔ دلیل یہ دی گئی کہ دلیپ کمار اُسکے کام میں حد سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں یہاں تک کہ کس سین میں وہ کونسی ساڑھی پہنے گی وہ بھی وہی طے کرتے ہیں۔ افواہ یہاں تک پھیلی کہ کامنی کوشل اور مدھو بالا کے ساتھ عشق میں ناکام رہنے کے بعد وہ تیسری بار دل لگا بیٹھے ہیں۔ وجینتی مالا اور وہ ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو چکے ہیں اور دونوں جلدی شادی کرنے والے ہیں ۔جب دلیپ کمار کی شادی سائرہ بانو سے ہوگئی تو یہ افواہ جھوٹی ثابت ہوئی۔ اسکے بعد وجینتی مالا کا نام راجکپور کے ساتھ جڑ گیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ راجکپور کے ساتھ فلم ''سنگم'' کر رہی تھی۔ راج کپور بڑا رومان پسند آدمی تھا۔ وہ جس کے پیچھے پڑتا تھا، اُسے حاصل کئے بنا نہیں رہتا تھا۔ پہلے پہل تو وجینتی مالا اُسے دور بھگاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اُسکی مزاحمت پیار میں تبدیل ہوگئی۔ معاملہ اتنا گھمبیر ہو گیا کہ راجکپور کی پتنی کرشنا کپور نے راج کپور کا گھر چھوڑ دیا اور وہ اپنے بچوں کو لے کر بمبئی کے نٹ راج ہوٹل میں رہنے لگی۔ ساڑھے چار مہینے تک وہ اس ہوٹل میں رہی۔ بعد میں راج کپور اُسے منا کر گھر لے آیا۔ چمن لال بالی راج کپور کا فیملی معالج تھا۔ وجینتی مالا اور راج کپور کے بیچ کچھ ایسا ہوا جسے یہاں بیان کرنا مناسب نہیں۔ چمن بالی نے اُسی کا فائدہ اُٹھا کر اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر وجینتی مالا سے شادی کی۔ یہ شادی 1968 میں ''سنگم'' کی ریلیز کے دو سال بعد ہوئی ۔شادی کے بعد وجینتی مالا نے فلمی دنیا کو الوداع کہا اور وہ اپنے پتی کے ساتھ مدراس میں جا کر رہنے لگی۔ چمن بالی سے اُسکا ایک بیٹا ہوا جو اپنی ماں کیساتھ چنئی میں رہتا ہے۔ چمن لال بالی کا 1986 میں انتقال ہوا۔ وجینتی مالا ساری زندگی سبزی خور رہی۔ وہ فلموں سے سنیاس لینے کے بعد دھرم کرم کی طرف زیادہ دھیان دینے لگی۔ آجکل وہ دھارمک کاموں میں اپنا زیادہ تر وقت بتاتی ہے۔

وجینتی مالا نے ایک سنہری دور دیکھا۔ وہ 1949 سے لے کے 1969 تک فعال رہی۔ اُسنے دو دہائی تک فلمی جگت پر راج کیا۔ اُسنے تمام اول نمبر کے ستاروں کے ساتھ کام کیا۔ اُسنے بے شمار ایوارڈ حاصل کئے۔ اُسکی اچھوتی اداکاری اور اُسکے ناچ کے دیوانے آج بھی موجود ہیں۔ بلاشبہ وجینتی مالا ایک اعلیٰ درجے کی اداکارہ تھی جسے یہ فن ورثے میں ملا تھا۔ فلمی شائقین وجینتی مالا کو ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

عزیزم گلزار جاوید صاحب، دلی دعائیں۔

آپ نے مجھ حقیر فقیر کو جس طرح اپنے ادب سرشت گوشۂ دل میں جگہ دی ''چہارسو'' اُس کی دھوم ہے۔ خدا آپ کے جنونِ گوشہ تلاش کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ یہاں مجھے اپنا ایک شعر شدت سے یاد آ رہا ہے:

ہمارے بارے میں لکھنا تو بس یہی لکھنا
کہاں کی شمعیں ہیں کن محفلوں میں جلتی ہیں

آپ نے بذریعہ چہارسو اس دردِ بے زباں کو نہ صرف زبان عطا کی بلکہ اہلِ علم اور اہلِ ادب کو ایک باوقار اشاعت سے بھی لذت آشنا کیا۔ خوش رہیے، آباد رہیے ابھی مسلسل سفر میں ہوں۔ ہفتہ دس دن کے بعد گھر لوٹنے کی امید ہے جہاں سے مجھے چہارسو کے پہنچنے کی اطلاع مل چکی ہے۔ جسے دیکھنے، سراہنے اور آپ کی بے لوث ادبی کاوشوں کو خراج پیش کرنے کے لیے بے چین ہوں۔

وسیم بریلوی (رانچی، بھارت)

محترم گلزار صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا شمارہ ماہ اکتوبر، قرطاس اعزاز بنام وسیم بریلوی کل وصول ہوا۔

ارادہ تھا کہ صرف ورق گردانی کرونگا اور فرصت میں گہرا مطالعہ کرونگا مگر اس کے مشمولات نے کچھ ایسا گرفت میں لیا کہ کئی گھنٹے اسی میں گذر گئے۔ یہ کہنا تو اب فضول ہے کہ آپ نہایت جانفشانی سے ہر شمارے کو ترتیب دیتے ہیں اور شمارے کے ہر مضمون اور قلمی تخلیق پر آپکی نگاہ گہری ہوتی ہے، ہر سطر سے مدیر کا گہرا رابطہ ظاہر ہوتا ہے۔ وسیم بریلوی صاحب سے میں واقف ہوں کیونکہ ''یوٹیوب'' پر وسیم ہر مشاعرے میں شامل ہوتے ہیں اور جس طرح ان کی پذیرائی ہوتی ہے اس سے ان کی ہر دالعزیزی ثابت ہوتی ہے۔ اس شمارے میں آپ نے انکے ادبی قد وقامت اور اردو ادب میں وسیم کی حیثیت سے قارئین کو معروضی طور پر واقف کروایا ہے۔ ان پر لکھے گئے تمام مضامین پر مغز ہیں۔ حسب سابق ''براہ راست'' میں آپ نے معنی خیز سوالات پوچھے اور وسیم صاحب نے آپ کو جواب بھی خوب دئے۔ جب وسیم صاحب کے لئے جگن ناتھ آزاد اور فراق گورکھپوری جیسے مشاہیر نے اتنا کچھ لکھا ہے تو مجھے مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ کہنے کی جسارت ضرور کرونگا کہ بریلی کے ڈاکٹر جاوید نسیمی صاحب نے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کی مثال انکے معاشقوں کی جو تفصیلات بتائی ہیں اور جس انداز سے بتائی ہیں شاید اسکی ضرورت نہ تھی، کسی وجہ سے مجھے اچھی نہیں لگی۔ شاید وسیم صاحب کو بھی اچھی نہ لگی ہوں گی۔

شمارے میں جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا وہ ایک نظم ہے جو کسی وجہ سے حصہ نظم میں شامل نہیں مگر اسکی سچائی اور کھری کھری باتوں نے میرے دل کو چھو لیا۔ شاید اس لئے بھی کہ میرے خیالات بھی کچھ باغیانہ ہیں۔ یہ علی زریون صاحب کی بعنوان ''تاریخ کے دھتکارے ہوئے'' ہے۔ ہم تمام دنیا کے مسلمان جو ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے بغلیں بجاتے رہتے ہیں انکے لئے یہ ایک آئینہ ہے۔ پہلی دفعہ علی زریون صاحب چہارسو میں نظر آئے امید ہے آپ ان کو مستقبل میں بھی شامل کرینگے۔

حصہ نثر میں جس تخلیق نے مجھے بہت متاثر کیا وہ رینو بہل کا داؤد کا چاند ہے۔ رینو پائے کی قلمکار ہیں انکے الفاظ جچے تلے ہوتے ہیں اور وہ اپنی بات بہت سلیقے سے کہتی ہیں۔ انکا ناول گرد میں اٹے چہرے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ یہ مضمون ایک خاکہ ہے جو پاکستان میں ایک نسبتاً گمنام مگر نہایت اعلی پیمانے کے اردو افسانہ نگار کے متعلق ہے۔ رینو کی رتن سنگھ کے لئے عقیدت اور اس سے کہیں زیادہ محبت ہر سطر سے جھلک رہی ہے۔ وہ بڑے دل کی مالک ہیں اور ہر ایک کو محبتیں بانٹنا انکا شیوہ ہے۔

انل ٹھکر کا افسانہ بد دعا لاجواب تخلیق ہے۔ شموئیل احمد قلم سے ہندوستان میں موجودہ تعاصب کی فضا کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ سیمیں کرن بہت تیزی سے ادب کے آسمان پر طلوع ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس پر چھا گئی ہیں۔ منظوم حصے پر میں کم ہی رائے دیتا ہوں مگر ریاض احمد کا قطع رحمی اور یوگندر بھائی صاحب (کہ میں انہیں یہی کہتا ہوں، انکی محبت میرے جلتے وجود پر بادل کا ٹھنڈا سایہ ہے) کی نظم جو اُس حادثے کی ترجمان ہے جس سے وہ دوچار ہوئے بہت اچھی لگی۔ شکر ہے اوپر والے نے انکی جان بچائی۔

فیروز عالم (لاس انجلز)

میرے گلزار، خوش رہو۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ''چہارسو'' نے نہال کر دیا۔ سفر درپیش نہ ہوتا تو تفصیلی خط لکھنے کی خواہش تھی۔ چلتے چلتے اتنا عرض کر دوں کہ وسیم بریلوی صاحب کو آپ نے چہارسو کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑ کے ایک اور بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور یہ جو آپ منقول صاحب کو ڈھونڈ لائے ہیں کمال کے شاعر ہیں۔ میری خواہش ہے کہ آئندہ بھی چہارسو میں ان کا کلام شامل ہو۔ یارِ غار فیروز عالم، ایم پی چاند، ڈاکٹر ریاض احمد، تابش خانزادہ، انل ٹھکر جی اور عزیزہ رینو بہل نے قلب سے منہ قلم کا کام لے کر طبیعت باغ باغ کر دی۔

یوگیندر بہل تشنہ (شنگھائی)

گلزار صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو ایک باوقار اور بروقت تسلسل سے شائع کرنے پر مبارکباد .. گوشہ اختصاص میں اس دفعہ پروفیسر وسیم بریلوی کو جگہ ملی۔ افسانوں میں محترم انل

ٹھکّر کا افسانہ تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھا گیا عمدہ افسانہ تھا۔شمویل احمد صاحب کا افسانہ ''گائے ہماری ماتا ہے'' انکے مزاج سے ہٹ کر ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پہ تھا جس میں تاریخ بڑی خوبصورتی سے جھانک رہی تھی۔گئو رکشک اور گئو تسکری کو لے کر مسلمانوں اور دلت استحصال کو بہت خوب بیان کیا گیا۔نیر اقبال علوی اور تسنیم کوثر کے افسانے بھی قابل ذکر ہیں۔

ابوحماد نے ایڈگر ایلن پو کی کہانی کا ترجمہ'' کالا بلا'' کے عنوان سے پیش کیا۔اسرار وخوف اور انسانی نفسیات پہ ایک طنزیے عمدہ کاوش تھی۔رینو بہل کا خاکہ''داود کا چاند'' عمدہ تحریر تھی۔ڈاکٹر فیروز عالم ہر دفعہ ایک عمدہ مفید موضوع کے ساتھ آتے ہیں۔دیپک کنول ''ایک صدی کا قصہ'' کے عنوان سے اس دفعہ بھارت بھوشن کے تعارف کیساتھ آئے ہیں۔نظموں میں عبداللہ جاوید، یوگندر بہل تشنہ، جمیل عثمان، شاہین مفتی اور انیس الرحمٰن نے عمدہ نظمیں پیش کیں۔

سیمیں کرن (فیصل آباد)

گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے خاکسار کو ہمیشہ چہارسو کے لیے یاد رکھا۔نیا شمارہ بھی آپ ہی کی محبتوں سے نظر نواز ہوا۔ڈاکٹر وسیم بریلوی صاحب کی شخصیت پر قرطاس اعزاز پڑھنے کے بعد ان کے حوالے سے کافی معلومات حاصل ہوئیں۔اب میں سیدھے رینو جی کے نوک قلم سے کھینچے گئے رتن سنگھ کے خاکے "داؤد کا چاند" پر آجاتا ہوں۔عنوان دیکھتے ہی دل نے چاہا کہ اسے پڑھوں اور پڑھنا شروع کیا۔کب پورا خاکہ ختم ہو گیا احساس ہی نہیں ہوا۔ مجھے اس بات کا رنج ہوا کہ رینو جی نے اتنا مختصر کیوں لکھا۔ابھی تو شروع کیا تھا اور ختم۔کمال کی روانی اور اس روانی میں غضب کی دلکشی۔جس نے پلک جھپکنے تک بھی مہلت نہیں دی۔قابل ستائش ہیں رینو جی کہ اتنی شگفتہ اور دل نشین تحریر کی خالق ہیں۔

ڈاکٹر علی عباس (چندی گڑھ، بھارت)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

گذشتہ چھ دہائیوں سے اپنی موثر شاعری سے سماج کو بیدار کرنے اور اردو کے فروغ کی سعی مسلسل میں مصروف مشہور شاعر اور ادیب وسیم بریلوی کی خدمات نہایت قابل قدر ہیں۔''چہارسو'' کے شمارہ ستمبر اکتوبر ۲۰۱۸ء کو اُن کے نام منسوب دیکھ کر خوشی ہوئی۔ایسی خدمات اور افراد کی پذیرائی کرنے والے مردم شناس لوگ بھی قابل احترام ہوتے ہیں۔

''براہِ راست'' میں آپ کا مکالمہ، سوالات کا انتخاب اور ادائیگی آپ کے گہرے مطالعہ اور شعور کی ایک خوبصورت جھلک ہوتی ہے جو قابلِ صد تعریف ہے۔گزشتہ ماہ گیارہ ستمبر ۲۰۱۸ء کو پشاور میں ''چہارسو'' کے شمارہ جولائی اگست ۲۰۱۸ء ''سید ناصر علی نمبر'' کے حوالے سے ایک تقریب رونمائی ہوئی جس کی صدارت اردو ادب کے قدردان اور مہربان آئی ایس آئی کی افسانوی شخصیت اور عظیم محبّ وطن میجر (ر) محمد عامر نے کی۔تقریب میں پشاور اور گردوپیش سے تعلق رکھنے والے شعراء، ادیبوں اور دیگر خواتین وحضرات کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔راقم الحروف کو بھی خصوصی طور پر ''چہارسو'' کی نمائندگی کے لیے مدعو کیا گیا۔مقررین نے ناصر علی سید صاحب کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ''چہارسو'' کی طرف سے اُن کی پذیرائی پر خاص طور پر مدیر مسئول گلزار جاوید صاحب کا شکریہ ادا کیا۔پروفیسر نذیر تبسم، ڈاکٹر خالد مفتی نے آپ کے ادبی اور فنی نوعیت کے دلچسپ مکالمہ پر خصوصی تبصرہ کرتے ہوئے چالیس سوالات پر مشتمل اس سوال نامہ کو کمالِ فن کا آئینہ دار قرار دیا جس کے ذریعے آئس برگ (Ice berg) کی نظر آنے والی چوٹی ہی نہیں بلکہ اُس کے پورے حجم اور وزن کو ناپ تول کر یوں پیش کیا جاتا ہے کہ کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی۔راقم الحروف نے بھی اپنی تقریر میں دیگر باتوں کے علاوہ ''چہارسو'' کی پذیرائی پر سب کا شکریہ ادا کیا۔

زیرِ نظر شمارہ میں بہت اچھے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔انل ٹھکّر کا افسانہ ''بددُعا'' پڑھ کر دل کانپ اٹھا جس میں انہوں نے بلا تعصب رنگ نسل اور مذہب دردناک اور انتہائی غیر انسانی وحشیانہ مشاہدات اور واقعات کی منظر کشی کی ہے جو برصغیر کی تقسیم کے وقت لکیر کے دونوں جانب وقوع پذیر ہوئے۔انل ٹھکّر صاحب اپنی ''بددُعا'' واپس لے کر سب کو معاف فرمائیں کیونکہ ہم ایسے تمام قابلِ نفرت واقعات کی مذمت کرتے ہیں۔

اس شمارے میں ''گائے ہماری ماتا ہے'' کے عنوان سے جناب شموئل احمد نے مذہبی منافرت اور اس کے نتیجے میں انتہا پسندوں کے جس اذیت ناک غیر انسانی سلوک کی منظر کشی کی ہے اُس سے انسانیت بھی شرما جاتی ہے۔گائے کی تسکری پر پابندی ہے لیکن شک یا افواہ کی بنیاد پر بھی شودر ہو مسلمان یا عیسائی اُسے ہجوم صرف ایک بار میں قتل نہیں کرتا بلکہ اب کچلنے کی ریت ہے ایک آدمی کو سب مل کر کچلتے ہیں لوگ گائے رکھنا یا خرید وفروخت کرنے سے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی مخالف ایک آواز بلند کر دے اور ایک ہجوم اس کی تمام وضاحتیں سننے کے باوجود کچلنے سے پہلے دم نہ لے۔شاید یہی دو مختلف مذاہب اور ان کی قومی روایات واقدار تھیں جس کے مدِ نظر مستقبل کے خدشات کے پیشِ نظر اپنا اپنا طرز زندگی آزادی سے بسر کرنے کی خاطر دو علیحدہ ملک وجود میں آئے۔

جناب نیئر اقبال علوی جس کے چھ عدد افسانوی مجموعے اور ایک مجموعہ مضامین اب تک شائع ہو چکے ہیں ایک حساس طبیعت اور دردِ دل رکھنے والے محبّ وطن ادیب ہیں۔وہ بہت بامعنی تحریروں کے ذریعہ سماج کے عیّون وبطون جھنجھوڑنے کی قابلِ داد کوششوں میں ایک عرصہ سے مصروف ہیں۔اُن کی لکھی ہوئی کہانیاں صف تفریح طبع کی خاطر نہیں بلکہ ضمیر بیدار کرنے اور قاری کو سوچنے پر مجبور کر دینے کے لیے ہوتی ہیں۔موجودہ شمارہ میں شامل کہانی ''بنجارن'' میں خودغرضی اور خودفریبی کے مقابلہ میں ضمیر کی آواز سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

محترمہ تسنیم کوثر کے افسانہ ''گھر کو چلا میں'' سے نچلے طبقہ کی ملازمت کے دوران مسائل چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور مشکلات پر انوکھے انداز میں روشنی

ڈالی گئی ہے جو کہ ایک دلچسپ تجزیہ بھی ہے۔ رینو بہل نے ''داؤد کا چاند'' کے عنوان سے بہت معلومات افزا اور دلچسپ مضمون اس عہد کے مقبول اور نامور ادیب جنہوں نے اپنے فن پاروں سے پنجابی اور اردو ادب کے دامن کو یکساں طور پر مالا مال کر دیا یعنی رتن سنگھ جی کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ رتن سنگھ جی کی داستانِ حیات خلوص، لگن، محنت اور کامیابی کی ایک سبق آموز مثال ہے۔

محترمہ نازیہ پروین نے ''جنّت کے بھکاری'' کے عنوان سے بے حس معاشرہ میں عورت کے انتہائی افسوسناک استحصال کی دردناک داستان لکھی ہے جسے پڑھ کر دل اُداس ہو جاتا ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی تحریریں نہیں پڑھ سکتے یا نہیں پڑھتے اس لیے ہر فرد اپنے تئیں اس معاملے میں اصلاحِ احوال کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کرے۔

پروفیسر غازی علم الدین نے ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی جو ایک نامور صحافی اور کالم نویس ہونے کے علاوہ کامیاب مزاح نگار کی شہرت بھی رکھتے ہیں کی کتاب ''یوں نہیں، یوں!'' کے حوالہ سے نہایت معلوماتی اور دلچسپ مضمون تحریر کیا ہے۔ معین قریشی صاحب کی یہ کتاب جو اُنہوں نے نہایت محنت، عرق ریزی سے لکھ کر کوئی دو سو ضرب المثال اور دلنشیں اشعار کا حلیہ درست کیا ہے ارد وادب سے لگاؤ رکھنے والوں کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔

کرشن گوتم نے رینو بہل کے مشہور ناول ''گرد میں اَٹے چہرے'' پر خوبصورت مضمون تحریر کیا ہے اور اپنے زاویۂ نظر سے اظہار خیال کیا ہے۔ دراصل رینو بہل کی تحریریں ''ادب برائے زندگی'' کے اپنے اصول کے تحت بامقصد، بامعنی اور گہرے سماجی شعور و فکر و دانش کے ساتھ ایسے اشاروں پر مشتمل ہوتی ہیں جو قاری کی معلومات میں اضافہ کے ساتھ مثبت انداز میں رہنمائی کر سکیں۔ ناول میں ایک مثال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جب کوئی ماں خود غرض ہو جاتی ہے اور اپنی خوشی کی خاطر سب سرحدیں پار کر دیتی ہے اور بچوں کے بارے میں نہیں سوچتی کہ پیچھے رہ جانے والے بچوں پر اس کے کیا نفسیاتی اثرات ہوں گے بلکہ ان کی سوچ اور زندگی میں طرزِ عمل کتنا بدل جائے گا جب محبت سے محرومی کا احساس لیے سہمے سہمے بچوں کو لوگوں کے طعنے سنتے ہوئے اپنی عزت بچانی بھی مشکل ہو جائے گی۔ ماں کے اس طرزِ عمل سے بچوں میں یقین اعتماد کے علاوہ رشتوں پر اعتبار بھی ختم ہو گیا۔ لڑکے نے نشے کا سہارا لیا۔ بڑی بیٹی کا محبت سے اعتبار چکنا چور ہو گیا اور ایک بستے رستے خاندان کی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔ کاش کہ ماں نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے خاندان کو بچانے کی خاطر خود غرضی کی راہ اختیار نہ کی ہوتی۔

ناول کے دوسرے حصے میں جیل کی زندگی اور وہاں کے مسائل ان عورتوں کے مسائل جن کے پیچھے بچوں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہوتا اور بچے بھی ماں کے ساتھ ناکردہ جرم کی سزا کاٹ رہے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ جیل کے حالات، نظام اور دشواریوں کو تفصیلی انداز سے بیان کیا ہے۔ مجموعی طور پر ناول ایک سبق اور عبرت کی ایسی داستان ہے جو آنکھیں کھولنے اور قاری کو سوچنے کی طرف مجبور کر دیتی ہے۔ رینو بہل نے ناول کو ان الفاظ سے منسوب کیا ہے ''ماں کی ماتا سے محروم نونہالوں کے نام''

ڈاکٹر فیروز عالم نے قارئین کی آگاہی کے لیے سٹروک پر مضمون تحریر کیا ہے جو عالمی طور پر اموات کا دوسرا بڑا سبب ہے لیکن فوری توجہ اور علاج سے بہت سے افراد کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کا طبی مسائل کی آگاہی کے لیے تسلسل کے ساتھ مضامین لکھنے کا سلسلہ قابل صد تحسین ہے۔

شاعری میں بہت سی اچھی نظمیں اور غزلیں پیش کی گئی ہیں جن میں وسیم بریلوی صاحب، یوگیندر بہل تشنہ، محمود الحسن، حسن عسکری، آصف ثاقب، عارف شفیق اور رحمان فارس کے کلام نے خاص طور پر متاثر کیا۔ گزشتہ شمارہ میں میری غزل بعنوان ''قطع رحمی'' میں کتابت کی غلطیوں کے باعث چند اشعار کا اثر اور مفہوم تبدیل ہو گیا تھا۔ اصل شعر یوں ہیں:

کاش بے لوث محبت بھی کہیں پائیں یہاں
ہم بھی محسوس کریں لطف شناسائی کے
دل پہ سہتے رہے مدت سے جفائیں ان کی
ہوئے مجبور صنم آج لب کشائی کے
اس نے جب توڑ دیئے رشتے کئی برسوں کے
کیا کہوں کیسے کٹے لمحے وہ تنہائی کے

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

حسبِ دستور وقت پر ہی ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا تو مسرت ہوئی۔ وسیم بریلوی پر قرطاسِ اعزاز کا مختص ہونا بھی ''چہارسو'' کی اُن روایتوں کی پاسداری ہے جو گلزار جاوید عرصے سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اب سے کچھ عرصہ قبل تک یہ عالمی مشاعروں میں (کراچی میں) رونق افروز ہوا کرتے تھے لیکن اب نہ تو اُن مشاعروں کا وہ معیار رہا اور نہ ہی مرحوم مظہر عباس ہاشمی جیسی ذاتِ بابرکات حیات رہی۔ ان کی حیات اور شاعری کی تفصیلات نے بھی معلومات کے نئے چراغ روشن کیے۔ صبا فردوس کا مختصر نوٹ یقیناً سچ پر مبنی ہے کہ وہ ہمیشہ مشاعرے کی آبرو ہی رہے:

پرائے درد میں آنسو بہا کے دیکھ ذرا
تری ان آنکھوں کی بڑھتی ہے کیسے بینائی

شہناز خانم عابدی ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ ''دھند کے مسافر بھی'' ان کی کہنہ مشقی کی دلیل ضرور ہے لیکن اس افسانے کا ماحول مشرقی ہونے کے بعد بھی جس انداز سے اسے مغربی پس منظر میں بُنا گیا ہے وہ مجھے ہضم نہیں ہو رہا ہے۔ دیپک کنول نے ''ایک صدی کا قصہ'' میں ''بھارت بھوشن'' کی زندگی کے حالات لکھے ہیں لیکن ان کے انجام میں کسمپرسی کے حالات پڑھ کر افسوس ہوا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ظاہر ہے جب لوگ ظاہری چمک دمک کو ہی اپنا مقصدِ حیات بنا لیتے ہیں تو

یہ نتیجہ ہی منطقی کہلاتا ہے۔ آخر کار اشوک کمار، دلیپ کمار اور دوسرے مشہور آرٹسٹ ایسے انجام سے کیوں محفوظ رہے صرف اس لیے کہ وہ لوگ اپنے خوشگوار لمحات کے ساتھ کسی بھی ناخوشگواری کے لیے ہمیشہ ذہنی وجسمانی طور پر تیار رہے تھے اور اس کی فکر کرتے رہے۔ اللہ ہر ایک کو ایسے تاریک مستقبل سے محفوظ رکھے۔

غالب عرفان (کراچی)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

پروفیسر وسیم بریلوی جیسے نابغہ روزگار کے لیے قرطاسِ اعزاز کا شکریہ کہ وہ میری ہی قوم وقبیلے سے ہیں۔ ہمارے بچپن میں میلے ٹھیلے ہوا کرتے تھے جن میں ٹانگوں سے بانس باندھ کے یہ اونچے اونچے راون کی لنکا والے لوگ رونق بڑھایا کرتے تھے۔ آزادی کے بعد حکومت ویسے ہی درباری مسخروں کو بانس پہ چڑھا کر اونچا کر دیتی ایسے ہی Stalked ادیب ودانشور چھائے رہتے ہیں مثلاً اسلام آباد کے اداروں مقتدرہ قومی زبان، ثقافت، ادبیات پہ چند لوگ برس ہا برس سے براجمان ہیں۔ انہیں ہی گھمایا پھرایا جاتا ہے۔ انہی کے اعزاز میں تقریبات ہوتی ہیں۔ ایڈیشنل اکاؤنٹ جنرل، مردان کے مولانا کو بطور ادیب چین کے دورے پہ جاتے دیکھا۔ آپ جینوئن ادیبوں شاعروں کو توقیر دیتے ہیں۔ پشتو محاورہ کے مطابق دونوں ہاتھوں سے آپ کو سلام (یہ دواڑہ لاسونہ سلام) پیش کرتا ہوں۔

رینو بہل نے انل ٹھکر صاحب کا خاکہ بہت خوب لکھا ہے۔ ان کی تحریر میں ہمیشہ ایک توازن ہوا کرتا ہے۔ تصویر ہی کھینچ کے رکھ دیتی ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم کا میں نے فون پہ بھی شکریہ ادا کیا۔ میری والدہ معروف ماہر تعلیم ضمیر خانم کو بھی اسٹروک ہی ہوا تھا۔ چکبست لکھنوی کو بیالیس برس کی عمر میں پلیٹ فارم پہ ہی اسٹروک ہوا تھا۔ ایسے علمی اور طبعی موضوعات پہ ڈاکٹر فیروز عالم نے بنا اصطلاحات سادہ سی زبان میں لکھ کر فائدہ پہنچایا ہے۔

دیپک کنول نے اکثر لکھا ہے کہ فلمی دنیا میں کوئی کسی کو اٹھاتا ہی نہیں روند کر ہی چلا جاتا ہے۔ فلمی دنیا کے باہر بھی تو یہی حال ہے۔ بس ایک دوڑ لگی ہے کسمپرسی کا عالم ہے۔ صبح کا سماں ہے، جو گرا وہ نہ اٹھ پایا۔ روندا گیا، ورنہ رکنے والے قدم خود بھی ڈھیر ہو جائیں گے۔ زندگی کا طواف ہو رہا ہے بھائی۔ بھارت بھوشن میرا پسندیدہ اداکار تھا، میں بٹوارے کے چار برس بعد پیدا ہوا۔ تباہ برباد، دربدر، ٹکر ٹکر، غرق ترک معاشرہ دیکھا۔ میری پوری نسل رومانس میں ڈوب گئی ورنہ ماری جاتی۔ فرسٹریشن کے باعث خودکشی کر لیتی۔ مدھو بالا، نرگس، نمی جیسی حسین اداکاراؤں سے یک طرفہ عشق کرتے میٹرک کیا۔ دوسری جماعت میں مدھو بالا سے محبت ہوئی۔ آخری عشق رانی مکھر جی سے کیا پھر تسبیح اور مصلّٰی ہاتھ میں لے کر من کی شانتی تلاش کرنے لگا۔ یہ جو ڈنڈی مارتے ہیں ہمارے لکھاری مثلاً علّنی جیونت کے ذکر میں اس کی پورنوگرافی اور عریاں تصویروں کے کاروبار کو گول کر گئے۔ کالج کے زمانے میں ایک بقراط کو پڑھا، لکھتے ہیں کہ شبلی نعمانی کی ٹانگ کا واقعہ ہو چکا تھا اب نہ ہمارے پروفیسر کو پتہ نہ ہی ہمیں کہ ٹانگ کہیں اڑائی تھی؟ ہوا کیا تھا، اردو میں شرمیلا ٹیگور والا انداز ترک کرنا ہوگا۔ تابش خانزادہ کی تلاش ہے۔ ان کا نمبر ملے تو بات کروں۔ میں نے تو راگنی ناول کے ذکاء الرب رباب کو بھی کھوج نکالا تھا۔ خط وکتابت بھی رہی۔ انہیں حقیقتاً ایک سپیرن سے عشق ہوا تھا۔ تابش سے بھی دریافت کروں یہ کیا فینٹسی ہے؟ اس قدر موثر اور حقیقی؟ یا جے جے ٹالکن ہمارے لارڈز آف دی رنگ والے کی مانند تصوراتی کہانی ہے۔ افسانے خوب ہیں۔ نیّر اقبال علوی کی ''بنجارن'' ایک ایچ گروپ کا المیہ ہے۔ جس میں سے خود میں بھی گزر رہا ہوں۔ شموئل احمد ایک بڑے کہانی کار ہیں۔ ان سے فون پہ کچھ لفظوں کے معنی بھی دریافت کیے، بھائی زیادہ فخر نہ کریں کہ آپ کے ہاں گائے لے جانے والے کو ہجوم مارے ڈالتا ہے، ہمارے ہاں تو مسل کر کے پھر شہر بھر میں بے جان جسم گھمایا پھرایا بھی جاتا ہے۔ ہم بھی آپ سے کم نہیں۔ شاد باد منزل مراد۔

آغا گل (کوئٹہ)

پیارے گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کے باب میں حسن وخوبی نے ادب کے چاروں کھونٹ داب رکھے ہیں۔ آپ ایک سے ایک بڑھ کر نادر الوجود چیز ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور تشنہ لبوں کو سیراب کرتے ہیں۔ پروفیسر وسیم بریلوی شخصیت کے حسن اور بیان کی خوبی سے مزین ہیں ان کی شاعری پڑھی خوب ہے ان کا انٹرویو پڑھا، مزے کا ہے۔ دیکھا تو نہیں کان ضرور گنہگار ہیں وسیم بریلوی صاحب مشاعرے لوٹ لیتے ہیں۔ مجھے کوئی ادعا نہیں میں بڑا شاعر ہرگز نہیں میرے پاس کمزور شعروں کی بھرمار ہے مگر یہ کیا بڑے سے بڑا شاعر بھی کمزور شعر کہتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ نظموں اور غزلوں میں سائنس بھر جائے تو شعریت کی چڑیا پھُر کر کے اُڑ جاتی ہے۔ دیپک کنول نے میرے پسندیدہ اداکار بھارت بھوشن کا ذکر کر کے مجھے از حد دکھی کیا ہے۔ بھارت بھوشن کا آخری سے انتہائی دردناک تھا۔ سرگباشی بھارت بھوشن نے بیجو باورا میں بلند پائے کی اداکاری کی تھی۔ بیجو کا کردار بھارت بھوشن پہ بالکل فٹ تھا۔ میری غزل کو آپ نے اہمیت دی۔ اپنی غزل کے مطلع کا دوسرا مصرعہ آپ کے نام:

تیری الفت میں ہم بے جا نہیں ہیں

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

اُستاد محترم ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بعد پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کا قرطاسِ اعزاز ملا تو خوشی ہوئی۔ شاید درس وتدریس اور بریلی قدرِ مشترک ہے۔ سرورق کا واٹر بینٹ پورٹریٹ بھی چہرے پہ لکھا ہوا کا غماز ہے اور جس زیب وزینت سے دانشورانہ دستاویزات، تاثرات غزلیہ ونظمیہ انتخاب کو ترتیب وتشکیل دیا گیا ہے اس نے اسے بصورت مرقع ادب پڑھنے والوں کے لیے پیش کیا جو بے حد لائق تحسین ہے۔ مرا محبوب شاعر، ہوا میں اڑنے کی دھن

شاعری کی آبرو مشاعرے کی آبرو بھی مزید جاننے میں معاون ہیں۔

''لنگھے کل دے وانگ'' اٹامک تباہ کاریوں کے پس منظر میں امن و سکون کی شدید خواہش سے لپٹی استفہامیہ لمحۂ فکریہ نظم ہے۔ منیر نیازی صاحب نے بھی عصری حسیّت کو یوں قلمبند کیا ''اج دا دن وی ایویں لنگھیا کم تاں کوئی فن ہوئیا'' ماں بولی کے حوالے سے شیئر کرتے چلیں کہ گزشتہ دنوں پوسٹ گریجویٹ کالج سمن آباد کی طالبہ طیبہ خان نے میری پنجابی کہانیوں کی کتاب ''روپ سروپ'' پر تجزیاتی مقالہ لکھ کر شعبہ پنجابی لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی سے برائے بی۔ایس پنجابی ڈگری حاصل کی ہے۔

''بنجارن'' میں کرداروں کی تحلیل نفسی، جزئیات نگاری، مکالماتی ہنروری اور تجزیاتی ہم آہنگی سے بنجاروں کے پیش پا افتادہ موضوع کو دستاویزی عمیق مشاہدے نے اک الگ رنگ ڈھنگ سے ہمکنار کر دیا ہے۔ ''گھر کو چلا میں'' کے حوالے سے گورنمنٹ سرونٹ کا جملہ مراعات، سہولیات واختیارات کو بلا جواز اپنے لیے مسلمہ سمجھنا حقیقت کی عکاسی ہے جبکہ عوام الناس کے مسائل کو دیدہ دانستہ طوالت دینا اور دفتری فائلوں کو move کرنے کے لیے نوٹوں کے پہیے لگانے کا اصرار کر کے متاثرین کی اذیت کو دو چند کرنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

''کالا بلاّ'' پڑھتے ہوئے ترجمے کا نہیں بلکہ کسی چرند پرند سے پیار کرنے والے مانوس و مشفق کا فرینڈلی بیانیہ محسوس ہوا۔ بیسویں صدی کے دوران تخلیق کی گئی اس غیر معمولی تحریر میں پیش کیے گئے تجربات و مشاہدات آج بھی بہت سچی عکاسی کرتے ہیں مگر ترجمے کے آخری موڑ پر حیوانی سفا کی زد میں انسانی المیہ دلخراش محسوس ہوتا رہا۔ فلم قدرت میں بھی جُرم کو چھپانے کے لیے ایسی ہی ٹیکنیک استعمال کی گئی ہے۔

اسٹروک کے بارے میں مضمون نہایت مرحلہ وار اسباب و وجوہات سے آگاہی دیتا اور بچاؤ احتیاط کے لائحہ عمل کی معلومات بہم پہنچاتا ہے حالیہ مینٹل ہیلتھ ڈے سے ہر چوتھے شخص کے اس ذہنی ونفسیاتی عارضے میں مبتلا ہونے کا علم ہوا۔ اس تناظر میں Dual attitude patients اور سڈنی شیلڈن کے ناول Tell me your Dreams میں مذکورہ Multiple Disorder Personality سے متعلق تفہیم باعثِ ممنونیت اور مفادِ عامہ میں ہوگی۔

''گرد میں اَٹے چہرے'' کا مختصر تعارف اچھا لگا ورنہ بقول ساحؔر ''تعارف روگ ہو جائے تو اُس کو بھولنا بہتر''۔۔۔ بھارت بھوشن کی شخصیت کا منفرد پہلو کتابوں سے لگاؤ، اُن کی دیکھ بھال اور سنبھال سے متعلق مخصوص مقام کا تعین کرنا تھا وگرنہ کتب کی پذیرائی کے لیے بنگلے تو کم کم ہی بنتے اور ملتے ہیں۔

فلرز میں بالخصوص ''حقیقت، سونا ضروری ہے، غیر کی عزت از فردوس بریں اور Humble Request'' خوب رہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

تازہ ''چہارسوُ'' ملا پڑھ کر مسرت ہوئی۔ ہمارا آپ کا علم کا رشتہ ہے۔ میری چہارسو سے پرانی وابستگی ہے۔ میں چہارسو کے خاص گوشے بہت اشتیاق سے پڑھتا ہوں۔ اس بار بھی وسیم بریلوی صاحب کو تفصیل سے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ گائے ہماری ماتا ہے (شموئل احمد، پٹنہ بھارت) کا لکھا ہوا افسانہ پڑھا جس نے بہت متاثر کیا۔ جیسا کہ اپنے ہندوؤں کے مسائل میں بخوبی جانتا ہوں آپ اگر ہندوؤں کے مسائل کو فکشن بنا دیں تو مجھے یقین ہے بہت ہی زیادہ پذیرائی ملے گی۔ آپ کو علم ہے صرف وہی ادب زندہ رہتا ہے جو زمین سے جڑے مسائل کو حقیقت کا رنگ دے۔ خواتین کو مسلمان بنا کر زبردستی شادیوں کی باتیں بھی اخباروں میں آتی ہیں۔ اپنا مذہب چھوڑ کر کس طرح دوسرا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ پہلے ہی کئی معصوم اہلِ قلم اور صحافی قتل ہو چکے ہیں۔ مسجدوں، مندروں، چرچوں اور درگاہوں پر حملے ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت حال میں شخصی آزادی اور اہل قلم کی آزادی فکر دونوں کا تحفظ لازم وملزوم ہے۔ میرے خیال میں ''چہارسوُ'' ہی واحد جریدہ ہے جس نے لکھنے والوں کا اندازِ بیان بدلا۔ چہارسو دلوں کو جوڑتا ہے اور ادب افسانوں کو ملاتا ہے۔ مظلوموں کی آواز لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ شموئل احمد کو کیا بُرا تھا کہ وہ چپ رہ کر سب کچھ برداشت کر لیتے جب تک ہم چُپ تھے دنیا کو اچھے لگتے تھے۔ ایک آدھ بار حقیقت بیان کر دی تو سب کو بُرے لگنے لگے۔ آپ جانتے ہیں اللہ تعالیٰ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کو پسند نہیں کرتا کیونکہ انسان نے اپنے مفاد کی خاطر اُصول بنائے ہیں کہ ظلم و زیادتی کا جواب اتنا ہی دینا ہوگا جتنی زیادتی اُس نے دوسروں پر کی ہوتی ہے۔ اللہ رب العالمین نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے اور سب اُس کے حکم کے پابند ہیں۔

میں نے یہ باتیں پاکستان کی دھرتی سے جڑ کر لکھی ہیں۔ چہارسو کا ہر شمارہ ایک موضوع پر کثیر المقاصد ہمہ جہت اور نہایت ہی معلوماتی مضامین پر مبنی ہوتا ہے اس لیے بھی چہارسو میرے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی کریں تا کہ میں اپنی پسماندہ قوم کے مسائل ان لوگوں تک پہنچا سکوں جو انہیں معمولی جان کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب لوگوں کو اصل صورتِ حال معلوم ہوگی تو وہ اصل حقائق سے آگاہ ہو کر مظلوموں کے حق میں بہتر طور پر آواز اُٹھا سکیں گے۔

مرلی چندر (شکارپور، سندھ)

برادرِ عزیز گلزار جاوید، سلام و دُعا۔

چہارسُو کا تو خیر ہر شمارہ ہی اول تا آخر پڑھتا اور لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اس مرتبہ قرطاسِ اعزاز جس عظیم شخصیت پروفیسر وسیم بریلوی کے بارے میں ہے، میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میری ان سے کئی ملاقاتیں رہی ہیں، وہ ایک سے زیادہ مرتبہ انڈین قونصلیٹ کے تحت ہونے والے مشاعروں میں جدہ تشریف لائے تھے، جہاں پاکستانی شعراء کو کلام سنانے کے لیے نہیں، بلکہ

سامعین کے طور پر بلایا جاتا تھا، اور وہیں یہ دیکھا کہ بلند بانگ اور جذباتی انداز کا کلام ڈرامہ بازی کے انداز میں سنا کر جب کچھ شعراء مشاعرہ لوٹ کر واپس جاتے، تو ایک خاموش، متین اور پُرسکون سا شخص مائک پر آتا، نہایت دھیمے لہجے میں اپنی شاعری سنا کر پہلے سنائی جانے والی شاعری کا سارا طلسم زائل کر دیتا اور پھر لوگ اس کی تخلیقی اور عوامی مزاج سے یکسر ہٹی ہوئی شاعری سماعت کرتے اور شاعری کا حقیقی ذوق رکھنے والوں کی زبان پر یہی ہوتا کہ واہ، وسیم بریلوی نے تو مشاعرہ لوٹ لیا ہے۔ مشاعرہ کے بعد ان سے ملاقات ہوتی تھی، اور قو نصلیٹ کے مشاعرے کے بعد مختلف ادبی حلقوں میں ہونے والے مشاعروں میں مجھ سمیت جدہ کے کئی شعراء کو بھی کلام پیش کرنے کا موقع ملتا تھا۔ ان محفلوں میں بھی وسیم بریلوی کو بڑا کم گو، دوسروں کے بارے میں کسی قسم کی منفی گفتگو نہ کرنے والا پایا۔ ایک مرتبہ تو مجھے ایک ادب نواز دوست کی عنایت سے یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ انہوں نے اپنے گھر پر ایک مخصوص شعری نشست میں جناب وسیم بریلوی کو مدعو کیا اور جدے میں موجود کئی درجن شعراء میں سے صرف مجھے اس نشست میں کلام سنانے کا موقع دیا۔ شاید محترم وسیم بریلوی کو تو یہ یاد بھی نہ ہو، مگر میرے لیے یہ اتنا بڑا اعزاز تھا کہ بھولتا ہی نہیں۔ آج یہ باتیں، ان کا انٹرویو، ان پر بڑے بڑے تنقید نگاروں کے مضامین اور ان کی شاعری پڑھ کر یاد آ گئیں، شاید کبھی ان دنوں کی جدہ کی ادبی رپورٹوں سے بھی اس نشست کا ذکر نکل آئے۔ آپ نے ان کے بارے میں بہت کچھ پڑھ کر جو سوالنامہ مرتب کیا تھا اس کا بھی لطف آ گیا کہ آپ کسی ''سٹیریوٹائپ'' سوالنامے سے ہر ادیب کو دریافت کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ ایسا سوالنامہ مرتب کرتے ہیں جو صرف اسی کے لیے مخصوص ہوتا ہے چنانچہ اس کے جوابات سے اس کی ذات کی تمام گرہیں اور جہتیں کھل کر سامنے آ جاتی ہیں۔

افسانے سبھی پڑھ لیے ہیں، پسند اپنی اپنی کے مصداق مجھے ان سب میں بہتر افسانہ جناب شموئل احمد کا ''گائے ہماری ماتا ہے'' لگا۔ جس کا موضوع ایسا ہے کہ اس پر افسانہ لکھنا کوئی آسان نہ تھا، ہندوستان میں گئو رکشا کی سزا مسلمان تو بھگت ہی رہے ہیں مگر جب ایک دلت نے ایک مسلمان سے گائے خریدی تو اسے بھی مار ڈالا گیا کہ ہندو عقیدے کے مطابق دلت برہما کے پاؤں سے پیدا ہوتے ہیں اور انہیں گائے رکھنے کا اختیار نہیں ہے، وہ مری ہوئی گائے کی چمڑی ادھیڑ تو سکتے ہیں لیکن اس کا دودھ نہیں دوہ سکتے۔ پھر اس کا یہ جرم بھی کوئی کم نہ تھا کہ اس نے ایک ملیچھ (مسلمان) کا ساتھ دیا تھا۔

اور جناب تابش خانزادہ کے ناول ''زہریلا انسان'' کی ہر قسط کا تو میں بے چینی سے انتظار کرتا ہوں اور چہارسُو ملنے پر سب سے پہلے اسے ہی پڑھتا ہوں۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی ادبی تحریروں اور سوانح عمری کے بعد اب صحت کے موضوع پر مضامین کا سلسلہ اس لیے اچھا لگ رہا ہے کہ زیادہ تر وہ ایسی بیماریوں پر لکھ رہے ہیں جن کا ''شکار'' ہماری عمر کے لوگ ہیں چنانچہ ہم میں سے جس کسی نے بھی ان کی معلوماتی تحاریر سے استفادہ کر کے اپنی کسی بیماری کے لیے علاج یا پرہیز کا اہتمام کر لیا اس کا سارا ثواب ڈاکٹر صاحب ہی کو ملے گا۔

شعر و شاعری کے حصے میں کئی اشعار پر پسندیدگی کا نشان لگایا تھا اور چند ایک اشعار پر کچھ فنی حوالے سے بھی بات کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ یہ خط آج ہی روانہ کرنا ہے اس لیے گریز کر رہا ہوں۔ چلتے چلتے ایک اہم خبر دیتا چلوں کہ اسی ہفتے میرے تیرہ شعری مجموعوں پر مشتمل ''کلیاتِ نسیمِ سحر'' بھی شائع ہو گئی ہیں۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ اپنی ادبی روایت کے ساتھ وقت پر نظر نواز ہوا۔ وسیم بریلوی صاحب سے قلمی تفصیلی ملاقات سے دل باغ باغ ہو گیا۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات کے جوابات بڑی وضاحت کے ساتھ دیے ہیں۔ کسی سوال سے دامن نہیں بچایا۔ اشعار کا تڑکا بھی خوب لگایا ہے۔ اُن کے یہ الفاظ میرے، شاید آپ کے بھی دل کی آواز ہیں:

''اردو کو اپنے وجود کی جنگ لڑتے پایا۔ اردو مخالف کو جانے دیجئے اردو معاشرہ خود اردو یا اردو والوں کو کہاں عزت دیتا ہے'' (ص ۱۴)

وسیم بریلوی صاحب کا ''رسم وفا عزیز ہے'' پیرزادہ قاسم کی شاعر پر ایک مضبوط مضمون ہے۔ پروفیسر آفاق صدیقی مرحوم نے ''دل کی اہمیت کیا ہے'' کے عنوان سے وسیم بریلوی کی غزل کا بامعنی تجزیہ کیا ہے۔ آفاق صدیقی نے نظم و نثر میں بہت لکھا ہے سندھ کے صوفی شعراء پر مستند کام ہے۔ عبدالاحد ساز نے وسیم بریلوی کی نظموں خصوصاً رومانی نظموں پر اچھا مضمون تحریر کیا۔ پروفیسر محمد حسن، پروفیسر سحر انصاری اور عشرت ظفر کی تحریریں وسیم بریلوی صاحب کے فن کی تفہیم میں مددگار رہیں۔ فاری شانے صاحبِ گوشہ کی غزلوں اور عطیہ سکندر علی نے نظموں کا انتخاب محنت سے کیا ہے۔

''گائے ہماری ماتا ہے'' شموئل احمد کا افسانہ حقیقت نگاری اور ادبی صداقت کا آئینہ دار ہے۔ ہندوستان میں ایسا افسانہ لکھنا اور پھر اشاعت بھی جرأت کی بات ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ تعصب اور بدسلوکی اور دلت قوم کے ساتھ انتہائی بے رحمانہ رویہ بہت تکلیف دہ ہے۔ افسانے میں ایک مسلم خاندان کی اپنے وطن سے محبت، بلاتفریق انسان کی عظمت کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ نیئر اقبال علوی کا افسانہ ''بنجارن'' مصنف کے مطالعے اور مشاہدے کا شاہد ہے۔ ''بنجارن'' سے ہمدردی اور محبت میں اپنی شناخت اور اپنی تنہائی کا مداوا ہے۔ اچھا افسانہ ہے۔ سیمیں کرن نے افسانہ اپنے مطالعے کے زور پر خود کلامی، نیم تجریدی انداز میں اپنے باطن کو کھنگالا ہے۔ شہناز خانم عابدی، تسنیم کوثر اور انل ٹھکر کے افسانے بھی متاثر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب مختلف امراض کی نشاندہی، بیماری کے عوامل، بچاؤ کے طریقے اور علاج کی بات بڑی سادگی سے قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔

اس شمارے میں ''اسٹروک'' کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ابوحماد کا ترجمہ کردہ افسانہ ''کالا بلّا'' اپنے موضوع کے حوالے سے بہت اہم ہے۔رینو بہل کی تحریر ''داؤد کا چاند'' رتن سنگھ کے افسانوی انداز میں حالاتِ زندگی اور اُن کی کہانیوں کا تجزیہ کیا ہے۔رینو بہل کی تحریر میں اپنائیت ہے۔

آصف ثاقب، محمود الحسن، غالب عرفان، فیصل جاوید، اشرف جاوید، زیبا سعید، سحر تاب رومانی اور ارشد جمال کی غزلوں کے اشعار ندرتِ خیال کے ساتھ جدید فکر کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔عبداللہ جاوید کی نظم ''مطلع ہوش وخرد'' زندگی کا فلسفہ ہے۔یوگیندر بہل تشنہ کی نظم ''آلمحۂ موجود میں آ'' میں ماضی، حال اور مستقبل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔شاہین مفتی، طاہر شیرازی اور حافظ محمد احمد کی نظمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔علی زریون کی نظم ضمیر کی آواز ہے۔وجیہہ الوقار کا ترتیب کردہ سلسلہ ''رس رابطے'' کا مطالعہ ہمیشہ میرے لیے دلچسپ رہتا ہے۔

نوید سروش (میرپورخاص)

گلزار جاوید صاحب آداب۔

اس بار چہارسو کے ''وسیم بریلوی نمبر'' میں اس قدر کھو گئی کہ خط لکھنے کا خیال ہی نہ رہا۔ایک ہی کام کو ہر بار نئے انداز اور نئے ڈھب سے کرنا آپ پر ختم ہے۔اس خاص اشاعت کے لیے میری جانب سے آپ اور وسیم صاحب کے لیے ڈھیروں دعائیں۔شمارے کے دیگر مندرجات بے پناہ توجہ چاہتے ہیں مگر میں وقت کی قلت کے باعث جناب انل ٹھکّر کا افسانہ ''بددعا'' جناب شموئل احمد کا ''گائے ہماری ماتا ہے'' اور عزیزہ نازیہ پروین کا ''جنت کے بھکاری'' کا ذکر کیے بنا نہیں رہ سکتی۔ٹھکّر صاحب کی تحریر ہر بار کی طرح کلیجہ چیر گئی اور شموئل صاحب کے افسانے نے بہت زیادہ تشویش میں مبتلا کر دیا مگر اس نوخیز افسانہ نگار نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔پروین نے عورتوں کی بدحالی بڑے چونکا دینے والے انداز میں بیان کی ہے جبکہ خود عزیزہ کا اندازِ بیان بھی خوب ہے۔پنجاب کا رنگ ان کی تحریر میں نمایاں نظر آتا ہے اور جملے بھی خوب تراشے ہیں۔میری جانب سے دلی مبارک باد۔

جناب آصف ثاقب، عبدالرحمٰن عبد، عبداللہ جاوید، یوگیندر بہل صاحب، ڈاکٹر ریاض احمد اور شاہین مفتی کے کلام نے جی خوش کیا۔

رینو بہل (چندی گڑھ، بھارت)

مکرمی ومحترمی جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ نظر افروز ہوا۔ادبی دنیا میں چہارسو کا ہر شمارہ خاص اہمیت اور انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔اس میں تحریر شائع ہونا اعزاز سے کم نہیں اس مرتبہ قرطاس اعزاز جناب وسیم بریلوی کے نام ہے جو آپ کے حسن انتخاب کا منہ بولتا ثبوت ہے۔وسیم بریلوی صاحب عصرِ حاضر میں اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔یہ اُن کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ چہارسو جیسے معیاری مجلّے نے انہیں قرطاس اعزاز سے نوازا۔''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات صاحب قرطاسِ اعزاز شخصیت کے ایسے ایسے چھپے ہوئے پہلو عیاں ہوتے ہیں کہ جواب دینے والا خود حیرتوں سے دوچار نظر آنے لگتا ہے یہ سوالات کرنے والے کے فن کا بہت بڑا اعجاز ہے۔

چہارسو میں شائع شدہ دیگر تخلیقات بھی جدید فکر کی نمائندہ تحریریں ہوتی ہیں۔ان میں زہریلا انسان، اسٹروک، ایک صدی کا قصہ تو چہارسو کی شان نظر آتے ہیں۔افسانوں میں ''دھند کے اندر مسافر (شہناز خانم عابدی)، جلتی بے خبری سے (سیمیں کرن)، جنت کے بھکاری (نازیہ پروین)، بنجارن (نیئر اقبال علوی)'' دل میں گھر کرنے والے افسانے ہیں۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

شاعرِ آوارہ کا سلام

ساحر لدھیانوی کا ابھی کالج میں بی۔اے کا پہلا ہی سال تھا کہ کالج کے پرنسپل کی لڑکی سے ساحر کو عشق ہو گیا۔جس کی پاداش میں ساحر کو کالج سے نکال دیا گیا۔

برسوں بعد جب ساحر ہندوستان کا ایک بڑا شاعر اور فلمی دنیا کا مقبول ترین نغمہ نگار بن گیا تو اسی کالج میں اس کے اعزاز میں ایک جلسہ ہوا، جہاں ساحر نے اپنی مشہور زمانہ نظم ''نذر کالج'' پڑھی جس کے مصرعے یوں تھے.....

اے سرزمینِ پاک کے یارانِ نیک نام
بصد خلوص _ _ شاعرِ آوارہ کا سلام

تیری نوازشوں ___ کو بھلایا نہ جائے گا
ماضی کا نقش دل سے مٹایا نہ جائے گا

معصومیوں کے جرم میں بدنام ہم ہوئے
تیرے طفیل ____ موردِ الزام بھی ہوئے

اس سرزمیں پہ آج ہم اک بار ہی سہی
دنیا _ _ ہمارے نام سے بیزار ہی سہی

لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گریاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

(ساحر لدھیانوی اور شوکمار بٹالوی گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں۔۔1970)

...... عالمی اردوادب (اگست ۲۰۱۸ء) ......

عالمی اردوادب اور جناب نندکشور وکرم یک جان اور دو قالب کی شکل میں اردو زبان وادب مسلسل اعتبار اور انفرادیت سے مالا مال کیے جاتے ہیں۔عالمی اردوادب کی تازہ اشاعت کے آغاز میں سات منفرد افسانے ''نقشِ رفتگاں'' کے عنوان سے جناب نیرّمسعود، جناب بلراج مینرا، محترمہ بانو قدسیہ اور احمد جاوید مرحوم کے چار نمائندہ افسانے، غزلوں کا عمدہ انتخاب، نظموں کا منفرد پیرہن، احمد جاوید کی شخصیت اور فن پر تین بامعنٰی مضامین، ڈاکٹر اسلم پرویز مرحوم کی نسبت تین اور مضامین، محترمہ بانو قدسیہ کی نسبت اور دو مضامین ایک انٹرویو اور لبابہ نجمی کا ''راجہ گدھ کے کچھ فکر انگیز پہلو'' جناب بلراج مینرا کے شخصیت وفن پر دو مضامین، سورگی پروین کمار اشک، حقانی القاسمی اور قدوس جاوید کے دو مضامین، محترم ظفر گورکھپوری کے حوالے سے مشتاق کریمی اور حقانی القاسمی کے پُرمغز مضامین، ڈاکٹر آصف فرخی کا نیرّمسعود سے مکالمہ، تمثال مسعود کے نام نیرّمسعود کے پندرہ خطوط، کھوئے ہوئے کی جستجو کے نام سے نیرّمسعود کی منتخب کہانیاں دیگر مضامین میں احمد صغیر، اشتیاق سعید، سید حبیب الرحمٰن، افصح ظفر، سہیل انجم، طفیل اختر، غضنفر، معصوم مرادآبادی کے علاوہ وفیات کے باب میں سال ۲۰۱۸ء میں بچھڑنے والے کئی درجن بلند اور نامور اہلِ قلم کی تواریخ درج ہیں۔قریب چارسو صفحات کی یہ بامعنٰی اور بامقصد علمی، ادبی دستاویز D-21/14-F، کرشن نگر، دہلی سے مبلغ ۴۰۰ ہندوستانی روپے کے عوض طلب کی جاسکتی ہے۔ ...... فرحان افتخار

...... زوال دی گھڑی ......

''زوال دی گھڑی'' نامور ادیب، شاعر، سیاستدان جناب فخر زمان کی غزلوں، نظموں کا مجموعہ ہے جس میں فخر زمان صاحب نے زمین اور زمان سے جڑے قریب اُن تمام موضوعات کو مشکِ سخن میں برتنے، نبھانے اور قاری کی توجہ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔کافکادا ''کے''، چانن دی آس وچ، دُتے بھٹی نُوں اک سوال، کان پئی نچی، لُونا تے مٹھا پانی، سیانیاں دی گل، امپائر، حرامدے، اخیرلی عید، چِڑداسِٹّہ، اُنس تھیز یا، دُوجا رُخ، کچے دے رشتے، سائی کیٹرسٹ دے کول، شاشطاپو کے علاوہ اور بھی کئی منفرد انداز کی نظمیں اور غزلیں شامل کی گئی ہیں۔زمین سے جڑی یہ منتخب پنجابی شاعری دلوں کو گرمانے کے ساتھ دماغوں کو سوچنے کی ترغیب اور تحریک بھی دے رہی ہے۔اگر آپ اور ہم پنجابی زبان کی طرح دیگر قومی زبانوں کے لیے اپنے دل میں کوئی مقام، کوئی تڑپ یا طلب رکھتے ہیں تو ہمیں اولین فرصت میں جناب فخر زمان کی منتخب پنجابی شاعری ''زوال دی گھڑی'' کو مطالعہ کا حاصل ضرور بنانا چاہیے۔''زوال دی گھڑی'' کلاسیک 42، مال روڈ، لاہور سے چارسو روپے کے عوض دستیاب ہے۔ ......جویریہ سکندر علی

......سرخ جنموں کے زردسائے ......

تبسم ضیا کی نثری نظم اُس کی اپنی ذات کے اندر ایک جھاتی ہے۔اُس نے اپنی اس دروں بینی کو دانستہ طور پر آفاقیت دینے کی کوشش نہیں کی۔ اکثر نثری نظم گو شعرا اپنی ذات کو بیان کرتے ہوئے شعوری طور پر آفاقی ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔تبسم ضیا کے ہاں یہ فینومینا نہیں ہے۔اُس کی ذات اپنے معاشرے سے جڑی ہوئی ہے اور بنیادی طور پر یہیں اُس کی شاعری اپنے قاری سے کلام کرتی ہے۔تبسم ضیا کا خارج اپنے باطن کی توسیع ہے۔اُس کی خود کلامی اُن تمام مسائل کا احاطہ کرتی ہے جو ہمارے معاشرے کو اپنی زد پر رکھے ہوئے ہیں۔اُس کی نظموں میں ایک گہری نفسیاتی اُلجھن پائی جاتی ہے جو اُس کی اپنی پیدا کردہ نہیں۔وہ ایک حساس شخص ہے اور ہر حساس شخص کی طرح چیزوں کو مختلف زاویے سے دیکھنا اُس کا شعور ہے۔تبسم ضیا کی نظم کا اگر مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو یہ آج کے دور کی بربریت کی عکاسی ہے۔ہر نظم میں اُس نے ایسے موضوع کو پیش کیا ہے جس میں اُس کی ذات کا کرب اور المیہ ایک کہانی کی شکل میں سامنے آیا ہے۔تبسم ضیا نے اپنی اس المیہ کہانی کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا، وہ زندگی کے اُن تمام گوشوں تک پہنچنے کی فکر میں رہا ہے جہاں زندگی کو اُس کا نامناسب چہرہ دکھا سکے۔تبسم ضیا اپنی سوچ کے مکبّر شیشے کے ذریعے منفی رویوں کے ذروں کو واضح کرتا ہے۔سرخ جنموں کے زردسائے 250 روپے کے بدل مثال پبلشرز، امین پور، فیصل آباد پر آپ کی منتظر ہے۔ ......خالد فتح محمد

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اردو تنقید کے لیے اس طرح سوالیہ نشان نہیں ہیں جس طرح اردو تنقید کے لیے کرشن چندر ہیں۔ اردو کی افسانوی روایت کا یہ وہ منطقہ ہے جس کا تعین پر بحث و تمحیص جاری ہے۔
پروفیسر گوپی چند نارنگ
یونس جاوید نے اپنے پڑھنے والوں سے وعدہ کیا تھا ''تھوڑا اچ چھپاؤں گا مگر جھوٹ نہیں لکھوں گا'' اس کے خاکے شاہد ہیں کہ وہ زندگی کا بے حد زیرک ناظر ہے۔
انور سدید
بدن کی جمالیات کا نیا منظر نامہ بھرپور طور پر اس ناول میں موجود ہے۔ ''عضو یاتی غزلیں'' کے بعد یہ افرادیات متوجہ کرے گی اس کا یقین مجھے اس لیے بھی ہے کہ یہ میری دو سو چوبیسویں کتاب ہے۔
مناظر عاشق ہرگانوی
تنویر ظہور دھرتی سے جڑے انسانوں کے جذبات کے جزئیات کی خبر رکھتے ہیں اور اس کے اظہار میں بھی بخیلی سے کام نہیں لیتے۔ ستر سال قبل ''سانجھاں'' سے شروع ہونے والا سلسلہ ''نوائے وقت'' کے کالموں کے ذریعے مزید مضبوط ہوا ہے۔
سعید آسی
بظاہر غزل قافیہ پیائی نظر آتی ہے مگر غزل کہنا داخلی کیفیت میں ایمائیت کا حسن برقرار رکھنا آسان نہیں ہے۔ آج کے شاعر اور ادیب کو عوام کی ذہنی سطح بلند کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ لازم ہے کہ وہ ہر حال میں یہ فریضہ اخلاص سے انجام دیں۔
حسن عسکری کاظمی
تہذیب کی پہلی کاوش عارف شفیق کے کالموں کے مجموعے کی شکل میں حاضر ہے اگر آپ سچ کہنا، سچ سننا اور سچ پڑھنا پسند کرتے ہیں تو یہ کتاب اس شعر کے مصداق آپ کی منتظر ہے: ہم نے ہر تحریر میں قرطاس پہ لکھو لکھے + روشنی کے واسطے ہم جلائیں انگلیاں۔
کشور عدیل جعفری
کرشن چندر کی جنسی تخئیل
ذکر اس پری وش کا
کراچی کی آواز
یارِ من
دیوار پہ دیا
شبنمی لمس کے بعد